مقاصد

(۱) اردو علم ادب کی زرخیزی ترقی - اعلیٰ درجہ کے علمی و اخلاقی - ادبی مجلسی مضامین اور جدید و قدیم طرز کی بہترین شاعری کے ذریعہ سے (۲) اردو داں پبلک میں اعلیٰ درجہ کے مضامین عمدہ اشعار اور نظم و نثر میں دلفریب افسانے لکھنے اور انکا مطالعہ کرنیکا شوق پیدا کرنا (۳) اردو اور فارسی مصنفوں اور شعرا اور انکے کارناموں کے متعلق تنقیدی مضامین شایع کرنا (۴) خاص مذہبی نزاعی اور پولیٹیکل مضامین کو مخزن میں جگہ نہ دیجائے گی (۵) اردو نظم و نثر میں مفید اصلاح کرنا (۶) نئے مفید خیالات اور جذبات کو اردو زبان میں داخل کرنا (۷) علوم جدیدہ کی طرف لوگوں کو توجہ دلانا (۸) دوسری زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کو نئے سانچہ میں ڈھالکر اردو میں رواج دینا۔

قواعد و ضوابط

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ کی آخری یا آئندہ ماہ کی اول تاریخ کو شایع ہوتا ہے۔

(۲) ہندوستان کے مقامات میں جن اصحاب کو رسالہ تاریخ اشاعت سے پندرہ دن کے اندر موصول نہ ہو انکی طرف سے ۲۰ دن کے اندر عدم موصولی کی شکایت دفتر میں آجانے سے رسالہ دوبارہ مفت بھیجا ہوگا نہ بصیغہ وی پی پارسل جن اصحاب کو ہندوستان سے باہر مقامات میں رسالہ تاریخ اشاعت سے ایکماہ کے اندر وصول نہ ہو انکی طرف سے ڈیڑھ ماہ کے اندر شکایت دفتر میں پہنچنے پر رسالہ مفت ورنہ قیمتاً۔

(۳) نمونہ کے پرچہ کیلئے قسم اول ۸؍ اور قسم دوم کے لئے ۶؍ کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔

(۴) رسالہ وقت پر نہ پہنچنے کی بابت خریداروں کو اپنے یہاں کے ڈاکخانہ سے شکایت کرنی چاہئے کیونکہ بعض جگہ ڈاکخانوں کی غفلت سے غیر محصولی چیزیں اکثر منزل مقصود پر نہیں پہنچتیں۔ ایسا کرنے سے انکی شکایت

(۵) خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور درج کیا جائے جو ہر خریدار کی پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔

مخزن

جذبہ اور مذاق کی نزاکت اور خوبی

قصہ بالا تر از مقولات است
عاقلاں کیف وکم تراشیدند

انسان بھی کیا ہی طرفہ معجون ہے۔ اس کی طبیعت میں قدرت نے اس قدر عجائبات اور غرائب پیدا کئے ہیں جن کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ گو ڈاکٹروں اور علم النفس والقویٰ والوں نے بہت کچھ چھان بین کی ہے۔ لیکن احصار ان حکمتوں کا اب تک نہیں ہو سکا۔ دن بدن نئی نئی باتیں کھلتی جاتی ہیں۔ ذات انسان کا مشاہدہ اور مطالعہ ایسا گہرا اور ایسا ادق ہے کہ کوئی کوئی شخص ہی اس میں پورا اُترتا ہے۔

انسان وہی کامل کہلانے کے قابل ہے۔ جو اپنی ذات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنیکا عادی ہو۔ اور یہ امر طے شدہ ہے کہ انسان کی پہچان خدا کی پہچان ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

پنجابی زبان میں ایک مقولہ ہے۔

دِل دریاؤں ڈونگھاہ کون دلاں دیاں جانے
وسدے اس وچ مگھ مرغائیاں نالے ناگ آیانے

دریاؤں = درجہ سے بھی زیادہ + ڈونگھا = گہرا + دلاں دیاں = دلوں کی باتیں یا راز + وسدے = رہتے ہیں۔ قیام کرتے ہیں + اس وچ = اس میں یا اس کے اندر + مگھ = ایک پرند جسے سرخاب کہتے ہیں + مرغائیاں = مرغ آبیاں نالے = اور + ناگ ۔ سانپ + آیانے = زہریلے +

مطلب ۔ انسان کا دل دریا سے بھی زیادہ گہرا ہے ۔ اس لئے اس کی باتوں کو کون جان سکتا ہے؟ اس میں سرخاب۔ مرغ آبی اور زہریلے سانپ رہتے ہیں۔ یعنی اچھے بُرے ہر قسم کے خیالات کی آماجگاہ ہے۔

ہر شخص ضمیر اور دل رکھتا ہے ۔ اور ہر متنفس شب و روز اٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی خیال رکھتا ہے ۔ (۱) میرا دل نہیں مانتا (۲) میرا دل نہیں چاہتا (۳) میرا دل نہیں لگتا۔

لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ کہ دل ہے کیا۔ اور جس سے یہ خطاب کیا جاتا ہے اس کی کیا کچھ حقیقت ہے۔ دل ہی پر کیا موقوف۔ اور بھی بعض ایسی قوتیں ہیں جن کی حقیقت سے کوئی کوئی ہی واقفیت رکھتا ہے۔ دل پر ہاتھ رکھکر کوئی نہیں سوچتا کہ وہ کیا کچھ کہہ رہا ہے۔ اور اس کی بوقلموں آوازیں کیا کچھ اثر اور مطلب رکھتی ہیں۔

بہت لوگ یہ کہا کرتے ہیں (۱) وہ تو صاحب مذاق ہیں (۲) اُن کا جذبہ کون سنبھالے (۳) وہ بہت ہی نازک خیال ہیں۔

لیکن ایسے لوگ کم ہیں۔ جو یہ سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ جذبہ اور مذاق ہے کیا۔ اور ان دونوں میں نسبت کیا ہے۔ اور ان دونوں قوتوں

کی نزاکت کیا کچھ پیمانہ اور کیفیت رکھتی ہے۔ اگرچہ یہ دونوں قوتیں ہر ایک کی ذات میں ودیعت کی گئی ہیں۔ اور ہر شخص ان سے وقت پر اپنے اپنے رنگ میں کام بھی لیتا ہے۔ مگر علمی رنگ میں ان پر غور کرنے والے لوگ خال خال ہی ہیں۔

جذب یا جذبہ کے لغوی معنی کھینچنے یا کشش کے ہیں۔ اور اصطلاح علمی کی رو سے کشش قلبی یا ناگہانی جوش سے مراد ہے۔ مذاق کے لغوی معنے چکھنے اور محل قوت ذائقہ کے ہیں۔ علمی رنگ میں مذاق سے مراد اظہار شوق۔ توجہ اور میلان ہے۔ بعض لوگوں کی یہ رائے ہے۔ کہ جذبہ یا جذبات فطرتی خاصہ ہیں۔ اور مذاق انسان خود پیدا کرتا یا رفتہ رفتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض کے خیال میں جذبہ اور مذاق ایک ہی خاصہ ہے۔ صرف عملی ممکنات کی وجہ سے انھیں دو جداگانہ ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جذبہ کی بعض کیفیات اور بعض حالتیں جذبہ یا جذبات سے تعبیر پاتی ہیں۔ اور بعض حالتوں اور بعض کیفیتوں کا نام مذاق رکھا گیا ہے۔ میری رائے میں جذبہ اور مذاق دونوں جداگانہ ہیں۔ اور دونوں جداگانہ رنگ میں فطرتی خاصے ہیں۔ اور علی قدر مراتب یہ دونوں خاصے ہر ایک شخص کی ذات میں ہیں۔ کوئی فرد بشر ان سے معرّا اور خالی نہیں۔ یہ جدا بات ہے کہ کوئی شخص ان کی موجودگی اور ہستی سے خود ناواقف ہو یا ان سے کام نہ لے سکے۔ یہ کہنا شاید صحیح ہو کہ بہت سے لوگ ان میں فرق نہ کر سکتے ہوں یا یہ کہ ان دونوں قوتوں کے عمل میں اس قدر مشابہت اور یکرنگی پیدا ہو جاتی ہو۔ کہ ان میں تمیز کرنا کسی حد تک مشکل ہو جائے۔

ان دونوں کا مشترک فعل احساس ہے۔ جذبہ میں بھی ایک قسم کا احساس

ہوتا ہے۔ اور مذاق میں بھی۔ اور ان دونوں قسم کے احساسات میں بہت کچھ فرق ہوتا ہے۔ جذبہ کے احساسات میں زور۔ حدت۔ جوش اور فوری کیفیت ہوتی ہے۔ خلاف اس کے مذاق میں انتخابی قوت۔ ملائمت۔ میلان طبعیت اور ایک قسم کی گرویدگی پائی جاتی ہے۔ جذبہ آگ کی طرح شعلے اوگلتا اور بجلی کی مانند کوندتا اور بادل کی سی طرز پر گرجتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک قسم کا زور و صدمہ رکھتا ہے۔ خلاف اس کے مذاق میں اطمینان۔ سکون۔ ملائمت۔ بردباری تحمل اور دلچسپی ہوتی ہے۔ جب انسان پر کوئی دوسرا شخص حملہ کرتا ہے۔ یا بُرے الفاظ سے اُسے یاد اور مخاطب کرتا ہے تو غصہ کا جذبہ آگ کی طرح مشتعل ہوجاتا ہے۔ لیکن جب وہی انسان کوئی راگ سنتا یا شعر پڑھتا یا کوئی دلچسپ منظر دیکھتا ہے۔ تو اس کے دل و دماغ میں ایک قسم کی دلاویزگی اور لطف پیدا ہوتا ہے اور وہ اس سے اس قسم کی لطیف اور مسرت خیز لذت اٹھاتا ہے جو محض اس کے مذاق ہی سے وابستہ ہوتی ہے۔ اسی طرح پر جب وہ مکروہ سماں دیکھتا یا بُرے منظر یا تماشا اس کے پیش نظر ہوتا ہے یا کہ بُرے الفاظ سنتا ہے۔ تو اس کے مذاق پر ایک قسم کا صدمہ پڑتا ہے اور اس کی طبعیت رفتہ رفتہ کدورت سے معمور ہوجاتی ہے۔

انسان کی طبعیت اور دل و دماغ پر مندرجہ ذیل صورتیں اور کیفیات مختلف طریق سے اثر کرتی ہیں۔ (۱) منظریہ (۲) سماعیہ (۳) شمیہ (۴) لمسیہ (۵) تخلیہ۔ ان میں سے پانچویں صورت کی دو قسمیں ہیں (الف) تخیل اندرونی (ب) تخیل بیرونی۔

انسان جو کچھ دیکھتا۔ سنتا۔ سونگھتا۔ چھوتا ہے اس کا اثر مختلف رنگوں۔ پیرایوں۔ اور صورتوں میں علیٰ قدر مراتب اس کے دل و دماغ

پر ہوتا ہے ۔ جو کچھ کیفیت اندرونی طور پر اوس کی طبیعت محسوس کر سکتی ہے اس سے بھی وہ متاثر ہوتا ہے ۔ انھیں کیفیات اور تاثیرات سے جذبات مشتعل ہوتے اور مذاق کو موقع دلچسپی یا کدورت کا ملتا ہے ۔ جذبات قلب کی شرکت سے متاثر اور مشتعل ہوتے ہیں ۔ اور مذاق دل و دماغ دونوں کی شرکت سے متاثر ہوتا ہے ۔ اور اس کے ساتھ ہی اس پر تخیلات بھی اثر پذیری کرتے ہیں ۔

مذاق بمقابلہ جذبات کے رفتہ رفتہ تاثیر پذیر ہوتا ہے مگر جذبات فوراً ہی بھڑک جاتے اور مشتعل ہو جاتے ہیں ۔ کیونکہ خود ان کی ذات میں بھی ایک قسم کا مادہ اشتعال پہلے ہی سے پنہاں ہوتا ہے ۔ جذبہ یا جذبات کی حدت مثل ایک تیز آگ کے ہے اور مذاق مثل ایک خوشگوار اور خوش آیند موسم کے ہوتا ہے ۔ جو تھوڑی سی بدلی اور غبار کی وجہ سے کبھی مکدر ہو جاتا ہے ۔ جذبہ ایک شعلہ ہے اور مذاق ایک خوش آیند روشنی ہے ۔ جو دل و دماغ پر یا تو ایک لطیف اثر ڈالتی ہے اور یا ایک خاص حد تک صورت مکدر قبول کرتی ہے ۔

جذبہ یا کشش قلبیہ ایک ہی دفعہ واقعات پیش آمدہ کا احساس کر کے مشتعل ہو جاتی ہے ۔ اور مذاق رفتہ رفتہ لطف لیتا یا بدمزگی سے آشنا ہوتا ہے جذبات کے ماتحت جو مسرت اور جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ ایک زبردست فوری اور ناگہانی خوشی ہوتی ہے ۔ اور انسان اس کی وجہ سے بالکل اس کا مغلوب ہو جاتا ہے اور اس پر اپنی زندگی کا مدار سمجھتا ہے ۔ اسی طرح ایک تھوڑا سا غم و کدورت بھی اس کے واسطے ایک سخت آفت اور مصیبت بنجاتی ہے ۔ ایسا انسان جیسے خوشی میں بالکل محو ہو جاتا ہے ویسے ہی غم و رنج سے بھی اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اس کی زندگی بہت سی مشکلات میں گھر جاتی ہے ۔

یہانتک کہ بعض وقت ایسا انسان جان اور ننگ و ناموس پر بھی کھیل جاتا ہے۔ ایک طرف مسرت اور خوشی کی وجہ سے گویا انسانیت سے اتنا دور ہوجاتا ہے۔ کہ اس کی نگاہوں میں دیگر ابنائے جنس کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتے۔ اور دوسری طرف غم و کدورت سے ایسا ماؤف اور بے دل ہوجاتا ہے۔ کہ حوصلہ اور استقلال نام کو بھی نہیں رہتے۔

خلاف اس کے صاحب مذاق رفتہ رفتہ لطف اُٹھاتا اور رفتہ رفتہ مکدر اور بدمزہ ہوتا ہے۔ اس کی مسرت اور خوشی بامزہ اور دلچسپ ایسی لطیف ہوتی ہے کہ جس کا تعلق اور وابستگی صرف دل و دماغ ہی سے ہوتی ہے۔ اور ایسے طریق پر جو طبیعت کے واسطے ایک نہایت ہی خوش آیند اور خوش گوار ہوتا ہے۔

کسی اچھے پڑھنے منظر، یا خوش آیند راگ یا آواز کے سننے سے اہل مذاق کے پر مذاق دل و دماغ پر جو اثر، زور اور کشش ہوتی ہے۔ وہ جذبی اثر اور جذبی کشش سے بہت کچھ فرق رکھتی ہے۔ جو کدورت اور جو غم بھی اہل مذاق کی طبیعت پر طاری ہوتا ہے وہ بھی محض تکدر ہی کی صورت رکھتا ہے۔ نہ کہ ایسا غیظ و غضب جو جذباتی کیفیات سے پیدا ہوتا ہے۔

جذبات مختلف طاقت اور مختلف کشش کے ہوتے ہیں۔ بعض (الف) اعلیٰ (۲) (ب) اوسط (۳) (ج) ادنیٰ

انھیں اقسام کے بموجب ان کے اثر کا جوش ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کے جذبات ایک تھوڑی سی بات سے بھی مشتعل ہوجاتے ہیں۔ بعض ذرا دیر سے مشتعل ہوتے ہیں۔ اور بعض بہت ہی ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

بعض لوگ خوشی اور غم کا اثر رفتہ رفتہ ظاہر کرتے یا ظاہر ہونے دیتے ہیں۔ لیکن بعض استقلال کے ساتھ جذباتی تحرک کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ آپ

نے دیکھا ہوگا۔ کہ بعض لوگ تھوڑی سی کامیابی سے اس قدر شیخی بگھارتے اور اتراتے ہیں۔ جو دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں ایک خفیف حرکت شمار ہوتی ہے بعض لوگ کبھی ایک شعر ہی کہہ کر اپنے کلام کے اس قدر گرویدہ ہوجاتے ہیں۔ کہ گویا ساری دنیا میں وہی شاعر وحید العصر ہیں۔ بعض لوگ جذباتی اعتبار سے اس قدر ذکی الحس ہوتے ہیں کہ اگر ان کی باتوں میں حقیقتاً تھوڑا سا بھی نقص نکالا جائے۔ تو وہ راتوں سوتے نہیں۔ انکا بشرہ۔ انکی آنکھیں۔ انکی رفتار انکی گفتار کہے دیتی ہے۔ کہ ان کے دل و دماغ پر ایک ناخوش آیند اثر پڑا ہے۔

اگرچہ وہ جانتے ہیں۔ یا کم از کم انھیں جاننا چاہیے۔ کہ انسان کی اکثر کامیابیوں اور فتوحات یا رنج و کدورت کا مدار صرف اس اکیلے ہی پر نہیں ہے بلکہ اس کا بہت کچھ حصہ دوسروں سے وابستہ ہے۔ ہر انسان کے اپنے اختیارات بہت ہی محدود ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی زندگی کے واقعات کا بہت بڑا حصہ دوسروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ زید ہمیشہ دل سے چاہتا ہے کہ وہ ہر ایک معاملہ میں خوش قسمت رہے یا ہر ایک سے بازی لیجائے۔ لیکن یہ اس کو کیا کسی کو بھی نصیب نہیں۔ انھیں مشکلات کے پیش آنے سے انسان نے قسمت۔ نوشتہ۔ اور تقدیر کی کہانی شروع کی۔ اور انہی اسباب سے اُسے مجبوراً یہ ماننا پڑا۔ کہ اس سے کوئی اعلےٰ طاقت بھی ہے۔

جو لوگ جذباتی تحریکات کے زیادہ تر گرویدہ یا ان کے مفتوح ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی ناکامیوں اور کامیابیوں کی وجہ سے دونوں طرح خوشی اور مایوسی کی حالت میں دائرہ استقلال سے باہر ہوجاتے ہیں۔ اگر ان کی یہ جذباتی حدت دونوں رنگ میں انھیں فریب دیتی ہے۔ تو وہ جذباتی قوتوں کے اعتدال پر

غور کرنے کی رفتہ رفتہ عادت ڈالیں۔ تدبر اور استقلال کی عادت ڈالنے سے جذبات رفتہ رفتہ اعتدال پر آسکتے ہیں۔ جذبہ غصہ جب اعتدال سے عمل پذیر ہوتا ہے تو اس کا نام شجاعت اور بہادری ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اعتدال کی حد سے نکل جاتا ہے۔ اور باضابطہ نہیں رہتا۔ تو بدنام ہو جاتا ہے۔

خوشی اور مسرت جب ایک حد میں رہتی ہے۔ تو واقعی خوشی اور مسرت ہوتی ہے۔ اور جب حد سے باہر نکل جاتی ہے۔ تو اس کی قیمت اور وقعت نہیں رہتی جذبہ نزاکت رکھتا ہے۔ مگر ایسی نزاکت جو اپنی ذات میں استقلال اور پائداری بہت کم رکھتی ہے۔ خلاف اس کے مذاق کی نزاکت میں ایسی حدت اور جلد بازی نہیں ہوتی۔ جذبات فوری سے اکثر اوقات خیالات میں ایک قسم کی حدت اور اکھڑپن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ سے لوگ ہی نہیں بلکہ انسان خود بھی اُن سے بعض اوقات شرمندہ منفعل اور مضمحل ہوتا ہے۔ مثلاً جو انسان جذباتی تحرک کی وجہ سے اکثر لوگوں سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے وہ خود بھی اس بُرے طریق عمل سے متاثر ہوتا ہے۔ جذباتی تحریکات کی حدت اور تیزی دور ہو کر ان میں استقلال اور ایک پائدار نزاکت کس طرح آسکتی ہے جبکہ مذاقی نزاکت سے جذباتی نزاکت کی درستی کیجائے۔

جو لوگ اہل مذاق ہیں اُن کے جذبات میں رفتہ رفتہ خوش مذاقی کی بدولت اصلاح ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً جو شخص ہمیشہ غیظ و غضب میں رہتا ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس کی طبیعت میں مذاق نہیں ہے۔ جو شخص ہر بات میں مزہ لینے کا عادی ہے یا ایسی طبیعت اور ایسا دل و دماغ رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ جذبات کی حدت سے ایک حد تک محفوظ ہوتا ہے۔ مثلاً جو شخص ہنس مکھ ہوتا ہے اُسے بہت دیر میں غصہ آتا ہے اور اگر آتا ہے۔ تو اس کے دل و دماغ پر ایسا اثر

نہیں کرتا جو زیادہ تر سخت ہو۔ مذاق سے مراد ہنسی اور کھیل نہیں۔ بلکہ اس سے مراد وہ
بشاشہ اور وہ کیفیت ہے جو انسان کی زندگی کے واسطے ایک ایسا سرمایہ ہے جو اس
کی پائداری اور صحت و تندرستی و خوشی و غمی و کدورت پر بہت کچھ اثر کرتا ہے۔
وہ شخص جو کم یا بد مذاق ہوتا ہے اُن معلومات اور اُن امور میں ترقی نہیں کرتا
جو زندگی کی کامیابی اور خوشی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ وہ قدرتی مناظر سے
کوئی خوشی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور نہ دنیا کے بُرے نظاروں سے اس کی بھونڈی
طبیعت پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ وہ ایک پتھر ہے جس کو جونک نہیں لگ سکتی
وہ ایک ایسی طبیعت اور ایک ایسے دل و دماغ کا وارث ہے جو بالکل کند ہے
با مذاق انسان تھوڑی سی دلچسپی سے بھی اپنی طبیعت میں خوشی اور
مسرت کے سامان کسی نہ کسی حد تک پیدا کر لیتا ہے۔ ایک پُرلطف شعر
یا پُرمضمون فقرہ کے سُننے یا پڑھنے ہی سے اس کی طبیعت باغ باغ
ہو جاتی ہے۔ اس کا چہرہ اس کی نگاہیں اس کی گفتار اس پر شاہد ہوتی ہے
اسی طرح تھوڑی سی بدمزگی بھی اس کے واسطے سامان کدورت پیدا کر دیتی ہے
لیکن اسی حد تک جو اس کے اخلاق اور عادات کے واسطے مضر نہ ہو۔ اور
اس کی زندگی کے لیے عارضی طور پر تکلیف بخشنے والی ہو۔
اچھا مذاق یا برگزیدہ مذاق جذبات کو نرم ہی نہیں کرتا۔ بلکہ ان میں خوبصورتی
تحمل۔ بردباری اور استقلال بھی پیدا کرتا ہے۔ تکلیف دِہ خیالات اور یاس
آمیز تحریکات سے رفتہ رفتہ دور ہٹاتا جاتا ہے۔ اور ان فوری نمودوں سے دل و
دماغ کو ایک حد تک محفوظ رکھتا ہے جو اکثر سرزد ہوتی ہیں۔
ایک جذباتی انسان دوستوں کے انتخاب میں اکثر دھوکہ کھاتا ہے۔
یا دوسروں کو خود فریب دیتا ہے اگر لوگ اس کے جذباتی احکام اور کیفیات

سے اتفاق کرتے ہیں تو وہ خوش رہتا ہے اور اگر اتفاق نہیں رکھتے۔ تو وہ ناخوش ہو جاتا ہے۔ ایسا ناخوش کہ اس کی زندگی ایک وبال میں پڑ جاتی ہے۔ مثلاً زید جذباتی تاثرات کے زیر اثر ایک معمولی کامیابی کی وجہ سے اس قدر تعلیوں کی لیتا ہے۔ کہ اگر اس کے دوست اس کے اس طریق عمل سے کشیدہ خاطر ہیں تو زید دوستوں کے اس طریق عمل سے ضرور ناراض ہوگا۔ اور اس کا یہ نتیجہ ہوگا۔ کہ اس کے دوست بھی ناراض ہو جائیں گے۔ اسی طرح دوسری باتوں کا بھی خیال کرو۔

بامذاق شخص انتخاب اصحاب میں ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ وہی لوگ دوستی رکھیں گے جو اس کے مذاق سے کوئی نسبت رکھتے ہیں۔ مثلاً شاعر کا وہی دوست ہوگا اور شاعر انہی لوگوں کو زیادہ تر پسند کرے گا جو سخن فہم اور سخن شناس یا سخن سنج ہوں جو لوگ ایسا مذاق نہیں رکھتے ان کے ساتھ شاعر کی دوستی صرف دنیاداری کی محبت اور دوستی ہوگی۔ خلاف اس کے جذباتی سوا کی صورت میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے۔ جو صرف وقت گذاری کے واسطے جذبات کی تعریف میں رطب اللسان رہیں گے۔

جذباتی لوگوں کے گنتی میں صدہا دوست ہوتے ہیں۔ کیونکہ تھئیٹروں میں تماش بین بہت ہوتے ہیں۔ اور اصلیت پر غور کرنے والے بہت کم۔ بامذاق لوگوں کے دوست گنتی میں کم ہوتے ہیں۔ مگر پائداری اور صداقت و خلوص میں بہت کچھ

جذباتی شخص جلد بازی کا غلام ہوتا ہے۔ اور اہل مذاق سوچ اور تامل میں رہتا ہے۔ جذباتی انسان جلد بازی سے کام لیتا ہے۔ اور اہل مذاق دیکھتا ہے کہ اس کے موافق کون کون ہے۔ جذباتی شخص ہوا سے باتیں کرتا اور ہوا کو قابو میں لانا چاہتا ہے۔ بامذاق ان اشیاء پر نظر دوڑاتا ہے جو

اس کے قابو میں آسکتی ہیں ۔ اور جو اس کی زندگی کے واسطے کوئی مفید کام دے سکتی ہیں ۔

جذباتی بشر کے دوست خیرخواہ اور ہمدرد صادق نہیں ہوتے ۔ لیکن با مذاق کے دوستوں کے دلوں میں صادق محبت اور دل نوازی اور دل سوزی ہوتی ہے کیونکہ انھیں ایک دوسرے سے ایک نسبت اور ایک وابستگی ہوتی ہے ۔

مذاق دوستوں کے واسطے ایک ایسا ذریعہ ہے ۔ جو انھیں ایک ہی راہ اور ایک ہی سٹیج پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے ۔ جن دوستوں کا مذاق نہیں ملتا ۔ وہ بہت عرصہ تک ایک دوسرے کو دھوکہ میں نہیں رکھ سکتے ہیں ۔

جذباتی آدمی صرف گپوں اور باتوں سے خوش اور رنجیدہ ہو جاتا ہے ۔ اس کا کوئی اصول نہیں ہوتا ۔ وہ صرف اپنے فوری جذبات کی پابندی اور جوش سے دوستوں کی تلاش میں رہتا ہے ۔ خلاف اس کے با مذاق شخص ہمیشہ اپنے مطابق دوست تلاش کرتا ہے ۔ تعداد میں اگرچہ جذباتی آدمی کے دوست زیادہ ہوں لیکن خلوص میں با مذاق شخص کے مخلص زیادہ ہوں گے جس طرح گھڑی ٹھیک وقت بتا سکتی ہے ۔ اسی طرح با مذاق بھی دوستوں کے انتخاب میں صحت سے کام لیتا ہے ۔

اگرچہ جذبات میں تحریک اور زور بہت کچھ ہوتا ہے ۔ اور ان کی رفتار بہت ہی تیز ہوتی ہے ۔ لیکن نتائج اور استقلال کے اعتبار سے مذاق بہ نسبت جذبات کے فوقیت رکھتا ہے ۔ اس بحث سے یہ مراد نہیں کہ جذبات کی نفی کی جائے یا یہ کہا جائے ۔ کہ ان کی ضرورت ہی نہیں یا وہ غیر مفید ہیں ۔ ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں ۔ [illegible] ہے ۔ اور ان کی ہستی انسانی زندگی کا ایک بڑا بھاری ذریعہ

سے بہت کچھ فوائد حاصل ہوتے اور حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن اسی حالت میں۔ کہ اُن سے با اعتدال اور بہ تابع مذاق یا بہ روش مذاق کام لیا جائے۔ وہ بھی ایک طاقت ہیں۔ طاقتوں سے جب تک انسان باعتدال کام نہ لے تب تک ان کی خوبی وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔ جذباتی اور مذاقی دونوں قوتیں یا دونوں خاصے بہت کچھ نزاکت رکھتے ہیں۔ اور انکی نزاکت بہت کچھ مفید بھی ہے۔ لیکن ضرر رساں بھی ہے۔ ایک دوسرے کے اتفاق سے کام لینا انکی خوبی اور نزاکت کو صحیح پہلو پر استعمال کرنا ہے۔

دونوں قوتیں جذباتی اور مذاقی ترقی اور تنزل پاتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی دونوں بالکل ہی مدہم پڑ جاتی ہیں۔ اچھے لوگوں کی صحبت۔ اچھی مجلسیں۔ اچھی کتابیں۔ اچھے دوست۔ اچھے رفیق۔ اچھے ندیم۔ اچھے رسائل۔ اچھے اخبارات۔ اچھے مضامین۔ اچھے علوم اور اچھے فنون جذبات کی درستی۔ اصلاح اور مذاق کی ترقی کے واسطے اچھے وسائل ہیں۔ کوشش کرو کہ تمہاری طبیعتیں با مذاق ہوں۔ اور اُن کے جذبات میں استقلال اور بردباری کا عنصر زیادہ ہو۔

شاعری۔ راگ فلسفہ۔ خوش آیند مناظر جذبات اور مذاق کی صحت اور ترقی کے واسطے بڑے قیمتی ذرائع ہیں۔ ہم بہت ہی اچھا اور زندگی کو خوش زندگی بنا نیوالا ذخیرہ اپنے اندر ہی رکھتے ہیں۔ مگر اس کے لئے صحیح غور۔ صحیح مطالعہ یا صحیح استدلال کی ضرورت ہے۔

خان بہادر مرزا سلطان احمد بہادر پنجاب

آئینہ ہے اُنکا حیرانی مری ۔۔۔ زلف ہے انکی پریشانی مری

دیکھو دیکھو اک تماشہ بن گئی ۔۔۔ دیدۂ مجنوں میں حیرانی میری

[illegible]

اسرار دولت

اینڈریو کارنیگی کے نام سے آجکل ساری دنیا واقف ہے۔ اور اس کی برابر متمول اور دولتمند آدمی چراغ لیکر بھی ڈھونڈیں۔ تو ہفت اقلیم میں نہ پایا جائے گا۔ اوائل عمر میں یہ شخص چنداں مالدار نہیں تھا۔ اس کو اپنے عہد کا قارون بننے میں بعض اوقات خوش قسمتی نے بھی اس کی مساعدت کی تھی۔ وہ اس سے متاثر ہوکر لکھتا ہے۔ کہ فی زمانہ دولت کا حاصل کرنا کلیتہً شخصی محنت پر منحصر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایک واحد شخص تن تنہا خواہ کتنا ہی جفاکش اور کاروبار تجارت میں اولوالعزم ہو۔ وہ اپنے کارخانہ یا کوٹھی کی کمائی سے بہت ہوگا لکھ پتی بن جائے گا۔ تاہم ارب پتی اور کروڑ پتی ہونا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ اسرار دولت کی تمام کتابیں حفظ کر ڈالو اور روپیہ پیسہ کمانے کے سارے گروں پر (جتنے کہ از آدم تا ایندم چلے آتے ہیں) کاربند ہوجاؤ۔ تو بھی کارنیگی جیسے کھرب پتیوں کی ان گنت دولت کا سایہ تمپر کبھی نہ پڑے گا۔

کارنیگی صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ بیحد و حساب زر و مال کا ہاتھ آنا اس زمانہ میں کسی ایسے تجار یا تجارتی قوم ہی کے طفیل ممکن ہے۔ جو خود بھی لگاتار دولت میں بڑھ رہی ہو۔ اور جس کی بدولت ملک میں ہزار پتی۔ لکھ پتی اور کروڑ پتی یوماً فیوماً زیادہ تعداد میں بنتے دکھائی دیتے ہوں۔ مثال کے طور پر لیجیے کہ ایک کثیر التعداد سرمایہ کا مالک کسی دوسرے کی بڑھتی دولت کا موجب ہوتا ہے۔ اور پھر اسی سے کوئی تیسرا شخص فائدہ اٹھا کر اپنے وقت کا قارون بنجاتا ہے۔

اس بات کو کسی قدر عوام الناس کے ذہن نشین کرنے کے لئے کہ انسان صرف اپنے آپ سے نہیں بلکہ ہمیشہ دوسروں کے وجود سے روپیہ پیسہ والا بنتا ہے۔ اور ایک ترقی کرنیوالی قوم یا سوسائٹی کے ہاتھ ہی خزانہ کی کلید ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے ایک بار اعتباری ہو جانے سے پھر دولت آنکھ میچ کر ہماری طرف چلی آتی ہے۔ مسٹر کارنیگی اس مضمون کو چند ایک مثالوں سے یوں واضح کرتا ہے۔

پہلی مثال

فرض کرو کہ ایک غریب زمیندار کے دو جوان لڑکے ہیں۔ جن کی شادی آغاز شباب ہی میں اُن کے حسب منشا ہو چکی ہے۔ اور اب وہ ان کو علیحدہ علیحدہ خانہ آباد کرنے کی فکر میں ہے۔ لیکن اس کی ساری ملکیت اور کل جائداد لے دے کر بس اتنی ہے کہ وہ اپنے دونوں بیٹوں میں صرف ایک ایک کھیت تقسیم کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس خیال سے کہ اس کی آنکھیں بند ہونے کے بعد کوئی بیٹا باپ کی تقسیم وراثت سے ناخوش نہ ہو وہ قرعہ ڈالتا ہے۔ اور قرعہ اندازی سے ان کھیتوں کو اپنی اولاد کے سپرد کر کے اُن کی آئندہ خوشحالی اور اپنی عاقبت کی خیر مانگتا ہے۔ خوش قسمتی سے ایک بھائی کو جو دوسرے سے چھوٹا ہے۔ کوئی دوست مضافات نیویارک سے اس مضمون کا خط لکھتا ہے۔ کہ تم یہاں چلے آؤ۔ یہ شہر اب ممالک متحدہ امریکہ میں بلحاظ تجارت وثروت بہت بڑھتا جاتا ہے۔ اور میں حتی الامکان تمہاری خبر گیری اور مدد کروں گا کیونکہ ایک تھوڑی سی زمین سے جو تم کو ترکہ میں ملی ہے تمہارا اور تمہارے بال بچوں کا گذارہ ہونا سخت مشکل ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ عقلمند نوجوان اپنے وطن

کو خیرباد کہہ کر نیویارک جا پہنچتا ہے۔ اور دونوں ہی میں اپنے اس مالدار دوست
کی مدد سے چار پانچ ہزار ڈالر کا مالک بن جاتا ہے۔ وہ اس رقم کو پھر بکفایت
اچھی جگہ خرچ کرتا ہے۔ اور اس سے آخر کار ایک کنال زمین خرید کر اس پر
چھوٹے چھوٹے مکانات تعمیر کرا دیتا ہے۔

اس کی خوش نصیبی سے گورنمنٹ ان ہی ایام میں شہر نیویارک کو ممالک
متحدہ امریکہ کا پایہ تخت مقرر کر کے خاص اسی زمین کو حکماً لینا چاہتی ہے جس
پر اس کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں کرایہ پر چلتی ہیں۔ وہ اس بات سے کچھ بھی رنج
اپنے دل میں نہیں لاتا۔ اور چونکہ گورنمنٹ بھی اپنے ایکٹ حصول آراضیات
پر دیانت داری سے کاربند ہے۔ اس لئے وہ ۱۵ فیصدی منافع اٹھا کر
کچھ اور مالدار بن جاتا ہے۔ اور دہیں کچھ اور زمین اور مکانات کا بندوبست
کر کے اور بےفکر ہو کر اپنے عمر کے دن کاٹ رہا ہے۔ یہانتک کہ وہی زمین
اور مکانات اور دوکانات جو اس نے نہایت ارزاں خرچ پر تعمیر کرائے ہیں
شہر نیویارک کی یوماً فیوماً آبادی بڑھتے رہنے سے لاکھوں ڈالر کی قیمت
کے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی پیرانہ سالی کے زمانہ تک لکھ پتی ہو جاتا ہے
حالانکہ اس کا بڑا بھائی جو اپنے وطن ہی میں رہا وہ نہ اپنے پہلے حالات کے
مقابلہ میں کچھ گھٹا اور نہ کچھ بڑھ سکا۔ کھیتی کی چکی کو پیستے پیستے اس کا باپ
مر گیا۔ وہی کھیتی باڑی اس کے گلے پڑی ہے۔ اور لاکھوں تو کیا کبھی ہزاروں
کا بھی منہ نہ دیکھ سکے گا۔

اب ذرا آپ خیال فرمائیں کہ ان دونوں بھائیوں میں سے چھوٹا
کیوں اتنا صاحب دولت بن گیا۔ اور بڑا کیوں اپنی آبائی غربت پر اسی طرح
پڑا رہا؟ چھوٹے کے لکھ پتی بننے کا اصل راز یہ ہے۔ کہ وہ دن بدن زیادہ

بڑھنے اور ترقی کرنے والے لوگوں کے پاس زندگی بسر کرتا تھا۔ اور جوں جوں شہر نیویارک کی عام حیثیت میں اضافہ ہوتا تھا۔ ہر ایک مالدار آدمی کو اس سے گھر بیٹھے ہی فائدہ پہنچ جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی لکھ پتی صرف اپنے بنائے ہی سے نہیں بنتا۔ بلکہ کمیونٹی یا بڑھنے والی آبادی ہی اس کی غیر منقولہ جائداد کی قیمت شب و روز بڑھاتی رہتی ہے۔ اور وہ اس قدر گنجان آبادی کی قربت اور بہتر حالت ہونے کی حیثیت ہی سے لاکھوں ڈالر ہر سال پیدا کر سکتا ہے چنانچہ سرکاری رپورٹوں سے بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ ممالک متحدہ امریکہ کی غیر منقولہ جائداد کی قیمت سنہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک یعنی دس سال ہی کے اندر ساڑھے انتالیس ارب سے ساڑھے باون ارب تک ترقی کر گئی۔ اور یہ تیرہ ارب ڈالر کا تفاوت صدہا لکھ پتی آدمیوں کے تمول یا اس تمول میں اضافہ ہونیکا موجب ہوا۔ جنھوں نے اس کے پیدا کرنے میں ایک ہاتھ بھی نہیں ہلایا۔

دوسری مثال:۔ ایک اور شخص اچھی طرح سے جانتا ہے کہ آبادی اور تہذیب جہاں کہیں بڑھتی ہے۔ وہاں ریلوں کی بڑی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ جس رفتار سے کسی مقام میں آبادی اور تہذیب کو ترقی ہوتی ہے اسی کے لحاظ سے وہاں ریلوں کی زیادہ ضرورت واقع ہوتی ہے۔ وہ اپنی تھوڑی سی پونجی کسی پرائیویٹ ریلوے کے حصے خریدنے میں لگا دیتا ہے۔ اور ابھی عوام الناس کو خریداری حصص کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ مگر وہ قرض وام کر کے اسی ریلوے کے حصوں پر حصے لئے چلا جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس ریلوے کے کثیر تعداد حصوں پر بلا شرکت غیرے اکیلا قابض ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کے لکھ پتی بن جانے میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے۔ مگر یہ ساری دولت اس کو محض اپنی محنت یا کسی طرح کی قابلیت سے حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ خدا کے دین سے

ملی اور روپیہ کے خرچ سے جیسا کہ مشہور ہے کہ روپیہ کو روپیہ کماتا ہے۔

تیسری مثال:۔ ایک تیسرا شخص جو جنوبی امریکہ کے غیر آباد علاقوں میں کہیں سیر وسفر کر رہا ہے۔ گو باپ دادا نے اس کے لئے کچی کوٹھری تک ترکہ میں نہیں چھوڑی تھی۔ مگر وہ کانوں کی شناخت میں تھوڑا بہت ملکہ رکھتا ہے۔ اتفاق سے ایک ویرانہ میں اس کو زمین دوز دولت کے آثار نظر آتے ہیں۔ وہ اس کو نہایت ارزاں مول لے کر سو دو سو مزدور کان کنی پر لگا دیتا ہے۔ اس زمین میں اس کو مٹی کے تیل کے تالاب اور بعض قیمتی دھاتیں پتھر کا کوئلہ دستیاب ہو جاتا ہے۔ اور ان چیزوں کی بدولت وہی غریب شخص دنوں ہی میں لکھ پتی مشہور ہوتا ہے لیکن اس میں بھی اس کے ہاتھ کی کمائی کا ایک پیسہ تک نہیں ہے ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

چوتھی مثال:۔ دنیا میں صدہا کاروبار تجارت ایسے ہیں۔ کہ ابھی اُن میں لاکھوں روپیہ لگانیکا کافی امکان باقی ہے۔ مثلاً ایک نوجوان صرف پھلوں اور گوشت کے ٹکڑوں کو ٹینوں میں محفوظ کرنیکا کام سیکھکر گھر سے چلدیتا ہے۔ اور شہر شکاگو میں جا پہنچتا ہے۔ شہر سے باہر کچھ زمین لے کر اس نے ایک باغ لگایا۔ اور ساتھ ہی کچھ عمدہ بھیڑیں بھی پرورش کیں۔ اس کی فن باغبانی سے خاص ذاتی واقفیت کے باعث باغ بہت اچھا پھل لاتا ہے مگر میوہ اتنا کثیر نہیں ہوتا۔ کہ وہ اس کو مارکٹ میں لیجاتا۔ اس لئے اس نے پھلوں کو ٹینوں میں بند کر کے مختلف مقامات کو بھیجنا شروع کیا۔ اور اپنی فربہ بھیڑوں کا گوشت بھی اسی طرح ٹینوں میں بھر دیا۔

یہ دونوں چیزیں جہازی ملازموں کو بہت پسند آئیں۔ اس شخص نے دیکھا کہ جہاز اور دخانی کشتیاں جس قدر بڑھتی جاتی ہیں۔ اس کے ٹینوں کی مانگ بھی اسی قدر بڑھتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے کارخانہ کو اشتہارات کے ذریعہ بڑا فروغ دے دیتا ہے۔ اور ایک دن اسی چھوٹے سے باغ اور چند بھیڑوں کے طفیل ملک امریکہ کے لکھپتیوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔ مگر اس کی یہ ساری دولت صرف اس خاص آبادی کی زیادتی پر دار و مدار رکھتی ہے۔ جو جہازوں میں ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی ہے۔ اور جسے تازے پھلوں یا تازہ گوشت کا منہ دیکھنا بالکل نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے ٹینوں میں بند گوشت اور پھل خریدتی کھاتی ہے۔ مگر مُردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں ایک دولت جمع کرنیوالے کو ان باتوں کا خیال مطلق نہ کرنا چاہئے کہ کس کو تازہ چیز ملتی ہے اور کس کو باسی۔ اسے تو جس طرح بھی ممکن ہو دولت کمانی چاہئے۔

پانچویں مثال:۔ ایک اور شخص ہے جسے آخری قسم کا لکھپتی کہنا چاہئے وہ بھی دولت ہی سے دولت کو کھینچنا چاہتا ہے۔ اور اس کا جال سب سے زیادہ قوی ہے۔ بقول شخصے زر را زر میکشد۔ صرّاف اور دلال یا بینکر ہمارے بڑے بڑے شہروں کی ناک ہیں۔ ان کے بھرے ہوئے خزانے جہاں کہیں دوسروں کی دولت کے کفیل بنتے ہیں۔ وہاں وہ کسی طرح روپے کے لین دین سے خود کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتے۔ ان میں جو روپیہ داخل ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ بقایا ہی چھوڑ جاتا ہے۔ اور جو روپیہ ان خزانوں میں سے کسی کے سر سود پر چڑھکر الوداع کہتا ہے برس دو برس کے بعد معہ اضافہ انہی خزانوں میں واپس آتا ہے۔ غرض یہ سود در سود کا ہیر پھیر لاکھوں کی دولت کو منقلب کر دیتا ہے۔ اور ایک ادنےٰ بینکر بھی بشرطیکہ کسی ترقی کرنیوالی قوم سے واسطہ رکھتا ہو۔ دنوں میں کروڑپتی بن سکتا ہے۔ او

یورپ وامریکہ میں ایسی مثالیں تو سینکڑوں مل سکتی ہیں۔ کہ بعض ادنےٰ حیثیت کے لوگ بغیر کسی محنت یا اعلیٰ درجہ کی قابلیت کے لکھ پتی اور کروڑ پتی نہیں بلکہ ارب پتی بن گئے۔

میرے دوستو۔ ہندوستان میں بھی آبادی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ نئے نئے کاروبار تجارت کا میدان وسیع ہورہا ہے۔ میٹیریل یعنی وہ مسالے جن سے کوئی کارآمد چیز تیار ہوسکے یہاں بھی بکثرت موجود ہیں پھر تم بھی لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی ارب پتی ہونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ کیا انسان جو کچھ ایک جگہ کرکے دکھا دیتا ہے وہ دوسری جگہ نہیں ہوسکتا۔ کیا تاریخ ہمیشہ اپنے واقعات کو جا بجا دہرایا نہیں کرتی؟ دراصل یہ سب باتیں ممکن اور سہل الحصول ہیں صرف ہمت باہمی اتفاق اولوالعزمی اور عالی حوصلگی کا قوم میں عام ٹوٹا ہے۔ ورنہ مایوس ہونیکی تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ نوجوانو! کچھ اپنے دل میں تم ہی غور کرو۔ کہ افلاس نے ہماری کیسی بری گت بنا رکھی ہے۔ اب وقت کو باتوں میں یونہی ضایع نہ ہونے دو اٹھو اور حوصلہ سے اٹھو۔ یہ نہ ہو کہ ؎

اپنی ناکامی کا آجاتا ہے پہلے ہی یقیں ہٹ جاتے ہیں ہمت کا کرنے جبکہ کوئی کام ہم

غرض موجودہ صورت واقعات فوراً بدلنے کے لایق ہے۔ لیکن جب تک تم ہی سے ابتدا نہ ہوگی کچھ نہ ہوگا۔ یقین رکھو۔ کہ بغیر بیج بوئے کوئی شخص بھی خرمن کا مالک نہیں بن سکتا۔

یہ علم الاقتصاد کا مسئلہ ہے۔ کہ سب سے شاندار اور سب سے دولتمند وہی قوم ہوسکتی ہے جس کے ہاتھ میں تجارت اور حرفت کا میدان زیادہ ہو۔ جو قوم ان باتوں کی مالک ہے وہی حقیقی معنوں میں فرمانروا ہے۔ وہی بحیثیت قوم دوسری قوم یا اقوام سے برتر ہے۔ وہی زندہ قوم ہے۔ وہی کامیاب

قوم ہے۔ وہی خوشحال ہے۔ اور وہی زندگی کی کشمکش میں زندہ رہ سکتی ہے ہمارے تعلیم یافتہ اس ضروری سوال پر عملی اور فوری توجہ دیں۔ اور سرکاری ملازمتوں یا وکالت کی جگہ حرفت اور تجارت کو شعار زندگی اور مقصود حیات بنائیں۔ کیونکہ موجودہ تہذیب اور روشنی کے زمانہ میں دولت ہی طاقت ہے۔ دولت ہی مضبوط قومیت ہے۔ اور دولت ہی متحرک قومی زندگی ہے ٭

شیر علیخاں سرخوش

(از جناب حیات بخش صاحب رساؔ وکیل مصاحب دربار رام پور)

دشمن کی بات جب تری محفل میں رہگئی
امید یاس بنکے میرے دل میں رہ گئی

بیتاب ہو کے حسرتِ دل دل میں رہ گئی
لیلیٰ تڑپ کے پردۂ محمل میں رہگئی

کم آب تیغ سے بھی نہ سوز دروں ہوا
اک آگ تھی کہ سینۂ بسمل میں رہ گئی

حیرت نے میری کام کیا جلوہ گاہ میں
آئینہ بنکے ان کے مقابل میں رہ گئی

نکلی جو دل سے آہ تو لب تک نہ آسکی
تھک کر غریب پہلی ہی منزل میں رہ گئی

تو ہمسے چھپ گیا تو تری شکلِ دلفریب
تصویر بنکے آئینۂ دل میں رہ گئی

دشمن کے بھیس میں نکلا مدعائے دل
یہ چال ہمسے یار کی محفل میں رہ گئی

دیکھا جو قتل عام تو ہر لاش پر اجل!
اک آہ بھر کے کوچۂ قاتل میں رہگئی

اک آرزوئے غیر کہ نکلی ہزار بار
اک میری آرزو کہ میرے دلمیں رہگئی

نکلا وہاں سے میں تو مرے دل کی آرزو
سر پیٹتی ہوئی تری محفل میں رہ گئی

میں کیا کہوں رساؔ کہ میرے دل پہ کیا بنی
تلوار کھنچکے جب کفِ قاتل میں رہگئی

ہفت رنگ شاعری

(خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری پر سرسری نظر)

نہوں کیوں لاکھ مستانہ ادائیں میرے نالہ میں
گدائے میکدہ ہوں ہر طرح کی ہے پیالہ میں

خواجہ حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ جن کی تصویر آج ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔ اُن باکمال شعرا اور عالی مقام اولیا میں سے تھے۔ جن کو "لسان الغیب" کہنا چاہئے۔ کیونکہ جو کچھ آپ لکھ گئے۔ وہ امٹ پیشینگوئی اور صداقت ہے۔ اور بعض خوش اعتقاد اصحاب تو اس سے اپنے یا دوسرے کے مستقبل کے متعلق شگون لیا کرتے ہیں۔ آپکا کلام بلاغت نظام عشق الٰہی کے نکات اور رموز عرفان حقیقی کا انتھاہ سمندر ہے۔ جس کی غواصی سے انمول رتن اور دُرشاہوار ہاتھ لگتے ہیں۔ جو صوفی قیود ظاہری سے چھٹکارا پا جاتے ہیں۔ آپ کا پُرسوز و گداز کلام ان کے اطمینان قلب کے لئے شراب روح پرور اور خوشبوئے تسکین آور کا کام دیتا ہے۔ آپ کے اشعار چشمۂ حیواں اور کلید گنج معرفت اور معدن لطائف روحانیہ ہیں۔ اعلیٰ معاملہ بندی، بہترین استعارہ و تشبیہ جو شاعری کی جان ہیں وہ سب آپ کے کلام میں نہایت احسن طریق اور دلکش پیرایہ میں پائی جاتی ہیں۔ جو لوگ عاشق مزاج ہیں یا مذاق عاشقی رکھتے ہیں۔ حضرت حافظ کے اشعار اُن کی زندگی کے لئے باعث مسرت ہیں۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کے دلدادہ اس میں اپنے اپنے رنگ و مطلب مذاق اور راحت کی باتیں پاتے ہیں۔ اور بقول حضرت آزاد

وہلوی حافظ کا کلام ایک خم کی مانند ہے جس میں سے ہر شخص اپنے مطلب کی شراب حاصل کرتا ہے ۔خاصان خدا۔ صوفیان باصفا۔ رند۔ عاشق مجازی دُنیادار۔ شاعر فلسفی۔ غرضیکہ ہر شخص کو آپ کا کلام خود اسی کے رنگ مذاق میں جلوہ فگن ہو کر مطمئن کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ مختلف النوع اور مختلف الحیثیت ہونیکی صفت رکھتا ہے ۔آپ کا دیوان ایک گلشن ہے جسمیں ہر شخص کے مذاق و مطالب کے رنگا رنگ پھول کھلے ہیں۔ اور ایک ایک پھول متعدد صفات رکھتا ہے ۔یہ بات اُردو یا فارسی کے کسی اَور شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اور اس لحاظ سے آپ "سر برآمد سخنوران" کہلاتے ہیں۔

خواجہ حافظ کے کلام سے چند اشعار ذیل میں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے نذر کئے جاتے ہیں۔ جن سے کافی طور پر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کا کلام کس پایہ اور کس رنگ کا ہے۔

تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود
سر ما خاک رہ پیر مغاں خواہد بود

اس شعر میں ایک شرابی کی خواہش دلی کا اظہار ہے کہ جب تک شراب خانہ اور شراب کا نام و نشاں باقی رہے گا تب تک شراب فروش کے راستہ کی خاک ہو گی اور ہمارا سر یعنی اس خاک کو ہم سجدہ کرتے رہیں گے۔ اب اسی کو اگر عشق مجازی کے رنگ میں دیکھا جائے تو کچھ اور ہی لطف دیتا ہے ۔اور جب اسے عشق الٰہی کی عینک سے دیکھا جائے ۔تو ایک اور ہی بہار نظر آتی ہے۔

بلا زماں سلطاں کہ رساند ایں دعا را

کہ لشکر پادشاہی ز نظر مراں گدا را

بادشاہ کے مقربوں تک کون ہماری یہ التجا پہنچا سکتا ہے۔ کہ بادشاہ فقیروں پر ازرو ئے جو کرم سخاوت کرتا ہے اسے ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے۔ وہ مجھ گدا کو اپنے سامنے سے چلے جانے کا حکم نہ دے۔

اب ذرا حسن و عشق کی رنگ آمیزی جو اس شعر سے مترشح ہے ملاحظہ فرمائیے ایک معشوق ایک عاشق کو اپنے دروازے سے ہٹوا دیتا یا اپنی محفل سے نکلوا دیتا ہے۔ وہ عاشق بیقرار کہتا ہے کہ ایسا کون ہمدرد ہے جو میرے معشوق کے حاشیہ برداروں تک یہ پیغام پہنچا سکے۔ کہ اے بادشاہ حسن تجھے جو یہ شرف عطا کیا گیا ہے کہ تو عاشق نوازی کرے تجھے اس پر کاربند ہو کر مجھے اپنے در سے نہ ہٹانا چاہیئے۔

آنکس کہ بدست جام دارد سلطانی جم مدام دارد

آہاہا کیا ہی سچی اور دل لگتی بات ہے جس شخص کے ہاتھ میں ہمیشہ جام شراب ہے۔ وہ جمشید جیسے مینوش بادشاہ کی سی بادشاہت رکھتا ہے۔ یہ تو ظاہری معنی ہیں۔ اب ذرا باطنی معنی ملاحظہ فرمائیے جس شخص کا دل اس کے اختیار میں ہے وہ بادشاہ ہے۔ ایک اور معنی یہ ہیں جو سالک یعنی مرشد اپنے ہاتھ میں معرفت الہی کا جام رکھتا ہے وہ جمشید کی سی شان اور شہنشاہی سے بہرہ ور ہے۔

شکر ایزد کہ میان من و او صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

ایک عاشق کا بگاڑ رقیبوں کی وجہ سے اس کے معشوق سے ہو گیا مدت دراز کی جدائی کے بعد دونوں میں صلح ہو گئی۔ عاشق خوشدل کہتا ہے

کہ خدا کا شکر ہے کہ مجھ میں تجھ میں ملاپ ہو گیا۔ جس کی حوروں اور غلمانوں تک کو اس قدر خوشی ہوئی ہے کہ وہ خدا کے شکریہ کے ساغر پر ساغر چڑھا رہے ہیں۔ یعنی دو دلوں کا تقرب حوروں تک کو بیحد پسند آیا ہے۔ اس مطلب کو اگر روحانیت کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ تو رنگ ہی بدلجاتا ہے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند

نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

کیسی اعلیٰ معاملہ بندی ہے۔ ہر معشوق جو بناؤ سنگھار کر سکتا ہے یہ لازم نہیں کہ وہ کسی کا دل لبھانا بھی جانتا ہو۔ اور ہر شخص جو آئینہ بناتا ہے۔ یہ لازم نہیں آتا کہ وہ سکندر کی سی عقل و فہم یا تدبر رکھتا ہو۔

سواد نقطۂ بینش ز خال تست مرا

کہ قدر گوہر یکدانہ گوہری داند

ایک عاشق اپنے معشوق سے کہتا ہے۔ کہ میری آنکھ کی پتلی میں جو سیاہی ہے وہ مجھے تیرے خال سیاہ سے حاصل ہوئی ہے۔ میں جوہری ہوں۔ تیرا خال جوہر ہے۔ اس لئے میں اس کی قدر جانتا ہوں۔

ہمائے اوج سعادت بدام ما افتد

اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد

ایک عاشق کہتا ہے کہ اے میرے معشوق اگر تو میرے کاشانہ پر قدم رنجہ فرمائے۔ تو تیرے آنے ہی سے اوج سعادت یعنی خوش قسمتی کی ہما میرے پھندے میں پھنس سکتی ہے۔ یعنی مجھے ہاتھ لگ سکتی ہے۔ تیری جدائی مصائب کا سرچشمہ ہے اور تیری قربت راحتوں کا پیش خیمہ سچ ہے کہ ایک عاشق کے لیے معشوق کی قربت ہی سب کچھ ہے۔ اس لئے

جب تو میرے گھر آئے گا۔ تو خوش نصیبی بھی تیرے قدموں سے لگی آئے گی۔

ما ز یاران چشم یاری داشتیم
خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

مطلب یہ ہے کہ ایک باوفا دوست اپنے دوسرے دوستوں سے توقع رکھتا تھا۔ کہ وہ اس کے ساتھ وفا کریں گے۔ مگر تجربہ سے یہ امید غلط نکلی۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ جو کچھ میں نے سمجھ رکھا تھا وہ میری غلطی تھی۔ کیونکہ اس زمانہ کے دوست و آشنا اپنی غرض کے بندے ہوتے ہیں۔ نہ کہ دوسرے کے مطالب کے گاہک اور خواہاں۔

گفتگو آئین درویشی نہ بود
ورنہ با تو ماجراہا داشتیم

کیسی قناعت۔ کیسی شرافت۔ کیسی پابندی کیسی وضعداری اس شعر میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے۔ گفتگو بمعنی شکوہ و شکایت۔ آئین بمعنی وضع۔ رسم۔ قانون۔ ماجرا بمعنی داستان یا شکایت۔ درویشی بمعنی عاشقی۔ ایک ستم رسیدہ عاشق اپنے دلبر سے کہتا ہے۔ کہ عاشقوں کا یہ شیوہ ہی نہیں کہ شکایت کریں۔ اگر شکایت کرنا ان کی رسم ہوتی تو میں تمکو شکایت کی داستانیں سناتا یعنی اس کے دفتر کے دفتر الٹتا۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں عاشقوں کا مذہب ان کو اجازت نہیں دیتا۔ کہ وہ شکایت زبان تک بھی لاسکیں۔

شاہ ترکاں چو پسندید بچاہم انداخت
دستگیر ار نشود دوست تہمتن چہ کنم

اس شعر میں ایک تاریخی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ ترکوں کے

بادشاہ افراسیاب نے بیژن پہلوان کو کسی بات پر ناخوش ہوکر ایک کنوئیں میں بند کر دیا۔ رستم نے جس کا لقب تہمتن تھا بیژن کو اس کنوئیں سے نکالا تھا۔ اب ایک عاشق اس کے معنی یوں لیتا ہے کہ ترکوں یعنی معشوقوں کے بادشاہ نے جو میرا دلدار ہے یہی پسند کیا کہ میرے رقیبوں کی باتوں پر عمل کرکے مجھے ایک کنوئیں میں ڈالدیا۔ یعنی سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے اگر میرا دوست یا مددگار رستم جیسا دلاور شخص نہ ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اور کیسے اس چاہ مصیبت سے تحمل سکتا ہوں۔ جب تک خدا میری دستگیری نکرے مجھے اپنے معشوق کی دی ہوئی مصیبت سے چھٹکارا نصیب نہیں ہو سکتا

ایڈیٹر

ترقی اشاعت

جن کرمفرماؤں نے ہماری تحریک پر "مخزن" کی ترقی اشاعت میں امداد دی ہے اور ایک ایک یا دو دو نئے خریدار دئے ہیں ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے کرمفرماؤں کو خاص طور پر توجہ دلائی جاتی ہے۔ کہ وہ بھی ترقی اشاعت کا فرض ادا کرکے ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں اور "مخزن" جو اہم کام انجام دے رہا ہے اس کو تقویت عطا فرمائیں۔ ایک کرمفرما کی رائے ہے کہ ترقی اشاعت میں امداد دینے والوں کے نام اور ان کے پیدا کئے ہوئے خریداروں کی تعداد "مخزن" میں شایع کی جائے آئیندہ سے انشاءاللہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ امید ہے ناظرین مخزن اس کی ترقی اشاعت میں خاص کوشش فرمائیں گے۔

ریویو

"نے" کے قواعد یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ جسے منشی سید علی محمد صاحب ذاکر المدنی مدرس اردو گورنمنٹ مدرسہ اعظم مونٹ روڈ مدراس نے بڑی محنت و تحقیقات سے تصنیف کیا ہے۔ لفظ "نے" کے استعمال کے متعلق کل قواعد کو سلسلہ وار مرتب کیا ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے جتنی کتابیں اردو اور انگریزی میں مل سکتی ہیں۔ ہر ایک سے قواعد اخذ کئے ہیں جنوبی ہند اور دکن میں تحریر و تقریر میں "نے" کا لحاظ نہ کرنے سے جو نقایص واقع ہوتے تھے وہ اس رسالہ کے مطالعہ سے دور ہو سکتے ہیں۔ رسالہ میں "نے" کی تعریف۔ "نے" کے عمل سے اسماء کی تبدیلی۔ "نے" کا استعمال۔ "نے" بطور علامت فاعل و مفعول۔ "نے" کا حذف۔ کن صورتوں میں "نے" کا استعمال درست نہیں۔ وغیرہ وغیرہ امور پر کافی بحث کر کے اردو والوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ حامیان اردو کو اس رسالہ کی قدر دانی کرنی چاہیے۔ قیمت ۴ر مصنف سے مل سکتا ہے۔

المضمون:۔ آجکل اردو زبان کو ترقی دینے کے لئے جو زبردست کوشش جنوبی ہند میں ہو رہی ہے اسکے سلسلہ میں "المضمون" ایک رسالہ بھی نکلا ہے جسمیں علمی۔ ادبی۔ تاریخی۔ مذہبی اور تمدنی مضامین شایع ہوتے ہیں۔ اپنے مضامین نظم و نثر کے باعث المضمون اردوئے معلی کی دلچسپیوں کا صحیفہ۔ انشا پردازی کا مخزن اور ضروریات زمانہ کا ادیب ہے۔ المضمون کے نامہ نگاروں میں نہایت قابل اہل قلم شامل ہیں۔ رسالہ ہمہ وجوہ نہایت عمدہ ہے قیمت سالانہ عوام سے ۲ع ۴ر۔ نمونہ کا پرچہ ۴ر ملنے کا پتہ:۔ منشی محمد الفخر الدین بیخود مالک و ایڈیٹر المضمون۔ ۶۶ - ۶۷ جان جہاں خاں روڈ۔ رائے پیٹھ مدراس۔

المورکھا

نمبر ۳

بقیہ باب ۴

یہ سب جانتے ہیں۔ کہ فقط انسان کی ہی آنکھیں ایسی کمزور اور نازک ہیں کہ اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتیں۔ ورنہ سب حیوانوں کو اندھیرے میں اچھا خاصہ دکھائی دیتا ہے اور ان کو رات کے وقت چلنے پھرنے میں کچھ دِقت نہیں ہوتی۔ اس لئے نقاب پوش نے پُرانے قلعے کے کھنڈروں سے نکلتے ہی گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ عرب کا بیش قیمت گھوڑا اور وہ بھی تیار راتب اور ٹہلایا ہوئے ایڑ لگتے ہی ہوا ہو گیا۔ ماہ مُنیر گو عورت تھی۔ مگر ہمارے لال قلعہ کی بیگم نہ تھی جس کو عمر بھر پینس کی سواری کے سوائے گھوڑے کی شکل بھی دیکھنی نصیب نہ ہوتی تھی۔ وہ ایران کے خطہ کی رہنے والی تھی۔ جہاں عورتیں بھی مردوں کی طرح گھوڑا کوداتی پھیرا تی ہیں۔ اس لئے اس کا گھوڑا بھی نقاب پوش کے گھوڑے کے پیچھے لگا چلا جاتا تھا۔ اللہ اللہ وہ رات کا سناٹا۔ ہوا کا زور۔ سردی کی شدت درندوں کی ہولناک آوازیں تھپڑے کلیجہ کو پانی کرتی تھیں۔ ماہ منیر سہمی جاتی تھی۔ ساتھ ہی اس کے یہ ڈر کہ کہیں خبر نہ ہو گئی ہو۔ اور پکڑنے کے لئے پیچھے سے دوڑ نہ آتی ہو۔ وہ مڑ مڑ کر دیکھتی جاتی تھی۔ ایسے گھُپ اندھیرے میں مسافر کا یہ یقین کر لینا کہ ہم ٹھیک رستہ پر جا رہے ہیں بالکل غلطی ہے البتہ اس وقت اگر کوئی چیز راہبر کا کام دے سکتی ہے تو اٹکل۔ کنوئیں میں گرادے

اور سیدھے رستہ پر لگا دے تو اٹکل لگا دے۔ اس لیے نقاب پوش اور ماہ منیر بھی فقط اٹکل کے سہارے سے رستہ طے کر رہے تھے۔ کئی بار اندھیرے میں گھوڑے جھجکے اور پھر چل دیے۔ کئی بار گھوڑوں نے ٹھوکریں لیں۔ اور نقاب پوش اور ماہ منیر گرتے گرتے بچے۔ کئی بار یہ معلوم ہوا کہ گھوڑے اونچے پر سے نیچے کی طرف جا رہے ہیں۔ کئی بار یہ معلوم ہوا کہ گھوڑے کسی سلامی چیز پر چڑھے اوترے۔ کئی بار یہ معلوم ہوا گھوڑے دلدل اور پانی میں چل رہے ہیں کیونکہ کیچڑ میں چلنے کی آواز دونوں کے کانوں میں پہنچتی تھی۔ اور کیچڑ اور پانی کی چھینٹیں اڑ اڑ کر ان کے ہات اور پاؤں پر پڑتی تھیں۔ مگر رات کی سیاہی نے اس بھید کو کھلنے نہ دیا۔ کہ رستہ کس صورت کا ہے۔ اور ہم آسمان پر جا رہے ہیں یا زمین کی تہ میں۔ اس موقع پر اچھے اچھے شہسواروں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور گھوڑوں کو دو گام چلانا بھی دوبھر ہوتا ہے۔ مگر ڈر بری بلا ہے۔ نقاب پوش اور ماہ منیر کو اس کی اصلا پروا نہ تھی۔ کہ گھوڑے ہمیں کھائی میں یا گڑھے میں لے گریں گے۔ اور ہماری جان جاتی رہے گی۔ ان کو یہ لو لگ رہی تھی۔ کہ جہاں تک ہو سکے گھوڑے سرپٹ چلے جائیں۔ اور ہم پلک مارتے ہیں خوارزم کی سرحد سے نکل جائیں۔ در حقیقت دونوں گھوڑے عرب کے اصیل شائستہ اور دم راہوار تھے۔ انھوں نے اپنے سواروں کی مرضی کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ صرف اونچی نیچی جگہ تو اپنی چال کو دھیما کر دیتے تھے۔ نہیں تو یکساں پاشنہ جا رہے تھے اور تیزی کے مارے زمین پر قدم نہ رکھتے تھے۔

اسی بھاگ دوڑ میں چھ گھنٹہ گذر گئے اور صبح کے آثار نمودار ہو چلے۔ پو پھٹ گئی۔ شفق نے آسمان کے کنارے کو کسی نازنین کے باریک دوپٹہ کی طرح گل شفتالو رنگ دیا۔ اور سورج کی کرنوں نے اس پر گوٹہ ٹھپہ لگا کر

چہکا دیا۔ پرندوں نے درختوں پر بیٹھے بیٹھے صبح کی آمد کی مبارکباد شہانہ سروں میں شروع کر دی۔ اب ماہ منیر بیگم نے دیکھا کہ میں ایک عرب کے خوبصورت گھوڑے پر جس کا رنگ صبح کی مانند سفید ہے سوار ہوں۔ اور میرے آگے بدر سیاہ مخمل کا شانی کا لباس پہنے ہتھیار باندھے ہوئے کالی نقاب منہ پر ڈالے پری کی طرح سبزہ گھوڑے پر سوار ہے۔ اور ہم دونوں ایک میدان میں چلے جاتے ہیں جس میں قدرت کے باغبان نے رنگا رنگ چھوٹے بڑے درخت لگا رکھے ہیں۔ پودوں کی لال لال اور چکنی چکنی کونپلیں پھولوں کی خوشبو اور رنگینی۔ ہری ہری گھاس اور اس پر اوس کے شفاف موتیوں کو مات کرنے والی بوندیں۔ درختوں کی سرسبزی دیکھکر روح خوش ہوئی جاتی ہے۔ ہرنوں کے جھلر کے جھلر ہری ہری دوب کھڑے چر رہے ہیں۔ چکارے گھوڑوں کی ٹاپ سنکر پارہ کی طرح اڑے جا رہے ہیں۔ جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ اور اس قدرتی گلشن میں وہ دلفریبی ہے جس کے بیان کرنے سے زبان عاجز ہے۔ دن نکلتے ہی نقاب پوش اور ماہ منیر نے اپنے گھوڑوں کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ اور اب یہ دونوں گھوڑے رو میں پڑ گئے۔ اور گھنٹوں کا رستہ گھڑیوں میں طے کرنے لگے۔ یہانتک کہ دن کے دس بجگئے اور ماہ منیر کی طاقت نے جواب دیدیا۔ وہ نقاب پوش کے گھوڑے سے بیس قدم پیچھے رہگئی اور اس نے لاچار ہو کر کہا بدر صاحب اللہ جانتا ہے۔ اب میں تھک کے چور ہو گئی ہوں۔ کم بخت گھوڑے کی باگیں کھینچتے کھینچتے میرے بازو رہ گئے۔ ایک ایک ران میری سو سو من کی بھاری ہو گئی ہے۔ تم گھوڑے کو روکو نہیں میں کوئی دم میں نیچے آ رہونگی۔

ماہ منیر کی اس صدا نے نقاب پوش کو چونکا دیا۔ اور اس نے فوراً اپنے گھوڑے کو روک کر اس کی گردن پر زور سے ہات مارا اور کہا شاباش بیٹا شاباش

گھوڑا سر سے پاؤں تک پسینہ میں نہا گیا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ ٹپک رہے تھے۔ نقاب پوش گھوڑے پر سے اُتر پڑا۔ اور گھوڑے کی باگ ہات میں لیا اُدھر منہ کر کے کھڑا ہو گیا جدھر سے آیا تھا تاکہ ماہ منیر کو معلوم ہو جائے کہ وہ اس کے انتظار میں کھڑا ہے۔ اس میں ماہ منیر بھی وہاں پہنچ گئی۔ اور اس نے کہا مجھے گھوڑے پر سے اتار لو۔ نقاب پوش نے بڑھکر جلدی سے اس کے گھوڑے کی رکاب تھام لی۔ اور ماہ منیر لرزتی کانپتی نقاب پوش کے کندھے پر ہات رکھ کے گھوڑے سے اُتر آئی۔ نقاب پوش نے دونوں گھوڑے ایک درخت کی جڑ سے باندھکر دوسرے درخت کے نیچے جو بہت چتر دار تھا غاشیہ بچھا دیا۔ اور ماہ منیر کا ہاتھ پکڑ کر غاشیہ تک لیگیا۔ اور جب تک وہ بیٹھ نہ لی۔ اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔ کیونکہ اسکو یقین تھا کہ یہ نازنین تھک کر شل ہو گئی ہے۔ اور اب اسمیں اتنا سکت نہیں رہا ہے کہ دو قدم بھی چل سکے۔ اگر میں اس کو چھوڑ دونگا۔ تو دھم سے زمین پر گر جائے گی۔ جب نقاب پوش نے ماہ منیر کو غاشیہ پر بٹھا دیا تو اس نے چاہا کہ وہ غاشیہ پر سے سرک جائے۔ مگر ماہ منیر نے اُس کا ہات نہ چھوڑا۔ اور زبردستی اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اور کہا مُلّا صاحب تشریف رکھئے۔ آپنے بھی تو آخر سفر کی زحمت اُٹھائی ہے۔ نقاب پوش چار ناچار ماہ منیر کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ مگر بالکل چپ بالکل خاموش۔

ماہ منیر "بد صاحب بدر صاحب"

جواب ندارد

ماہ منیر "اے ہے تم بولتے کیوں نہیں کہیں رات کی سوئی کھا کر دشمن گونگے تو نہیں ہو گئے"

جواب ندارد

ماہ منیر: "دیکھو بدرتم ہمیں ستاؤ نہیں۔ اللہ جانتا ہے ہمیں ڈر لگتا ہے۔ آخر بات کیا ہے۔ تم بولتے کیوں نہیں"؟

جواب ندارد

ماہ منیر: (غصہ سے) "لو اور سنو۔ اچھا جو چلا بگھارا۔ میں ہوں کہ خوشامد کرتے کرتے تھکی جاتی ہوں۔ اور ملا صاحب کے بھاویں بھی نہیں۔ کم بخت جی جل کے کوئلہ ہو گیا۔ نوج کوئی ایسا ڈھیٹھ ہو"۔

جواب ندارد

جب ماہ منیر نے دیکھا کہ نقاب پوش جم بن گیا۔ اور ہوں ہاں بھی نہیں کرتا۔ تو اُسے طیش آ گیا۔ اور اس نے جلکر کہا۔ اچھا ٹھیرو تو سہی میں تمہارے سارے بہروپ کو ہی توڑے مروڑے ڈالتی ہوں۔ جب آنکھیں چار ہونگی اس وقت تو لا چار بولنا ہی پڑے گا۔ یہ کہکر اس نے نقاب کے ریشمی بند جو نقاب پوش کی گُدی کے پیچھے بندھے ہوئے تھے جلد جلد کھول اور نقاب مُنہ پر سے اُتار خاک پر پھینکدی۔ مگر خدا جانے نقاب ہٹتے ہی اس شخص کے چہرے میں ماہ منیر نے کیا کراہت پائی جس کو دیکھتے ہی اس نے اپنا نازک ہات زور سے اپنے کلیجہ پر مار کر کہا۔ "اوہی تو کون بلا ہے۔ ہے ہے یہ کون ہے ہائے اللہ یہ کون ہے"؟

وہی شخص (جس کے چہرہ سے ماہ منیر نے نقاب اُتاری تھی) "آپ مجھے دیکھکر اتنا کیوں ڈرتی ہیں۔ میں وہی آپ کا غلام سور کھا ہوں جو دن رات آپ کی خدمت بجا لاتا ہے"۔

یہ فقرہ اس غضب کا تھا جس کو سُنکر ماہ منیر کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور اس نے مارے غصہ کے اپنا آپا پیٹ ڈالا۔ بال نوچ ڈالے سر کھسوٹ

ڈالا۔ مورکھا نے ماہ منیر کے دونوں ہات بہت نرمی سے تھام کر کہا۔ خدا کے لئے بس کرو۔ دشمن ہلکان ہو جائیں گے۔ ماہ منیر غصہ میں زہر بھر رہی تھی اور اُس کی آنکھوں کے سامنے اسوقت دنیا بھر اندھیر تھی۔ مورکھا کا چھونا اسے اسوقت بہت ہی بُرا معلوم ہوا۔ وہ مدت سے اُس پر حاوی تھی۔ اس نے مورکھا کے سر کے بال پکڑ کر اور ایک ہات میں اپنی نگینوں دار جوتی زمین پر سے اُٹھا کر مورکھا کی گت بنانی شروع کر دی۔ مورکھا بدنصیب کے سر پر انگنت جوتیاں پڑ گئیں مگر اللہ رے اس کا ظرف! اس نے اُف تک نہ کی۔ اور گردن جھکائے پٹتا رہا۔ جب مارتے مارتے ماہ منیر تھک گئی تو اس نے جوتی ہات سے ڈالدی۔ اور اب زبان کی مار دینی شروع کی۔

ماہ منیر۔ "چل دفعان ہو میرے سامنے سے نہیں اُٹھکر پھر اتنی جوتیاں ماروں گی۔ کہ چندیا کے بال تک اُڑ جائیں گے"

مورکھا دو قدم ہٹ کر اپنے دونوں ہات غلاموں کیطرح باندھکر اور آنکھ نیچی کر کے جا کھڑا ہوا۔

ماہ منیر۔ ہے کیسا موا چھتیسا عیّار مکّار۔ جانیئے خدا تجھے غارت کرے۔ اللہ رے فیلسوف۔ اللہ رے دغا باز۔ تو نے شیطان کے بھی کان کتر ڈالے۔ میں جانتی ہوں اس مُلّا کے لونڈے کو خبر بھی نہیں۔ یہ سارے کرتوت تیرے ہی ہیں۔ اور تو ہی سیکھے اوپر کا اوپر نے اُڑا ہے۔ اُس بیچارہ کو ناحق بدنام کیا ہے۔ ناشاد نامراد میرے پیٹ میں گھس گیا۔ مجھے ایسا پٹوں میں لیا۔ ایسا پٹوں میں لیا کہ میں دیوانی ہو گئی۔ بیگم انھوں نے ہجرت کی صلاح دی ہے اور یہ سمجھایا ہے۔ اور یہ بتایا ہے اور وہ آپ کے خیر خواہ ہیں اور دل سے خیرخواہ ہیں آپ اُن کے کہنے پر چلیں گی۔ تو ہر طرح اچھا ہوگا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ سارا

فریب ہی فریب ہے۔ عورتوں کے چلتر تو سُنے تھے مگر آج مرد کا چلتر ایسا دیکھا جو کبھی کہانیوں میں بھی نہ سُنا تھا۔ سبز باغ اسی کو کہتے ہیں جو میں نے دیکھا اور تو نے دکھایا۔ خدا جانے وہ کونسا منحوس پہرا تھا جس میں تو نے ہمارے گھر کے اندر قدم رکھا تھا۔ معنت خدا میں عزت گئی۔ آبرو گئی۔ گھر سے بے گھر ہوئی۔ ماں باپ چھوٹے۔ کنبہ چھوٹا۔ شہر چھوٹا۔"

مور کھا۔ "سچ پوچھتی ہو تو اس میں میرا رتی بھر قصور نہیں ہے۔ یہ سارے کانٹے آپ کے بادا جان کے بوئے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے بے سوچے سمجھے مجھے محلسرا میں گھسا لیا۔ حضرت کو یہ خیال نہ آیا۔ کہ لڑکا ہے تو ہونے دو۔ آخر ہے تو مرد ذات۔ مگر اونچے گھرانوں میں ہوتی ہی بے غیرتی ہے۔ ننگ وناموس کی پروا نہیں کرتے۔ ناظر خوجہ تو کھلے خزانہ محلوں میں آتے جاتے ہیں۔ رہتے سہتے ہیں اور جن مردوں سے پردہ کیا جاتا ہے اُن سے بھی نام کا پردہ ہوتا ہے۔ بیگم صاحب آب رواں کا دوپٹہ اوڑھے سر کھولے۔ بار بلیٹ کی محرم کُرتی پہنے بیچ انگنائی میں بیٹھی ہیں۔ موٹا مسٹنڈا جوان سقہ محل کی ڈیوڑھی میں آیا۔ اور اس نے آواز دی پانی لاتا ہوں۔ بیگم صاحب تنک کے اسے بی ذرا سقہ سے کہدو مُنہ پر اندھیری ڈالکر چلا آئے۔ سقہ مشک کندھے پر رکھے اندر آیا۔ اور اندھیری کی آڑ میں سے بیگم صاحب کی صورت شکل ڈیل ڈول پیٹ پیٹھ آگا پیچھا خاصی طرح سب کچھ دیکھتا چلا گیا۔ بیگم صاحب پنس میں سوار ہوئیں تو بارہ اور بارہ چوبیس کہاروں نے گھورا۔ رستہ میں پنس کے چاک سے مُنہ نکالا تو کئی دفعہ بازار والوں نے دیکھا۔ باغ میں جاکر اُتریں تو جو سوار بیگم صاحب کی اردلی میں گئے تھے انھوں نے دیکھا۔ میاں کے خدمتگار تو بیگم صاحب کے راز دار ہیں۔ محلسرا کی ڈیوڑھی پردوں میں آئیں شام کو آئیں۔

رات کے آٹھ نہیں بجے آئیں۔ آدھے بجے آئیں اُن کا روکنے والا کون۔ دربان اور پہرہ والے سب جانتے ہیں کہ حضور کے حکم سے آئے ہونگے۔ حکیم صاحب تو بیگم صاحب کے سچ مچ ایک ہیلے ہیں۔ چلمن کے پیچھے سے بیگم صاحب رتی رتی اپنا حال کہہ رہی ہیں۔ اور کوئی بات غیرت اور بے غیرتی کی ایسی نہیں ہے جو حکیم صاحب کے کان میں نہ پڑ دی جاتی ہو۔ پھر ماشاءاللہ حضور والا تو ایک۔ اور بیگمیں دو نہ چار۔ دس نہیں۔ سو دو سو کوئی پندرہ برس کی کوئی سولہ برس کی۔ کوئی بیس کی۔ کوئی پچیس کی۔ غذائیں وترات مزعفر بریانی اور باقرخانی جن کو کھا کر سو برس کی بڑھیا بھی بارہ برس کی بنجائے۔ اور اس کا دل للچائے۔ بس کوئی ایسی ہی چھتی چھنیا (ستی سیتا) ہوگی جو بچی رہتی ہوگی۔ نہیں دربان کہار سقہ خدمتگار غلام رنگریز باورچی رکابدار حکیم صاحب پیر جی اُستادجی بیگم صاحب نے اپنے لئے سب حلال کر لئے ہیں"۔

ماہ منیر: "ذرا منہ سنبھال کر بات کر کم بخت نمک حرام تیری وہی مثل ہے جس ہانڈی میں کھائے اُسی میں چھید کرے۔ بادشاہوں کے ہی ٹکڑوں سے بڑھا پلا اور انھیں میں تو کیڑے ڈالتا ہے۔ وہ شاہزادیاں بیگمیں اور ہوتی ہونگی ہیں تو اپنی ایڑی چوٹی پر سے سو دفعہ تجھے قربان کرتی ہوں۔ میں تو تجھ سے پاؤں بھی :۔ صلواتیں گی ہوئے ٹھلمٹے لو اور سُنو۔ اب تجھے یہ دن لگے۔ کہ ہماری طرف بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھنے لگی"۔

مور کھا: "آپ کو جس نے بُری نظر سے دیکھا ہو (یعنی بد رنے) یا جو آپ کو بُری نظر سے دیکھے خدا کرے اس کی دونوں چشم ہو جائیں۔ اور قیامت کے دن بھی قبر سے اندھا ہی اُٹھے"۔

ماہ منیر (جھلا کر) "تو پھر تو نے مجھے میرے گھر سے کیوں اُجاڑا۔ میری آبرو کیوں برباد کی؟"

مور کھا: "آبرو آپ کے دشمنوں کی برباد ہو۔ بیگم اللہ جانتا ہے میں نے فقط ہمدردی کی وجہ سے آپ کو اس مصیبت میں ڈالا ہے۔"

ماہ منیر: "اے لو تھا بھی تو ایسا ہی میرے کوسے چھوڑے کا۔ موا جھوٹا بے ایمان۔"

مور کھا: "خیر میں آپ کے نزدیک جھوٹا بے ایمان ہی سہی مگر اللہ اور اس کا حبیب خوب جانتا ہے کہ میں آپ کا دلی خیر خواہ اور نمک حلال غلام ہوں میں نے آپ کے سات کئی سلوک کئے ہیں جن کی آپ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔"

ماہ منیر۔ (طعن سے) "کیوں نہیں آپ ایسے ہی لائق ہیں۔ آپ نے میرے سات ضرور سلوک کئے ہونگے۔ مگر مجھ کمبخت پر آپ کا ایک سلوک بھی اب دم تک نہ کھلا۔ نہیں تو میں آپ کو بڑا بھاری انعام دیتی۔ فرمائے تو سہی آپ نے میرے سات کیا سلوک کئے ہیں۔"

مور کھا: "سُنئے جس دن سے میں آپ کی محلسرا میں آیا آپ کے ننگ وناموس کا محافظ بن گیا جب آپ کی لونڈیاں آپ کو پائیں باغ میں چھوڑ کر گد کڑے مارنے کو چلدیا کرتی تھیں اور خالی بارہ دری میں آپ اور بدر صاحب بیٹھا کرتے تھے تو میں ایسے موقع سے چھپ کر کھڑا ہوا کرتا کہ آپ کی حرکات وسکنات بخوبی دیکھتا رہوں۔ اور آپ کی باتیں بھی ذرا ذرا سُنا کروں۔"

ماہ منیر: "اچھا ذرا چُپ رہ۔ مور کھا تجھے اپنے پیدا کرنے والے کی قسم ہے جب تو نے مجھے اور بدر کو خالی بارہ دری میں بیٹھا ہوا سینکڑوں بار دیکھا ہے تو کیا کبھی تو نے میری کوئی بات یا ادا ایسی بھی دیکھی جس سے تو

بدگمان ہوا ہو؟

مور کھا :- حاشا ہرگز نہیں۔ اس بات کی تو میں آپ کی بڑی ہی تعریف کرتا ہوں کہ آپ بڑی باعصمت اور باحیا ہیں۔ آپ کو مینے خوب آزمایا اور ہر طرح سے پاک پایا۔ مگر بیگم آپ عورت ناقص العقل ناتجربہ کار ہیں۔ بدر کی نیت میں فساد تھا وہ آپ کو اکیلی بارہ دری میں اسی واسطے لیجا کر بٹھایا کرتا تھا۔ کہ آپ کو پرچا کر اپنے جال میں پھنسائے۔ دیکھیے النکاح من سُنّتی والی حدیث پر اس نے کیسی بے پیدا تقریر کی تھی۔ اور کس طرح وہ آپ کو نکاح کا شوق دلا رہا تھا پھر جس دن آپ نے اپنے منگیتر کے مرنیکا حال اس سے کہا ہے اور اُس کے سامنے آپ رُوئی دہوئی ہیں تو اس نے کیا دل آویز تقریر کی تھی۔ اور بیاہ شادی کی رغبت کس طرح آپ کی طبیعت میں پیدا کی تھی۔ اس کا منشاء یہی تھا کہ وہ آپ کے اس عصمت کو دہبا لگادے اور جو اس کا ارمان ہے وہ پورا ہو جائے۔ مگر سبحان اللہ آپ نے اُس کی چلنے نہ دی۔ اور اُسے مایوس کر دیا۔ مگر قلب پھر قلب ہے۔ ایک دم میں پلٹ جاتا ہے۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا کے معنی پر غور فرمائیے۔ اسی لحاظ سے مینے بادشاہ سلامت کو سوجھایا۔ کہ خدا رکھے چھوٹی بیگم اب سیانی ہوتی جاتی ہیں۔ بدر کے آگے آنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ چونکہ میں نے بات خیر خواہی کی نیک نیتی سے کہی تھی بادشاہ سلامت کے دل کو لگ گئی۔ اور بدر کے آنے جانے کی بندی کروادی۔ یہ خیر خواہی نہیں تو بدخواہی ہے۔ پھر ایک خبر مجھے یہ لگی کہ آپ کی شادی بادشاہ حبش سے کیجائے گی۔ اور آپ اس بات سے بیزار ہیں۔ میرا دل آپ کی اس مصیبت پر کڑھا اور جی نے گوارا نہ کیا کہ آپ کا ایک کالے کوئلے سے پلّہ بندھے اور آپ گھُل گھُل کر تمام ہو جائیں۔

ناچار آپ کی جان بچانے کے لئے میں نے یہ تدبیر کی کہ بدر کیطرف سے فرضی پیام سلام آپ کو پہنچانے شروع کئے اور آپ کے دل میں اس کی خیر خواہی کا سکہ بٹھا دیا۔ اور اس بہانہ سے آپ کو نکل چلنے پر آمادہ کر کے محلسرا سے نکال لایا۔ مگر میں خدا اور قرآن کو ضامن دیتا ہوں کہ میں کبھی آپ کے سات بدنیتی نہیں کروں گا اور آپ کا سچا خیرخواہ رہوں گا۔ جو آپ حکم دیں گی بجا لاؤں گا۔ جہاں آپ فرمائیں گی میں آپ کو پہنچا دوں گا۔ اگر آپ شادی کرنی چاہیں گی۔ تو ایک شاہزادے سے جو میرا دوست ہے آپ کی شادی کرواونگا۔ اور آپ شادی کرنی نچاہنگی تو میں کبھی آپ کے سامنے اس کا ذکر بھی نہ کرونگا۔"

ماہ منیر نے سورکھا کی تقریر کو بڑے غور سے سُنا۔ اور وہ سناٹے میں چلی گئی اور اپنے دل میں کہنے لگی سورکھا سچ کہتا ہے۔ اور بڑا عاقل آدمی ہے کمبخت بدر کی نیت میں فساد تھا۔ مگر میں دیوانی تو اس بھید کو کبھی نہ سمجھی۔ بیشک وہ شادی بیاہ کا ذکر اسی وجہ سے کیا کرتا تھا۔ ہائے اگر وہ اسوقت میرے سامنے آجائے تو مُردے کی بوٹیاں چبا لوں۔ میں تو اس کے کنایہ اشارہ کو سمجھی ہی نہیں۔ نہیں غارتی کے پیٹ میں چھری بھونک دیتی۔ سورکھا نے اپنی خیر خواہی اور نمک حلالی جتانے میں زور تو ایڑی سے لیکر چوٹی کا لگا دیا اور اس کا اثر بھی ماہ منیر کے دل پر کچھ ہوا بھی مگر اس کو غصہ کا جوش پھر یکایک آگیا۔

ماہ منیر۔ "افسوس صد افسوس سورکھا نامراد تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا میری وہی مثل ہوئی دھوبی کا کُتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ نہ گھر پلٹ کر جا سکتی ہوں نہ اس ویران جنگل میں ٹھہر سکتی ہوں۔ ہائے لوگ کہیں گے خوارزم شاہ کی بیٹی کو غلام لیکر بھاگ گیا۔ الٰہی زمین پھٹ جائے اور میں سما جاؤں۔ اس جینے سے مرنا بہتر ہے۔"

سید ناصر نذیر فراق دہلوی

سنسکرت اور ہندی میں حقیقی شاعری

(ایک نہایت دلچسپ اور سبق آموز مضمون)

میرا ایک مضمون جو مخزن جنوری نمبر میں "سنسکرت میں نیچرل شاعری" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔اس کی غرض یہ تھی کہ جیسی اصلی نیچرل شاعری سنسکرت اور اس کی دختر ہندی میں پائی جاتی ہے۔ اس کا وجود نہ تو فارسی میں ہے اور نہ اُردو میں۔ آج کے مضمون میں یہ دکھایا جائے گا۔کہ جیسی معاملہ بندی جسے "حقیقی شاعری" کہتے ہیں سنسکرت اور ہندی میں پائی جاتی ہے۔اس کا نشان فارسی یا اُردو میں برائے نام ہے۔جو کچھ خیالات پہلے مضمون میں ظاہر کئے گئے تھے یا آج کے مضمون میں ظاہر کئے جائیں گے اُن کا مقصد فارسی یا اُردو شاعری کی مذمت ہرگز نہیں۔ بلکہ امور واحوال واقعی کی گذارش ہے۔

اُردو شاعری میں دو خاص نقص ہیں ایک یہ کہ اس میں "مقامی رنگ" بالکل نہیں۔یعنی یہ کہ اس میں اہل ہند کے جذبات وخیالات اور کوائف وخصوصیات کا ذکر محض برائے نام آیا ہے۔البتہ "بیرونی رنگ" میں وہ سرتاپا رنگی ہوئی ہے۔ اُردو لٹریچر ایک سے دوسرے سرے تک گل وبلبل۔ ریحان وسنبل۔ نرگس وطوبےٰ۔ فلک وچرخ کی گردشوں اور کج ادائیوں۔غزال ومشک ختن وغیرہ جیسے مضامین اور شیریں وفرہاد۔لیلیٰ ومجنوں وغیرہ جیسی داستانوں سے پٹا پڑا ہے اور یہ باتیں ایران وعرب۔ترکستان وغیرہ کی خصوصیات ہیں۔نہ کہ ہندوستان کی۔ہندوستان کی خصوصیات تو کوئل کی کوک۔ پپیہے کی ہوک۔بھونرے کی ہچکاری۔ہاتھی کی مستانہ چال۔ چیتے کی نازک وپتلی کمر۔چکوی چکوہ کی

جدائی۔ ہرن کی آنکھیں۔ کنول اور کیتکی کے پھول ہیں۔ ہندوستان کی داستان نل دومن۔ رام وسیتا۔ دروپدی کی ناز آفرینی۔ شکنتلا اور دوشینت وغیرہ کے حالات ہیں۔

اُردو شاعری میں مقامی رنگ نہ ہونے کی بڑی اور خاص وجہ سوائے اس کے اور کیا ہوسکتی ہے۔ کہ اُردو زبان اور اُردو شاعری کا ظہور اور ترقی اس زمانہ کے آثار ہیں۔ جبکہ ہندوستان میں فارسی لٹریچر کا اور ایرانی مغلانی و اسلامی تمدن کا دور دورہ تھا۔ اسی لئے اُردو زبان اور اُردو شاعری پر بھی اُن کا رنگ چڑھ گیا۔ اس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ اُردو شاعری کا دائرہ محدود ہو گیا۔

اُردو شاعری میں دوسرا نقص یہ ہے کہ اس میں معاملہ بندی نہیں۔ بلکہ اس کے لباس میں تصنع ہی تصنع پایا جاتا ہے۔ گو کبھی کبھی کسی شاعر کی طبع رسا اقلیم معاملہ بندی میں بھی قدم مار گئی ہے۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔ اس لئے اُردو کی شاعری بلا شبہ "مصنوعی شاعری" ہے نہ کہ "حقیقی شاعری" اس کی وجہ بھی وہی ہے جو پہلے نقص کی تہ میں کام کر رہی ہے۔ برعکس اس کے سنسکرت اور ہندی میں مقامی رنگ بھی ہے۔ اور حقیقی شاعری بھی۔ جس کے چند نمونے نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے سنسکرت کے نمونے ترجموں کی صورت میں ہیں۔ اس لئے کہ ناظرین مخزن میں سے دس پانچ اصحاب ہی سنسکرت سمجھتے ہونگے۔ یہ نمونے میں نے فاضل پنڈت کی مدد سے حاصل کئے ہیں

سنسکرت کا مشہور شاعر کالیداس اپنے ڈراما (ناٹک) شکنتلا میں شکنتلا کے عاشق دشنیت کی زبان سے شکنتلا کے حسن کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے کہ "درحقیقت اس کے لب شیریں میں نوخیز کونپل کی سی سُرخی پائی جاتی ہے۔ اس کے بازو دو نرم لچکدار ٹہنیوں کی سی لطافت کیساتھ اس کے عضو

عضو سے ٹپک رہا ہے۔ معلوم نہیں کہ خالق عالم نے اس کے بنانے سے پیشتر ہی پردہ عالم کی تمام رعنائیوں کو یکجا جمع کر کے اس کے حُسن کامل کا نقشہ کھینچ لیا تھا یا صرف اپنے دماغ ہی میں اس کے حُسن کامل کا تصوّر قائم کیا تھا اور اسی تصوّر کے سانچے میں اسے ڈھال دیا۔"

آہا ہا۔ کیسی سچی اور قدرتی تعریف ہے۔ جسے قلمبند کرتے وقت یہ شعر میری طبع نے بے اختیار اُگل دیا

حیرت فزا تجلّی تھی حسنِ دلربا کی　　اب کیا کہیں کہ کیا تھا؟ اک شان تھی خدا کی

کالیداس نے ایک اور ناٹک میں "وکرم اروسی" کے حسن کا خاکہ یوں کھینچا ہے کہ (۱) "اس کا جسم زیوروں کا زیور اور سنگھاروں کا سنگھار ہے۔" کیا خوب! پھر کالیداس نے اپنی مثنوی کمار سنبھو میں پاربتی دیوی کی رفتار نگاہ اور ابرو کی تعریف اس طرح بیان کی ہے کہ "دم رفتار پاؤں کے اُٹھے ہوئے انگوٹھے اور انگلیوں کے ناخنوں سے سرخی ٹپکی پڑتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گل لالہ زمین پر چل رہے ہیں۔"

(۲) "اس کی متلون نظر بیقراری میں اس نیلگوں کنول کے جھونکوں سے کم نہ تھی جو تیز ہوا کے تھپیڑے کھا رہا ہے۔ نگاہ کی یہ بیقراری اس بڑی بڑی آنکھوں والی نازنین کو ہرنی سے ملی ہے یا خود ہرنی نے اس سے اُڑا لی ہے۔"

(۳) "اس کے لمبے اور کشیدہ ابروؤں کی دھن کا جو قلم اور سیاہی سے کھینچا ہوا معلوم ہوتا ہے) دلربائی اور لچک اور لپک دیکھ کر کام دیو (محبت کا دیوتا) کے سر سے اپنی انوکھی کمان کے حسن کا سودا ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔"

یہ ایسی حقیقی شاعری ہے جس پر شک کفر کی حد تک پہنچتا ہے۔

کالیداس کو چھوڑو اب ذرا دوسرے مشہور سنسکرت شاعر بھاوبھوتی کے شاعرانہ خیالات کی جولانی بھی دیکھئے ۔ وہ مالتی کے حُسن کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ "سمندر سے ایک حسین مہ جبین نکلی جس کی پر تمکنت چال سے عشق سے مغلوب دنیا میں فتحمندی کے ساتھ لہرانے کی شان نمودار تھی ۔ اس کا لباس شباب کے موزوں زیوروں سے آراستہ تھا ۔ اس کا جسم حُسن کا معبد تھا یا وہ خود اس پر نور معبد کی دیوی تھی بمشکل نظریں دوچار ہوئی تھیں کہ مجھے ایک نئی قسم کی لذت محسوس ہوئی ۔ گویا کسی نے مجھے آب حیات سے نہلا دیا اور ایک مقناطیسی قوت سے میرا دل اپنی طرف کھینچ لیا ۔ گو اُس وقت اس دل کا بے اختیار آپے سے باہر ہو جانا سمجھ میں نہ آیا ۔ مگر اب اس کا حال یہ ہے کہ چاہے کچھ ہی افتاد پیش آئے مگر یہ دل ہمیشہ اسی سے لگا رہے گا ۔ خواہ اس کے صلہ میں مجھے دائمی رنج و مایوسی ہی کیوں نہ نصیب ہوں"

اب ذرا سنسکرت کے سب سے پہلے ناٹک کی شاعری کے مزے لو جس کا نام "مرچھ کٹیکا" ہے اور جو اوجین کے راجہ سدرک کے علو خیالات کا شگوفہ قرار دیا جاتا ہے ۔ اس ناٹک کے قصہ کا ہیرو چارودت نامی برہمن تھا ۔ جو نیک نفس اور معزز خاندان سے تھا ۔ مگر اپنی بے نظیر سخاوتوں کی بدولت مفلس ہو گیا تھا ۔ ہیروئن ایک شائستہ بازاری تھی ۔ جو حسن و جمال کی دیوی کہلاتی تھی ۔ اور جس کا پیمانہ دل اپنے فرقہ کے اخلاق و آئین کے خلاف محبت اور وفا سے لبریز تھا ۔ یہ عورت وسنت سینا نامی چارودت پر فریفتہ تھی ۔ اس قصہ میں عورت کے ایک اتالیق کا بھی ذکر آتا ہے ۔ جو فن موسیقی میں اعلیٰ کمال رکھتا تھا مرچھ کٹیکا کے ایک سین کی کیفیت یہ ہے کہ ایک دن موسم برسات

کے آغاز میں وسنت سینا مع آتالیق کے چارودت کے گھر جاری تھی کہ بادل اُٹھے اور گرجنے لگے۔ بجلی کڑکی اور موسلا دھار مینہ برسنے کے آثار پیدا ہو گئے۔ اسوقت آتالیق۔ وسنت سینا اور چارودت کے دلوں میں بادل۔ گرج اور بارش کے متعلق مختلف قسم کے خیالات موجزن ہوئے۔ آتالیق ان بادلوں وغیرہ کا سماں اوپری نگاہ سے دیکھتا ہے وسنت سینا جو اشتیاق وصال سے کشاں کشاں اپنے محبوب کے گھر پہنچنے کے لئے بیتابی سے قدم بڑھا رہی ہے اس کو عاشق مہجور کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور چارودت اسے ایک کامیاب اور شادماں عاشق کی نظر سے دیکھتا ہے

آتالیق (وسنت سنیا سے) "لو بی بی۔ ذرا سامنے کو دیکھو۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پر کسی پیا سے دُکھیارے بچھڑے کے دل کی طرح کالی کالی گھٹائیں اُمنڈ رہی ہیں۔ جن کی گرج نے مور اور مورنیوں کو چونکا دیا ہے۔ ان کے پھڑپھڑا کر اُڑنے سے آسمان کے نیچے ایک تلاطم برپا ہو گیا ہے۔ گویا رنگ برنگ کے ہزاروں مرصع جواہرات سے جڑے ہوئے پنکھے جھلے جا رہے ہیں۔ مینڈک بارش کے صاف و شفاف بلوری قطروں کو مزے لے لے کر چوس رہے ہیں۔ مورنیاں جوش مسرت سے پیہو پیہو کر رہی ہیں۔ کوئلیں کوک رہی ہیں۔ پپیئے پیا پیا کر رہے ہیں۔ نیم کی کلیاں چٹک رہی ہیں۔ رواں دواں اندھیرے نے چاند کو اس طرح چھپا لیا ہے۔ جیسے کہ ریاکار اپنی داغدار اور شرمناک زندگی کو ظاہری تقدس کے جامہ میں چھپا لیتا ہے بجلی کسی حسن فروش مہ جبین کی مانند نیکنامی تلوّن اور ہرجائی پن کے نذر ہو چکی ہے کسی جگہ بھی ایک دم کے لئے نہیں ٹھہرتی۔ بلکہ طراری اور بیقراری کے

ساتھ آسمان پر چاروں طرف تڑپتی پھرتی ہے"

وسنت سینا " واہ اتالیق کیا کہنے۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رات جو اندھیرے کیساتھ مزے اڑانے میں مصروف ہے۔ مجھے اپنی سوتن سمجھکر دور ہی سے روک رہی ہے۔ اور جھلا جھلا کر اشارے کر رہی ہے کہ اُلٹے پاؤں لوٹ جاؤں۔ ایسا نہ ہو کہ میں آگے بڑھکر کہیں اس کے عیش میں مخل ہوں"

اتالیق " دیکھو۔ آسمان کبھی بجلی سے دمکنے اور جگمگانے لگتا ہے۔ کبھی سفید بگلوں کی قطاروں کے دانت نکالکر ہنسنے لگتا ہے۔ کبھی اندر (پانی کا دیوتا) کی سویتر والی کمان (قوس قزح) سے روشن تو کبھی اس کے دمکتے ہوئے بالوں کی زد (بجلی) سے کڑکنے لگتا ہے۔ کبھی طوفانی ہوا کے تیز جھونکوں سے گھبرا کر ہوا سے لڑنے لگتا ہے کبھی سمٹتے اور پھیلتے ہوئے بادلوں سے جو کالے ناگوں کی طرح لہراتے بل کھاتے سرّاٹے لیتے جا رہے ہیں۔ ہاتھا پائی کرنے لگتا ہے"

وسنت سینا (غصہ اور مایوسی سے) "اے بادل تیرا برا ہو۔ تو کڑک کڑک کر مجھے کیوں دھمکیاں دے رہا اور ڈرا رہا ہے۔ تو اپنے آبی تیروں سے میرا سینہ کیوں چھلنی کر رہا ہے۔ حالانکہ میں تیرا کچھ بھی نہیں بگاڑ رہی ہوں میں تو صرف اپنے معشوق کے پاس جا رہی ہوں۔ اے اندر تمہ سے تجھے سچ بتا کہ میں نے کب تجھسے بدعہدی کی تھی۔ جو تو اس طرح گرج گرج کر مجھے ملامت آمیز طعنے دے رہا ہے۔ تجھے تو میری راہ میں حائل ہونا زیب نہیں دیتا۔ اگر تیرا بھی دل کبھی لذت الفت سے آشنا ہوتا۔ اور کبھی تو عاشق کے درد کو پاتا تو میرے جذبات دل پر ترس کے آنسو بہاتا۔ اور اپنے بادل میری راہ

سے ہٹا لیتا۔ خیر اگر تیری یہی مرضی ہے تو شور مچائے جا۔ موسلا دھار مینہ برسائے جا۔ اپنا سو بان والا گرز چلائے جا۔ بجلی تڑپا تڑپا کر مجھے ڈرائے جا لیکن میں انکو کب خاطر میں لاتی ہوں۔ سمجھ۔ تو کبھی اس وفادار مہ جبین (اپنی طرف اشارہ ہے) کا دامن نہیں پکڑ سکتا۔ جو اپنے محبوب کے آغوش محبت میں خوف، مایوسی رنج اور صدمہ ہجر سے نجات پانیکے لئے اپنی دھن میں چلی جا رہی ہے۔ اگر تو گرج رہا ہے تو بلا سے۔ گرجا کر۔ کیونکہ تیری ظالمانہ فطرت کا یہی تقاضا ہے۔"

اتنے میں وسنت سنیا بڑھتی ہوئی اپنے محبوب چارووت کے مکان پر جا پہنچی۔ چونکہ بارش بھی بند ہوگئی تھی۔ اور چاندنی نکل آئی تھی۔ دونوں عاشق و معشوق باغ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر لطف صحبت اُٹھانے میں محو ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر بوندا باندی شروع ہوئی۔ تو دونوں کو باغ سے اٹھنا پڑا۔

چارووت :۔ اب آسمان کی آنکھوں سے جو چاند کے ہجر میں بیقرار ہیں۔ پھر غم کے آنسو ٹپکنے لگے۔ بادل بلدیو (بلرام کا نام جو سری کرشن کے بھائی تھے اور بڑے بہادر) کی مانند سیاہ لباس پہنکر اندر کے خزانہ آب سے موتیوں کی لڑیاں برسا رہا ہے۔ اور مینہ کی بوندیں کسی آتشیں مزاج سورما کے ترکش کے سے تیر برسا رہی ہیں۔ سیاہ بادل جو ایک دیو کی مانند ہے بجلی سے جو گوری نورانی پری کی مانند ہے اور جو اپنے محبوب کی طرف بڑھی جا رہی ہے کیسی گرمجوشی سے بغلگیر ہو رہا ہے۔"

اتنے میں بجلی زور سے کڑکی اور وسنت سنیا خوف کے مارے چارووت کے سینہ سے چپٹ گئی۔ اس پر آتالیق بادل سے یوں مخاطب ہوا کہ او کالے منہ والے خبیث تو بھی بڑا ہی بدمعاش ہے کہ میری آقا کو بجلیاں کو نداکو ندا کر

ڈرا رہا ہے۔ کیا تجھے رحم نہیں آتا۔

چارو وت:۔ اب سخن طرازی کا کوئی موقع نہیں۔ اسے جانے دو۔ پانی برستا ہے تو برسے۔ کیونکہ اب آسمان مُنہ چڑھانے ہوئے ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر ہمت سینکڑوں شعلے مشتعل کر رہی ہے۔ بادلوں نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ مجھے میرے من موہن سے ملا دیا۔ جس کے فراق میں یہ دل بیقرار تھا۔ وہ لوگ خوش نصیب سے بھی کچھ زیادہ ہیں۔ جن کے عشرت کدے اس بُت شیریں کلام اور مجسم نور سے منور ہوں۔ جس کی پوجا اُن کا ایمان ہے۔ اور جان ہے۔ دیکھ پیاری۔ آسمان پر اندر کی کمان ان ہاتھوں کی طرح تنی ہوئی ہے۔ جو پھیلتے پھیلتے تھک گئے ہوں۔ وہ محراب بنا رہی ہے۔ آسمان انگڑائیاں لے لے کر اپنی بجلی کی زبان نکال رہا ہے۔ اور ابر کی ٹھوڑی لٹکا رہا ہے۔ مینہ کی بوندیں سُریلی تانیں گا رہی ہیں۔ اور یہ سب باتیں ہمیں زبان حال سے آرام کرنے کا اشارہ کر رہی ہیں۔ آؤ چلو سو رہیں۔"

یہ تو رہی سنسکرت کی شاعری کی مقامی رنگت اور حقیقت۔ اب آپ کو ہندی کی شاعری کی کچھ داستان سناتا ہوں۔ سوامی تلسی داس جن کی "تلسی کرت راماین" بہت مشہور ہے۔ ان کے دو دوہے یہ ہیں:۔

رام بنا دہرگ جیون جگ میں

کو چلے پھرے ہِت مگ میں

بنا = بغیر۔ دہرگ = عبث یا بیکار۔ جیون = زندگی یا جینا۔ جگ = دنیا۔ کو = کون۔ چلے پھرے = چلے پھرے گا یا آئے جائے گا۔ ہِت = محبت۔ مگ = راستہ۔

مطلب۔ یہ شعر سیتا کی طرف سے ہے۔ جو یہ کہتی ہے کہ پیارے رام

کے بغیر اس دنیا میں جینا بیکار ہے۔ کیونکہ محبت کے اس راستہ سے کون میرے پاس آئے جائے گا جسے طے کر کے رامچندر آیا کرتے تھے۔

اوورن مار کٹارن مرہیوں
بچھڑن بھو تاپ نا جرہیوں

اوورن = آنتیں۔ مراد پیٹ سے ہے۔ مار = مار کر۔ کٹارن = کٹاری۔ مرہیوں = مرجاؤں گی۔ بچھڑن بھو = جدائی۔ تاپ = آگ۔ نا = نہیں۔ جرہیوں = جلوں گی

مطلب ۔ سیتا جی کہتی ہیں کہ میں رام کی جدائی میں اپنے پیٹ میں کٹاری بھونک مرجاؤں گی۔ مگر جدائی کی آگ میں جلنا مجھے گوارا نہیں۔

ایک ہندی شاعر کا شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ہریل چولی پیری کچ السانی تیئے بھور
مانو چند گھن سوں چھٹو نکست آوت کور

ہریل (ہری) چولی (محرم) پیری (زرد) کچ (پستان۔ سینہ) السانی (گویا) تیئے (کہ ہوگئی) بھور (صبح) مانو (ایسا معلوم ہوتا ہے) چند (چاند) گھن (گہن) چھٹو (چھٹ گیا) نکست (نکلنی) آوت (آتی ہے) کور (کنارہ

مطلب ۔ ایک سیمیں بدن عورت ہرے رنگ کی محرم پہنے ہوئے ہے اس کے سنہری رنگ کے سینہ کا ایک حصہ محرم کے باہر نکلا ہوا ہے۔ شاعر کی پرواز خیال تو دیکھو کہ چولی کو کالی رات قرار دیتا ہے اور نکلے ہوئے کنارے کو صبح کے نمودار ہونے کی روشنی سے تشبیہ دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ رات گئی اور صبح ہونے لگی ہے۔ پھر محرم کو گرہن اور سینہ کو چاند قرار دیکر کہتا ہے۔ کہ گرہن ہٹ گیا چاند اس سے چھٹ گیا اور اب اس کا کنارہ باہر نکلتا آتا ہے۔

ایک اور ہندی شاعر کیسی سچی اور امٹ صداقت کا اظہار کرتا ہے

منتا جا کو لگ گیو سوامی سوں ست سنگ
سب جگ سوں نیارو رہیو پر جگ وا کے سنگ

منتا (دوست)، جا کو (جس کا) لگ گیو (لگ گیا) سوامی (خدا) سوں (سے یا ساتھ) ست سنگ (دوستی یا تعلق، نیارو (الگ) رہیو (رہا) وا کے (اس کے) سنگ (ہمراہ یا ساتھ)

مطلب۔ اے دوست جس انسان کی محبت اس ذات باری سے ہو جاتی ہے۔ گو وہ تمام دنیا سے علیحدہ ہو جاتا ہے تاہم دنیا اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ یعنی وہ خاص خاص ہی سے ہو جاتا ہے۔ اس لئے دنیا اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

سورداس جی جو نابینا تھے مگر بڑے خدا پرست مشہور ہے کہ اُن سے ایک دفعہ کسی ظریف نے سوال کیا کہ جناب آپ کی آنکھیں تو ہیں ہی نہیں پھر آپ جلوۂ نور الٰہی کس سے دیکھیں گے۔ آپ نے یہ دوہا پڑھ کر اسے لاجواب کر دیا کہ

آنکھ ناک مکھ مُوند کے نام نرنجن لے
بھیتر کو پٹ تب کھلے باہر کو پٹ دے

مکھ (منہ) موند کے (بند کر کے)، نرنجن (خدا) بھیتر (اندر یا دل)، پٹ (دروازہ) کو (کا) دے (بند کرے)

مطلب۔ اے نادان آنکھ ناک منہ یہ جو جسم انسانی کے دروازوں کی مانند ہیں۔ جب تو اُن کو بند کر لے گا۔ تو اندر کا دروازہ کھل جائے گا یعنی قلب روشن ہو جائے گا اور اس میں نور الٰہی کا جلوہ نظر آنے لگا۔ ادہوہو

کیا ہی سچی بات ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ اگر اردو زبان کے پہلے دور میں ہی سنسکرت اور ہندی لٹریچر کی اصلی کتابوں کے ترجمے ہو جاتے۔ تو آج اردو شاعری میں وہ نقائص نہ ہوتے جو اس کے دامن پر بدنما دھبوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ بلکہ اس میں مقامی رنگ اور حقیقی شاعری بھی ایک بڑی حد تک داخل ہو جاتی۔ اور آج اردو شاعری کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا اور اس کا پایہ بہت ہی بلند ہوتا لیکن اب بھی وقت ہے کہ ہم سنسکرت اور ہندی زبان سے اسی طرح مستفید ہوں۔ جیسے کہ انگریزی علم ادب سے ہو رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہم جس ذریعہ سے بھی اردو علم ادب کو مالا مال کر سکتے ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی یا پہلو تہی نہ کریں ؎

منور خاں ساغر اکبرآبادی (علیگ) جرنلسٹ

رباعیات بلیغ

بیمثل ہے احمد کا خد و خط و خال — بیمثل نے بے مثل بنائی تمثال
حسن تمثال پر ہے شیدا بیچوں — اللہ رے بیچوں فی انوار جمال

کب تک غافل یہ لن ترانی کب تک — مدہوش شراب ارغوانی کب تک
کر دے گا ہرن نشہ خمار پیری — مست مئے پندار جوانی کب تک

اچھلے کودے شباب میں ڈنڈ پیلے — دنیا میں تھے جتنے کھیل وہ سب کھیلے
آٹا پتلا ہوا کہولت میں آہ — آئی پیری تو خوب پاپڑ بیلے

ہو عشق کی دولت ہی تو کچھ مال ہی مال — جو عشق کے بندے ہیں وہی ہیں خوشحال
میں اس لب جاں بخش پہ مرتا ہوں بلیغ — زاہد کی بھی جس پہ کہ ٹپکتی ہے رال

وزیر اور فقیر

گلشن کے سب پھول کسی محبوب کے ہار یا گجرہ میں نہیں آجاتے ہیں سمندر کے سارے موتی کسی بیگم یا شاہزادی کی ایک مالا یا جھومر میں نہیں سماتے ہیں اسی طرح کسی عہد کے سارے واقعات بھی بجہ سے سُکہ پورے کے پورے تاریخوں میں مذکور نہیں ہوتے ہیں۔ حدیث نبوی جو مسلمانوں کا دین و ایمان ہے باوجود اس چھان بین چھان پھٹک کے صحاح ستہ کے دائرہ میں محدود نہ ہوئی اور ہمیں ابتک ہزاروں حدیثیں اور اور طرق سے پہنچتی رہتی ہیں۔ سلاطین ہندوستان کے حکم سے شاہنامہ روزنامچہ توزک وقائع لکھے گئے۔ مورخوں نے اپنے شوق سے بھی متعدد تاریخیں لکھیں۔ مگر مشائخ رحمتہ اللہ علیہم کے ملفوظات مکتوبات ہم پڑھتے ہیں تو انھیں سلاطین کے متعلق نئے سے نئے حالات ہمیں ایسے ملتے ہیں جن کا تذکرہ مشہور و معروف مورخ وقائع نگاروں نے اپنی تصنیف و تالیف میں بھولے سے بھی نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ہزاروں واقعات سینہ بسینہ چلے آتے ہیں جن کو اس عہد کے مورخوں نے مصلحتاً نہیں لکھا یا وہ ان تک پہنچے ہی نہیں۔ چنانچہ تمثیلاً میں ایک مضمون نواب سعد اللہ خاں جملۃ الملک وزیر اعظم ہندوستان کے متعلق حوالۂ قلم کرتا ہوں جو مینے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا۔ مگر اپنے کئی بزرگوں اور کئی استادوں سے متواتر سنا ہے۔

اگر بعض حضرات اس کو مستند نہ سمجھیں تو خیر ؎

دستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مری گفتار میں معنی نہ سہی

دوسرا مضمون اس باقبال وزیر کے متعلق ایک ولی کامل کے ملفوظ سے منتخب کر کے لکھوں گا۔ اور کتاب اور کتاب کے مصنف کا پورا پورا پتہ بھی لکھوں گا اور یہ سمجھاؤں گا کہ ہم لوگوں نے سلوک اور تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کم کر دیا ہے۔ ورنہ ان میں رنگا رنگ مضمون ایسے دلچسپ بھرے پڑے ہیں جن کے سامنے لعل بدخشاں اور گوہر درخشاں بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے ہیں بقول غالب

شراب ناب ہے ہر رنگ کی اپنی پیالہ میں
دھڑہ کونسا گل میں ہے کیا ہے شاخ لالہ میں

نواب سعد اللہ خاں اور حضرت شاہ محب اللہ بہاری

گیارویں صدی ہجری میں لاہور فردوس بریں سے کم فرحت افزا نہ تھا جہانگیر کے دربار اور بی نور جہان بیگم کے بناؤ سنگھار لاہور کے اسی قلعہ میں بہاریں دکھایا کرتے تھے۔ دریائے راوی شاہی ایوان کی قدمبوسی کرتا رہتا تھا۔ اور بید مشک کی خوشبو ثمن برج کے کلس تک اڑ اڑ کر پہنچا کرتی تھی علم و ہنر کا چرچا بھی یہاں بخارا اور بغداد دلی اور اکبر آباد کی مثل رہتا تھا۔ لاہور کا مدرسہ مشہور تھا۔ دور دور سے شایق تحصیل علم دوڑے آتے تھے۔ اسی درسگاہ میں نواب سعد اللہ خاں اور حضرت شاہ محب اللہ بہاری رحمۃ اللہ علیہما ساتھ ساتھ علم و فن کا سبق لیتے تھے۔ عمریں تو دونوں کی ۱۲-۱۲-۱۳-۱۳ برس سے زیادہ کی نہ تھیں مگر ذہن اور جودت اپنی ماں کے پیٹ سے لیکر دنیا میں اترے تھے۔ دونوں صاحبوں میں بڑا پیار اخلاص تھا۔ ایک دل ایک زبان۔ دو قالب ایک جان۔ ایک حجرہ میں رہنا سہنا ایک جا کھانا پینا۔

جب مدرس اور استاد وریں دیگر اپنے اپنے گھر سدھارتے تو نواب

سعداللہ خاں اور شاہ محب اللہ صاحب کی چڑھ بنتی۔ خان صاحب بڑی ساری پگڑی سر پر دہرتے جھوٹ موٹ کا جامہ پہنتے۔ مکرانہ ھتے۔ مدرسے کے صدر دالان میں آکر بیٹھتے۔ قلمدان اپنے سامنے دہرتے اور طالب علموں سے فرماتے میں بادشاہ ہندوستان کا وزیر ہوں۔ مجھے نذریں دکھاؤ۔ میرے حضور میں عرضیاں اور درخواستیں گذرانو۔ ان کا اجلاس ختم ہوجاتا تو شاہ صاحب گدڑی پہنکر تشریف لاتے مصلے پر بیٹھتے اور ارشاد کرتے میں شیخ المشایخ ہوں۔ میں قطب الاقطاب ہوں جس کسی کو خدا سے ملنا ہو وہ میرے ہات پر بیعت کرے۔ وحدت وجود اور وحدت شہود کا راز مجھپر کھل گیا ہے۔ شاہ صاحب کبھی خانصاحب کو وزیر کے بھیس میں دیکھتے تو فرماتے کیوں بھئی سعداللہ تو سچ مچ وزیر ہوجائے تو ہم غریبوں کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ خانصاحب جواب دیتے بھائی صاحب میں وزیر بنونگا تو تم کو بھی وزیر بناکر چھوڑونگا۔

بظاہر تو یہ لڑکپن کے کھیل تھے۔ مگر غور سے دیکھا جانے۔ تو ان کھیلوں سے طبیعت کا میلان معلوم ہوتا ہے۔ آخر کار دونوں صاحب فارغ التحصیل ہوگئے۔ فضیلت کی پگڑی بندھ گئی۔ سند ملگئی۔ اور شاہ محب اللہ صاحب نے بہار کی اور خانصاحب نے اپنے وطن چن یوٹ کی تیاری کی۔ رخصت کے وقت سعداللہ خاں صاحب کا جی بھر آیا۔ اور شاہ صاحب کے گلے میں باہنیں ڈالکر اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ اتنے کیوں بیتاب ہوتے ہو۔ خدا کو منظور ہے تو پھر ملاقات ہوگی۔ خانصاحب نے کہا آپ پورب کے رہنے والے میں پچھم کا باشندہ کالے کوسوں کا فاصلہ کیونکر ملنا نصیب ہوگا۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ فرق ہے

تماشائے دو عالم کسی نہ از دیدہ دلہا ۔۔۔ بکار عاشقاں حایل نباشد بعد منزلہا

شاہ صاحب اپنے گھر پہنچ گئے۔ اور خانصاحب چنیوٹ۔ مگر چنیوٹ جیسی چھوٹی بستی میں ایسے ہونہار فاضل کا جی کب بہلنے لگا تھا۔ جوں توں کر کے کچھ دن پڑے رہے اور جب نہ رہا گیا۔ تو نکل کھڑے ہوئے اور دلی کی سیدھا ہی۔ اتنے غریب اور بے سروسامان تھے کہ کرایہ کی گاڑی بھی نہ جڑی۔ گزی گاڑھے کے دو جوڑے کپڑوں کی بقچی بغل میں دبا پیدل چلدئے۔ جھنگ کا ریگستان اور ریگستان کے بگولے اور جلتی بلتی لوئیں گرمی کے موسم میں میدان محشر کو یاد دلا دیتی ہیں مگر اس عالی ہمت نے کسی کو نہ گردانا۔ دلی میں منزل رکھی جو انھوں نے دیکھا سڑک پر ایک رتھ چلی آتی ہے۔ جو بہت ہی خوشنما اور دل پسند ہے۔ کاریگر نے بڑی محنت سے بنائی ہوگی اور بنوانے والے نے دل کھولکر روپیہ لگایا ہوگا۔ لوہے کی جگہ چاندی اور پیتل کی جگہ سونے کے پرزے سوت کی رسیوں کے بدلے ریشم لگایا تھا۔ خیر رتھ تو بہت اچھی تھی ہی مگر رتھ کے بیل انتخاب کیا نایاب تھے۔ آسمان کا برج ثور اگر ان کے ایک کھر پر سے قربان کر دیا جاتا تو زیبا تھا۔ جس گاؤں یا قصبہ یا شہر سے یہ رتھ گذرتی تھی اس کے دیکھنے کے لیے مخلوق امنڈ آتی تھی۔ راہ چلتے مسافر دیکھتے اور کہتے سبحان اللہ ماشاءاللہ رتھ کے اندر ایک خوشرو نوجوان سوار تھا جس کے چہرہ سے ایک قسم کی دانائی اور ہوشیاری برستی تھی۔ سلام مسلمانوں کا ایک مذہبی شعار ہے اس لئے جب رتھ پاس آئی تو سعد اللہ خاں صاحب نے رتھ والے نوجوان کو سلام کرنا چاہا۔ مگر وہ شریف زادہ کچھ ایسا بھلا مانس اور بے نفس شخص تھا اس نے ان سے پہلے سلام کیا۔ مزاج پرسی ہوئی اور چلتے چلتے بات چیت ہونے لگی۔

نوجوان (سعد اللہ خانصاحب سے) "آپ کا وطن کہاں ہے اور اسم مبارک کیا ہے؟"

سعد اللہ خانصاحب "میں چنیوٹ ضلع جھنگ کا رہنے والا ہوں۔

میرا نام سعد اللہ ہے"

نوجوان " کہاں کا ارادہ ہے"؟

سعد اللہ خانصاحب " دِلّی کا"

نوجوان " کس غرض سے"؟

سعد اللہ خانصاحب " نوکری کیواسطے۔ آپ کہاں جارہے ہیں اور کیوں جارہے ہیں"؟

نوجوان " میں سوداگر ہوں اور میں بھی دلی جا رہا ہوں۔ یہ بیلوں کی جوڑی اتفاقاً میرے ہاتھ لگ گئے۔ میں نے دیکھا کہ یہ بادشاہ کی نذر کے لایق ہے۔ اس لئے ان کی شان کے موافق یہ رتھ بنوائی اور اب دونوں چیزیں سجا کر لیچلا ہوں۔ شاہجہاں کے حضور میں پیش کرونگا۔ یقین تو ہے حضور والا کو پسند آجائے اور مجھے نہال کردیں"

سعد اللہ خاں " بیشک پسند آئیں گے۔ ایسے بیل آجتک نہ دیکھے نہ سنے"

منزل پر پہنچکر رات کو سعد اللہ خانصاحب اور سوداگر ایک ہی سرا میں اُترے اور ان کی اُن کی رات بھر باتیں ہوئیں۔ سعد اللہ خاں کی تقریر پر سوداگر فریفتہ ہوگیا۔ اور کہنے لگا مجھ سے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ میں رتھ میں سوار ہوں اور آپ پاؤں گھسٹیں۔ نہیں آپ بھی رتھ میں سوار ہوں اور میرے سات تشریف لے چلیں۔ سوداگر نے سعد اللہ خانصاحب کو ہمراہ لیا۔ رتھ میں سوار کرتا۔ جہاں آپ ٹہرتا وہاں اُن کو ٹھیراتا۔ جو آپ کھاتا وہ انھیں کھلاتا۔ مگر خدا کے بھید کون جان سکتا ہے۔ سوداگر کے سات سعد اللہ خاں صاحب کو چار پانچ ہی روز گزرے تھے۔ جو بدنصیب سوداگر نے ہیضہ کیا۔ اور نامرادی کے سات ملک عدم کو سدھار گیا۔ اس کی وصیت کے بموجب خانصاحب رتھ لیکر

دلی پہونچے۔ مگر ان کے پہونچنے سے پہلے اخبار نویس اور جاسوسوں کی معرفت حضور والا کو یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ سعد اللہ خانصاحب مع رتھ کے شاہجہانی دربار میں پیش ہوئے اور انھوں نے رتھ اور سوداگر کی حقیقت جو کچھ ان کو معلوم ہوئی تھی عرض کی۔ حکم ہوا کہ رتھ خانہ میں داروغہ کو سونپی جائے۔ اور سعد اللہ خاں جہاں چاہیں چلے جائیں۔ ملا کی دوڑ مسجد تک اس لئے خانصاحب نے شہر کی ایک مسجد میں جو عین بازار کے کنارہ پر تھی قیام کیا۔ لوگوں نے ان کو ذی علم اور نیک بخت پاکر مسجد کا امام کر دیا۔ ایک دن مغرب کی نماز پڑھانے کی تیاری کر رہے تھے اذان ختم ہو چکی تھی۔ نمازی صفیں ٹھیک کر رہے تھے۔ تکبیر ہو رہی تھی جو سنا گیا کہ جہاں پناہ ظل اللہ شاہجہان ہاتھی سے اتر رہے ہیں اور نماز پڑھنے مسجد میں آتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے بادشاہ سلامت مسجد میں آن پہنچے اور خانصاحب نے نماز شروع کر دی۔ الحمد کے بعد خانصاحب نے پہلی رکعت میں آدھی سورہ ناس اور دوسری میں باقی آدھی سورہ ناس پڑھی اور تیسری رکعت ادا کر کے جلدی سے سلام پھیر دیا۔ جہاں پناہ کی موجودگی میں کس کی تاب و طاقت تھی جو امام سے پوچھتا کہ یہ نماز پڑھائی ہے یا کھیل کیا ہے۔ مگر سارے کے سارے نمازی اپنے جی میں گھٹ رہے تھے۔ بادشاہ کو بھی اسطرح کی نماز پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس لئے ان سے نہ رہا گیا اور سعد اللہ خانصاحب سے استفسار فرمایا

جہاں پناہ:۔ "ملا جی نماز ہو گئی؟"

سعد اللہ خاں:۔ "جی ہاں ہو گئی۔ اور اچھی طرح ہو گئی کیا حضور والا کو کچھ شبہ ہے؟"

جہاں پناہ:۔ ہم نے کسی امام کو آدھی سورہ ناس ایک رکعت میں پڑھتے

نہیں دیکھا ہے۔"

خانصاحب "حضور والا کا فرمانا بجا ہے مگر امام اعظم ابو حنیفہ کوفی رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب میں نماز کے اندر بڑی ایک آیتہ اور چھوٹی تین آیتیں قرآن کی پڑہنی فرض ہیں۔ اور اس سے زیادہ مستحب اور سورہ ناس میں چھ آیتیں ہیں اُن میں سے تین تین کا ہر رکعت میں پڑہنا کافی تھا۔"

جہاں پناہ "یہ درست ہی مگر اس قدر نماز کو تاہ کرنے میں آپ نے کیا مصلحت سمجھی تھی؟"

خانصاحب "جناب عالی اَلْاَوْلٰی بِالْاِمَامَۃِ الاعلم بِالسُّنَّۃِ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ بادشاہ عالم پناہ نماز میں شریک ہوتے ہیں۔ اور بادشاہوں کی ذات سے علاوہ نماز کے اور بہت سے فرائض خدا نے لگا دئے ہیں انکا وقت بڑا عزیز اور قیمتی ہوتا ہے۔ ایک سنت کے پیچھے ان کے وقت کو ضائع کرنا اور فرض و سنت کے ترک کا عذاب امام کو اپنی گردن پر لینا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے نماز کو مینے عجلت کے ساتھ ختم کر دیا مگر نماز بے کراہت ادا ہوئی ہے۔"

خانصاحب کی یہ عاقلانہ گفتگو شاہجہاں کے دل میں کھب گئی۔ اور اپنے دل میں کہنے لگے نوجوان ملّا کو خدا نے کس قدر جوہر قابلیت دیا ہے۔ اگر اس کو کاروبار سلطنت پر لگایا جائے تو خوب خوب سلیقہ دکھائے۔

جہاں پناہ "ملاجی ہم تمہاری قابلیت سے بہت خوش ہوئے۔ تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

خانصاحب "فدوی کو سعد اللہ کہتے ہیں لوفقیرخانہ چن یوٹ ضلع جنگ میں ہی یہ ہی غلام ہے جو سوداگر ہتنی کی مدہ لیکر بدولت پہ حاضر ہوا تھا۔"

جہاں پناہ :۔ اچھا تم وہ شخص ہو خیر اس قابلیت کے بدلے میں تمہاری ناخن بندی کیا ئے گی۔ خانصاحب نے جھک کر سلام کیا۔ اور حضور والا قلعہ کو تشریف لے گئے۔ دوسرے دن خانصاحب دربار میں حاضر ہوئے۔ اور ان کے امتحان کے واسطے انھیں چرم خانہ کا داروغہ کر دیا گیا جس میں لاکھوں روپیہ کا چمڑہ رہتا تھا۔ جو فوج اور سب شاہی کارخانوں میں کام آتا تھا۔ اس خدمت پر ان کو برس دن گذرا تھا۔ جو شاہی خزانچی نے جہاں پناہ کو اس طور سے رپورٹ دی کہ چرم خانہ پر جو داروغہ مقرر ہوا ہے وہ نہایت ناتجربہ کار اور غافل معلوم ہوتا ہے چمڑوں کے چپڑنے کے لئے تیل خریدنے کی غرض سے سال میں کئی لاکھ روپیہ خزانہ سے جاتا تھا۔ مگر اس نے اس کام کے لئے اوہی کوڑیاں بھی نہیں لیں۔ یقین ہے تمام چمڑہ نیواں ناس کر دیا ہوگا۔ خانصاحب کے پاس اسی وقت حکم پہنچا کہ مابدولت واقبال کل چرم خانہ کا ملاحظہ فرمائیں گے۔
دوسرے دن حضور والا چرم خانہ میں تشریف لے گئے۔ تو معلوم ہوا کہ تمام چمڑہ تیل میں ڈوبا ہوا ہے اور کارخانہ میں ہر کام نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے ہو رہا ہے

جہاں پناہ :۔ سعد اللہ خاں تم نے شاہی خزانہ سے تیل کی قیمت نہیں لی اور ہم تمام چمڑوں کو تیل میں تر پاتے ہیں۔ یہ اتنی رقم تم نے کہاں سے صرف کی؟

خانصاحب :۔ خداوند مجھے معلوم ہوا کہ محلات اور تمام قلعہ اور شاہی کیمپ کے اندر رات کو ہزارہا فتیل سوز روشن کیا جاتا ہے۔ اور ہر ایک کے نیچے دری چاندنی قالین کو تیل سے محفوظ رکھنے کی غرض سے چمڑہ کا ایک زیر انداز بچھایا جاتا ہے۔ فدوی نے بجائے زیر انداز کے چمڑے کے تھان بھیجنے شروع کئے اور چراغچیوں کو ہدایت کی فتیل سوزوں کے نیچے زیر انداز کے بجائے رکھیں۔ اور جب تیل میں خوب تر ہو جائیں تو واپس لے آئیں۔ اور نئے تھان چمڑے کے بچھائیں

اگر کوئی تھان کٹے پھٹیگا تو تمہاری تنخواہ سے کٹیگا۔ اِس ادنےٰ تدبیر سے کام بھی خوب ہوا اور کئی لاکھ کی بچت ہو گئی "

خانصاحب کی اس کارگزاری نے بادشاہ کے دل میں اور جگہ کر دی اسیوقت ان کو خلعت و انعام عطا فرمایا اور کتب خانہ کی حفاظت بھی ان کے سپرد کی گئی۔ سال بھر کے بعد پھر خزانچی نے واویلا کی کہ حضور والا سعداللہ خانصاحب نے شاہی کتب خانہ کا خدا جانے کیا تیا پانچہ کیا ہے برتن دن میں ہزار ہا روپیہ کتابوں کی جلد بندی او مرمت میں خرچ ہوتا تھا۔ مگر خانصاحب نے اس کام کے لئے سال بھر میں خزانہ سے ایک حبہ نہیں لیا۔ کام بگڑا نہ ہوگا تو سنورا تھوڑا ہی ہوگا۔ حکم پہنچا کہ کل کتب خانہ کا ملاحظہ کا ہوگا جب دوسرے دن حضور والا نے معائنہ فرمایا تو معلوم ہوا کہ کتب خانہ چمنستان بن رہا ہے۔ کتابوں کی نئی نئی جلدیں آئینہ کی طرح پڑی چمک رہی ہیں۔ اور بیش قیمت زربفت و کمخواب کی چولیاں کتابوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔

جہان پناہ " سعداللہ خاں تم نے جلد بندی او مرمت کیواسطے خزانہ سے روپیہ نہیں لیا۔ پھر ہزاروں جلدیں ایسی خوب کیونکر تیار ہوئیں ؟"

خانصاحب " فدوی نے اس عرصہ میں کتب خانہ کے سب نوکروں کو صحافی سکھادی اور جو نئے نوکر رکھے وہ ایسے رکھے جن کو صحافی آتی تھی۔ اسلئے نوکروں نے ہی جلد بندی او مرمت کی اور خزانہ سے جداگانہ رقم لینے کی حاجت نہ پڑی "

جہان پناہ " آفریں صد آفریں۔ اچھا یہ ہزاروں روپیہ کی زربفت اور کمخواب کہاں سے آئی جن کی چولیاں کتابوں پر چڑھ رہی ہیں۔ اور کتابیں چاند سورج بن رہی ہیں "

خانصاحب :۔ راجہ اور والیان ملک امرا اور روسا کی سینکڑوں عرضیاں اور خطوط کم خواب اور زربفت کے خریطوں میں ہر روز حضور میں آتے تھے۔ اور ہر وہ چوبداران کو بے پوچھے گچھے اپنے گھر لیجاتے تھے۔ فدوی نے حضور سے ایک حکم جاری کروالیا تھا کہ یہ تمام خریطے ہر روز کتب خانہ میں پہنچادئے جایا کریں۔ بندگانِ عالی کو یہ خفیف بات یاد نہیں رہی۔ یہ ساری انھیں کی جوت ہے۔

جہاں پناہ سعداللہ خانصاحب کی اس حکمت اور دانائی پر از بس خوش ہوئے اور اسی وقت منصب جاگیر عطا فرمایا اور دربار میں حاضر ہوکر کام کرنیکا حکم سنایا۔

شاہجہاں کو کتاب پڑھنے اور سننے کا بھی ازحد شوق تھا۔ ایک دن خانصاحب مولانا روم کی مثنوی شریف حضور والا کو سنا رہے تھے ایک شعر انھوں نے پڑھا ؎

گرسنہ چوں میشوم سگ میشوم
سخت ناہنجار و بد رگ میشوم

اس شعر پر شاہجہاں کو شبہ ہوا۔ فرمایا سعداللہ خاں ذرا کتاب ہمیں دکھانا خانصاحب نے کتاب پیش کی۔ تو حضور نے دیکھا تو شعر اس طور سے لکھا ہوا ؎

گرسنہ چوں میشوی سگ میشوی
سخت ناہنجار و بد رگ میشوی

جہاں پناہ :۔ "تمنے میشوی کو میشوم بدل کر کیوں پڑھا؟"

خانصاحب (ہاتھ باندھکر ادب سے) "غلام کی یہ تاب نہ تھی جو کتاب میں لکھا تھا وہ حضور کے سامنے پڑھ دیتا"۔

اس ادا پر شاہجہاں لوٹ ہوگئے۔ کیونکہ دل میں گھر تو خانصاحب کے جوہر نے

برسوں سے کر رکھا تھا۔ محظوظ ہو کر فرمایا سعداللہ خاں لو یہ قلمدان وزارت ہے۔ اس سے بڑھکر ہمارے پاس اور کوئی چیز تمہارے دینے کے قابل نہیں ہے"

قلمدان وزارت کے ساتھ علامی جملۃ الملک امیرالامراء نواب سعداللہ خاں وزیراعظم کشور ہند کا خطاب اور ماہی مراتب خلعت اور منصب پایا۔ اپنے عہد میں جس خوبی کے سات وزارت کی خدمت کو خانصاحب بجالائے اُس سے کتابیں بھری پڑی ہیں پڑھیئے اور سبق لیجئے۔ آپکی وزارت کے منصب کو چار برس ہوئے تھے کہ ایک دن ہوادار میں بیٹھے قلعے سے اپنے مکان کو آرہے تھے۔ جو راہ میں ایک فقیر سے آنکھیں چار ہوئیں۔ فقیر ان کو دیکھکر سٹ پٹایا اور بھاگ کر ایک دوکان میں جا چھپا مگر خانصاحب نے بھی اسے تاڑ لیا۔ نوکروں کو حکم دیا اسے حویلی پر سات لے کر آؤ خوشی سے نہ آئے تو زبردستی لاؤ۔ مگر خدا کے لئے کچھ گستاخی نکرنا جب فقیر صاحب مکان پر آئے تو سعداللہ خاں ان کے گلے سے لپٹ گئے۔ معلوم ہوا حضرت شاہ محب اللہ صاحب بہاری ہیں۔ اب آپ سچ مچ درویش کامل بنگئے تھے۔ اور مزارات کی زیارت کیواسطے دلی آئے تھے۔ چھپے چھپے پھرتے تھے کہ کہیں بھائی سعداللہ خاں نہ دیکھ پائیں۔ نہیں تو پیچھا نہ چھوڑیں گے۔ مگر ہونی سے منفی بات خانصاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی حمام میں بھیجا۔ نہلوایا دھلوایا گدڑی اتروا کر پھنکوادی امیرانہ پوشاک پہنائی۔ شام کو جاکر بادشاہ سے عرض کیا۔ میرے بھائی شاہ محب اللہ صاحب بہار سے آئے ہیں۔ درحقیقت وہ وزارت کے قابل ہیں۔ ان کو وزیر بنایا جائے۔ اور فدوی آپکی نیابت میں کام کرے۔ تو بہت ہی مناسب ہوگا۔ بادشاہ سمجھ گئے۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے ارسطو یا افلاطوں ہونگے جن کی سعداللہ خاں تعریف کرتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کی جستجو ہی رہتی تھی۔

ملنے کے لئے بیتاب ہوگئے۔ اسیوقت خاص کی سواری بھیجی۔ شاہ محب اللہ صاحب دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ انکی نورانی صورت اور پرمغز گفتگو سنکر متحیر ہوگئے فوراً آپ کے لئے منصب اور جاگیر تجویز ہوا۔ شاہ صاحب چلے تو ہاتھی پر سوار تھے۔ آگے پیچھے فوج اور نقیب چوبدار تھے۔ عقیدت کے لحاظ سے دلی میں یہ قاعدہ ہوگیا تھا کہ جس امیر کو کوئی خلعت یا منصب بخشا جاتا۔ تو وہ سلام کے لئے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پر حاضر ہوتا۔ اس لئے شاہ صاحب کو بھی مہرولی شریف جانا پڑا۔ جب لاٹ کے نیچے پہونچے تو سوار کو اکرا اپنی باڈی گارڈ فوج سے کہا تم لوگ یہاں ٹھیرو۔ میں آستانہ تک پیادہ اور اکیلا جاؤں گا۔ فوج کو انتظار کرتے کرتے صبح سے شام ہوگئی۔ تو دو چار آدمی آپ کی تلاش میں درگاہ شریف پہونچے۔ خادموں نے کہا بیشک ایک امیر صبح یہاں آئے تھے۔ پوشاک اتار کر ہمیں دے گئے۔ اور ہم سے ایک گزی کا تہمد لیکر اور زیارت کرکے پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ فوج نے سارا جنگل اور پہاڑ چھان مارا۔ مگر آپ کا پتہ نہ لگا۔ جب سعد اللہ خاں صاحب کو خبر ہوئی تو بہت روئے۔ اور کہنے لگے شاہ صاحب مردان خدا میں سے ہیں۔ ہمنے انھیں دنیا میں پھنسانا چاہا تھا مگر وہ بھلا کب پھنسنے والے تھے

آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند ؎
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی

شادی کا غم

بولے مسٹر مسز سے "مائی ڈیر" — آج بیٹھی ہو تم کیوں اتنی اُداس

بیوی بولی۔ جوان بیٹی ہوئی — بیاہ کی اس کے کچھ نہیں ہے آس

اسکی شادی کی جلد فکر کرو — گھر میں رکھکر اسے نہ ڈالو پاس

بولے مسٹر کہ کیا کروں بیوی — میرے بھی اس الم سے گم ہیں حواس

فکر بَر کی ہے۔ فکر ہے زر کی — میں اکیلا۔ ملال و رنج۔ پچاس

پاس ہوں جب کئی ہزار روپے — تب کہیں جا کے کام آئیں اس

گھر میں فیاض کے مگر یہ کہاں؟ — بخیل کے گھر نسلے میں کب ہے ماس؟

ٹھہرے ہیں لڑکے دو مشکل آج — ہے خدا کا کمال شکر و سپاس

ایک کا نام ہے "امان علی" — ایک کا نام ہے "میاں الیاس"

وہ جو الیاس ہے۔ وہ عالم ہے — کر کے آیا ہے ابکے بی۔ اے پاس

یاد ہے ہسٹری اُسے از بر — یونکلڈ بھی ہے وہ فسٹ کلاس

ہے مگر وہ غریب کا لڑکا — نہیں اس کا گھرانا دولت اساس

دس روپے کا ابھی ہے اپرنٹس — دوڑتا ہے کچہری بارہ ماس

کوٹ پتلون کو نہیں اُٹھتے — ہے وہ فیشن کے پیچھے ستیاناس

سود دیتا ہے قرض لیتا ہے — دل کی اپنے نکالتا ہی بھڑاس

ناچتا ہے وہ ساتھ میموں کے — نہیں کھاتا بغیر سرکہ و ساس

دوسرا وہ جو ہے امان علی — نہیں علم و ہنر کی اسمیں باس

مگر اس کا پدر تونگر ہے — اس کے گھر نام کو نہیں افلاس

لکھنے پڑھنے میں سست ہے لیکن — دو برس پر چڑھا ہے تھرڈ کلاس
اپنے ماں باپ کا دلارا ہے — رات دن کھیلتا ہے چوسر تاس
وہ دیا لاکھوں پر جلاتا ہے — اس کے بنگلہ میں روشنی ہو گیاس
بولیں بیوی کہ بس وہ اچھا ہے — جس کے گھر میں ہوں ہیرے اور الماس
دس روپلی میں اپنا کیا ہو گا — "اوس سے بھی کہیں بجھی ہے پیاس"
ساس سسر کے کو کیا میں جاؤنگی — کبھی ایسوں کی میں ہونگی نہ ساس
ٹھیک ہے بس وہی "امان علی" — کیا ہوا اگر وہ کھیلتا ہے تاس؟
گہنے پاتے تو دیگا بچی کو — اس کا گھر تو بنائگا رنواس
ڈالو الیاس کو جہنم میں — دے کے بیٹی اسے کرو نہ نیاس
نوکری پر اُدھار کھائے نہ وہ — کہدو اس سے کہ جا کے بیچے گھاس!

چولھے میں جائے وہ پڑھا لکھا
دس روپلی اور اسپہ بی اے پاس!

(رسالہ تہذیب نسواں)

قصیدہ تاجپوشی

[یہ قصیدہ جو مولوی سید محمد فضل رب صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ نے دربار تاجپوشی سیتاپور (اودھ) میں پڑھا تھا اور نہایت مقبول ہوا کیونکہ وہ شاعرانہ خوبیوں کا گلدستہ ہے۔ اسمیں آپنے ہندو مسلمانوں کے دلی اتحاد کی ایک نہایت موثر دلیل اس شعر میں دی ہے کہ "مختلف پھولوں کی رنگت تو بدل سکتے نہیں ٭ انکا گلدستہ بنا سکتے ہیں لیکن باغباں" چونکہ یہ قصیدہ ابتک شایع نہیں ہوا اور یہ کہ اسکی اشاعت سے اہل ہند ایک مفید سبق سیکھ سکتے ہیں اس لئے ذیل میں نذر ناظرین ہے۔ ایڈیٹر]

آج کیوں رشکِ ارم ہے کشورِ ہندوستاں
جس کی یہ تعریف تھی ہندوستاں جنت نشاں

ہو رہی ہیں کیوں چمن میں آج بزم آرائیاں
پھولکر ہر گل خوشی سے ہو رہا ہے گلستاں

آج ہے جوشِ مسرت موجزن کس واسطے
بحر و بر میں کیوں نظر آتے ہیں شادی کناں

اہلِ بھارت سراسر ہیں خوشی کے جوش میں
ان سے بڑھکر کوئی دنیا میں نہ ہوگا شادماں

نغمہ زن ہیں بلبلیں بیساختہ کھلتی ہیں گل
کس لئے پھولا پھلا ہے گلشن ہندوستاں

ٹوٹے پڑتے ہیں فلک سے ستارے کس لئے
ہیں انار و ماہتابی پھلجھڑی کیوں گلفشاں؟

مجھکو حیرت تھی یہ کیا ہے! اور سبب اسکا ہے کیا؟
یہ صدائے خوش میرے کانوں میں آئی ناگہاں

تاجپوشی قیصرِ ہندوستاں کی آج ہے
جشن اسکا ہو رہا ہے از زمیں تا آسماں

سنکے یہ مژدہ مرے دلکو خوشی ایسی ہوئی
شوق سے وہ مطلع پُرنور آئے بر زباں

مطلع

کیا کہوں کیا ہیں حضور قیصرِ ہندوستاں
جسم ہے ہندوستاں وہ اسکی ہیں روحِ رواں

جسمِ ہندوستاں کی آنکھیں ہیں ہندو مسلماں
اور سر اسکے حضور قیصرِ ہندوستاں

فرق کچھ کرتے نہیں ہیں آپ دونوں میں ذرا
دائیں بائیں کا بھی کچھ انمیں نہیں نام و نشاں

عدل و انصاف آپکا مشہور ہے آفاق میں
آپ اپنے عہد کے ہیں بیگماں نوشیرواں

شیر و بکری دونوں پانی پیتے ہیں اک گھاٹ پر
خوف کچھ کھاتے توانا سے نہیں ہیں ناتواں

ہے نظر لطف و کرم کی رات دن خدام پر
ہیں رعایا پر پدر و مادر سے بڑھکر مہرباں

آپ کی ہر دلعزیزی کا بھلا کیا پوچھنا
نام نامی جارج پنجم سب کا ہے ورد زباں

آب و آتش کو ملایا ہے عجب ترکیب سے
ریل ہی کو دیکھئے کیسا اڑاتی ہے دھواں

بے پر و بازو اڑا تھا سوئے گردوں کب کوئی
ایرشپ کو دیکھکر کھاتا ہے چکر آسماں
(ہوائی جہاز)

ہے یہ سب سامان ہم سب کی سہولت کے لئے
تاربرقی - ریل موٹر ہیں جہاز آب رواں

ہیں مدارس کالج و اسکول ہر ایک شہر میں
ڈگریاں پاتے ہیں جسمیں دیکے لاکھوں امتحاں

کردیا ثابت شفاخانوں نے بھی اسبات کو ہر مرض کی ہے دوا۔ ہر رنج ہے راحت رساں
نیک نیت قیصر ہندوستاں ہیں اس لئے ملک ہے سرسبز و آباد اور خوشحالی عیاں
بحر ذخار آپ کی افواج بحری ہیں۔ مگر فوج بری ہے سکون ارض کو کوہ گراں
فوج شاہی سے ہی آب و تاب فرش ارض لیا ٹھیک سقف آسماں پر جس طرح ہو کہکشاں
قیصر ہندوستاں کے ہیں ہوا خواہوں میں سب راجہ و مہاراجگاں۔ نواب و سلطان جہاں
ہے نہیں ثانی جہانگیری و دانش میں کوئی ہیں جہانگیر امپرر۔ تو امپرس نور جہاں
جارج پنجم سے مسیحائے زماں کا جشن ہے عرش و کرسی پر نہ ہو کیونکر مزاج آسماں
مہر جنکی سلطنت میں ہو نہیں سکتا غروب فضل رب سے آج وہ دہلی میں ہیں جلوہ کناں
آپ سب اپنی رعایا کی خوشی کے واسطے تاجپوشی کے لئے ہیں رونق ہندوستاں
آپ پہلے شاہ ہیں جو تاجپوشی کے لئے چھوڑ کر لندن کو آئے ہیں سوئے ہندوستاں
شاہ شاہاں آپکو کہنا بجا ہے ہر طرح آپکے زیر حکومت جب ہیں سلطان جہاں
آپ کی خواہش ہے سب قومیں رہیں ملکر بہم گلشن رفعت نئے سر سے بنے ہندوستاں
بھائیو سن لو ذرا مجھ سے خدا کیواسطے ایک ہی ماباپ کی اولاد ہو تم بیگماں
چولی دامن کا تمہارا ساتھ ہے سب ایک ہو ایک ہی خالق تمہارا ایک ہی ہے حکمراں
ایک ہی سی شکل و صورت ایک سے وضع و لباس ایک ہی کے تم ہو بندے ایک ہی رحمت رساں
رکھتے ہو پھر کس لئے آپس میں ناحق رنجشیں ہے تمہارا حکمراں دونوں پر یکساں مہرباں
تم ہو دونوں اسکی آنکھیں اور وہ سرباتقیں ایک کے دکھنے سے بھی ہو جائیگا وہ سرگراں
چین سے آرام سے ملکر رہو دونوں بہم تا کہ ملک ہند میں قائم رہے امن و اماں
بادشاہ وقت کی ہر دم اطاعت میں رہو تا کہ وہ بھی ہو تمہاری بندگی سے شادماں
بادشاہ وقت کی تم بندگی کرتے رہو۔ وید یا قرآن۔ دونوں میں ہے یہ حکم رواں
یادگار رکانرش کا یہ اچھا ہے شگوں ملکے ہوں شیر و شکر آپس میں ہندو مسلماں

شاہ کے تشریف لانیکا بھی مقصد ہے یہی — ملکے سب قومیں رہیں آپس میں باامن و اماں
جتنی قومیں ہیں یہاں سب صلح سے باہم رہیں — تب ترقی کا بنے ہندوستاں بھی آسماں
مختلف پھولوں کی رنگت تو بدل سکتی نہیں — انکا گلدستہ بنا سکتا ہے لیکن باغباں
ہو یہ جشن قیصری یارب مبارک ہر طرح — انپر اور انپر سے اپنے رہیں باعز و شاں
دور دورہ جارج پنجم کا زمانے میں رہے — یا خدا جب تک کہ قایم ہیں زمین و آسماں
نیر اقبال کو ہر دم رہے انکے عروج — یا خدا جب تک فلک پہ ہیں نجوم و کہکشاں
حال پر شامل رہے انکے ہمیشہ فضل رب — مہرباں انپر رہے ہر دم خداوند جہاں
جارج پنجم آبیاری اس کی فرماتے رہیں — پھولتا پھلتا رہے یہ گلشن ہندوستاں
کرتے ہیں سب اہل بہرائچ مبارکباد پیش — گر قبول افتد زہے عز و شرف حاصل از آں
تاجپوشی کا جو پوچھا سال بولا فضل رب — جارج پنجم قیصر ہندوستاں شیریں بیاں

۶۱۹ — ۱۱

دل کا بخار

(دو عزیز دوستوں کی مصیبت کے وقت)

کیسی بیتابی ہے تجکو اے دل سیماب خوا! — مضطرب ہے ہر گھڑی جوں ماہی بے آب تو
صبح صرصر کیطرح تسکین سے ہی ناآشنا! — کیوں بیابان غم و اندوہ میں ہے پھر رہا؟
ابتدا ہی سے چلا آیا تو آتش زیر پا!
کلک قدرت نے تری قسمت میں کیا سلنم لکھا!

زندگی کہتے ہیں جس کو وہ تو ہے قید بلا — عمر کا یہ سلسلہ ہستی کو ہے زنجیر پا
روز تازہ ہے یہاں صدمہ اُٹھانے کیلئے — روز تازہ درد ہے دل کو دکھانے کیلئے
عمر انسانی مگر مجموعہ آفات ہے

سینکڑوں رنج و بلا ہیں، اک بشر کی ذات ہے

اس کے مطلع پہ چھائی یاس کی کالی گھٹا کاش میں ان اپنی آنکھوں سے نہ یا رب دیکھتا

آہ! اے کشتِ امل! حسرت کی تجھ پر بجلیاں سامنے میرے نہ گرتیں ایسی آتشباریاں

آہ! اے نخلِ تمنا! آرۂ دستِ قضا تیری بیخ زندگانی پر یکایک چل گیا

آہ! اے آبادیِ اقلیمِ امید و رازا! کر گئی ویران مایوسی کی تجھکو ترکتاز

آہ! اے نورِ نگاہِ آفتابِ مدعا! کونسا بادل ترے رستہ میں حائل ہو گیا

آہ! اے رختِ سرائے آرزو! تو جل اٹھا یک بیک حیراں ہوں کسنے آگ دی تجھکو لگا

آہ! اے خرمنگہ جنسِ مرادِ بے بہا! کس ہوا نے تیرا دانہ دانہ برہم کر دیا؟

سبزۂ نوخیز تھا جو روضۂ مقصود کا

کونسی یا رب! سمومِ تند سے لہرا گیا؟

الغیاث! اے حضرتِ حق مجھکو سودا ہو گیا جامۂ صبر و تحمل چاک میرا ہو گیا

"دل[1] مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا"

حالتِ یارانِ ہمدم نے رُلایا خوں مجھے قطرہ ہر اشک میں آیا نظر جیحوں مجھے

پوچھ مت دلپر گذرتی ہے جو کیسی اسگھڑی

بحث یاد آتی ہے جب تدبیر اور تقدیر کی

دل میں یاروں کے اُمید اک ولولہ انگیز تھی گھات میں جلاد ناکامی کی تیغ تیز تھی

معرکہ آرا زمیں پر لشکرِ تدبیر تھا آسماں پر خندہ زن لیکن شہِ تقدیر تھا

بے نیازی کی عجب ہے شان تیری کبریا

اس سے پہلے سچ ہے، میں محرم نہ تھا اس راز کا

غلام محمد طور - ایم - اے

---

[1] غالب مرحوم

لیگل غزل

یعنی لاؔ (قانون) کے حاصل کرنے میں جو جو دقتیں درپیش آتی ہیں وہ اور قانون پڑھنے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہونیکی وجوہات

مزا لاؔ کے پڑھنے میں اصلا نہیں ہے ۔ کہ کچھ اسمیں الفت کا چسکا نہیں ہے

سزا وعدہ شکنی کی معشوق کو دے ۔ کوئی کنٹرکٹ[1] ایکٹ ایسا نہیں ہے

پینل کوڈ[2] کو بھی ٹٹولا بہت سا ۔ کچھ اس میں مکالے نے لکھا نہیں ہے

ایل۔ ایل بی۔ عدالت میں ہیں اسکی جیز لے گئے ۔ وکیلوں سے کچھ کام چلتا نہیں ہے

گئے تھے بہت ایز منٹ[3] رٹ رٹا کے ۔ وہاں رانگ رائٹ کا جھگڑا نہیں ہے

پروسیجر[4] کو لیکے چاٹا کریں وہ ۔ یہاں ضابطہ کا گزارا نہیں ہے

زباں جو ہے کہتی گواہ اسپہ دل ہے ۔ مگر واں شہادت[5] پہ پیمانہ ہے

مجھے دیکھکر نارٹ[6] پڑھتے وہ بولے ۔ کہ کچھ ذکر خیر اس میں اپنا نہیں ہے

بھرے خالی اور خشک مضمون اس میں ۔ محبت کا اسمیں اشارا نہیں ہے

نہیں گر محبت ہے نیگوشی ایبل ۔ تو اسمیں کسی کا اجارا نہیں ہے

جورو کا رقیبوں کے جانے سے بولے ۔ "میاں! عاشقی ہے یہ ٹھیکہ نہیں ہے"

نہتی شاید "ہالینڈ" میں کچھ پروڈنس ۔ کوئی باب جورسٹ[7] میں محبت کا نہیں ہے

ہے نواب کے پاس عشقیہ جاگیر ۔ خیال اسلئے ان کو لاؔ کا نہیں ہے

محمد لضیر الحق قریشی بی۔ اے علیگ ناگپور

[1] قانون معاہدہ۔ [2] تعزیرات ہند [3] قانون حقوق [4] فوجداری [5] اصول تعزیر [6] قانون تبادلہ ہنڈی وغیرہ [7] کتاب جورس پروڈنس مصنفہ ہالینڈ۔

واجب الوجود

علم ہیں اور علم کے تہذیب کے بانی ہیں ہم — عارف حق واقف اسرار حقانی ہیں ہم
بحر پیدا کر دیا اس کے شناور خود ہوئے — ماہی مرغابی ہیں ہم کشتی ہیں اور پانی ہیں ہم
کثرت و قلت کی جلوے ہم میں ہیں اور ہم ہیں — روح ہیں جہان کی اور ذات یزدانی ہیں ہم
بنکے نغمہ ہر جگہ پر گونجتے رہتے ہیں خود — یگیہ شالاؤں میں سن لو ویدکی بانی ہیں ہم
اوّل آخر اور برزخ کے بطوں میں ہیں نہاں — جان ہیں نیرنگ کی اور ظل سبحانی ہیں ہم
لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد سمجھو ہمیں — یوم دین کے مالک اور آیات قرآنی ہیں ہم
مسئلہ توحید و تثلیث و دوئی کی جان ہیں — پاکی قدوس ہیں اور شرف انسانی ہیں ہم
ڈھونڈتے پھرتے ہو کس جا تم حرم اور دیر میں — دیکھ لو ہم کو کہ بےمثل اور لاثانی ہیں ہم
سب کے ہم معبود ہیں مسجود ہیں مقصود ہیں — لایموت ولایزال اور لافانی ہیں ہم
ذات میں ہیں وصف میں ہیں اور دونوں سے جدا — مقصد مدحت سرائی اور ثنا خوانی ہیں ہم
سالکو مشرک ہو تم توحید کا کلمہ پڑھو — نکتۂ عرفاں ہیں اور معراج روحانی ہیں ہم
نظم میں ہیں ہم نثر میں۔ لوح و قلم۔ کاغذ میں ہم — لفظ میں جملہ میں حرف و مطلب و معنی میں ہم
غیریت کا وعظ کیوں اغیار کرتے پھرتے ہیں — ہم ہیں خود ہندو مسلماں گبر و نصرانی ہیں ہم
کرتے ہیں شغل نصیرا[1] سنکے صوت سرمدی — ان سے کہدو مرکز الاذکار سلطانی ہیں ہم

ہر جگہ رہتے ہیں اختر ہم بشکل مختلف
چینی ہیں ہندی ہیں ایرانی ہیں جاپانی ہیں ہم

منشی گوری لال اختر۔ دہلی

---

[1] شغل نصیرا صوت سرمدی اور سلطان الاذکار صوفیوں کے مشاغل ہیں۔

تازہ غزلیں

(از جناب سید حمید حسن صاحب نشاط امروہوی از شلانگ)

چمن میں نرگس بھی وہ نزاکت نگاہ حیرت سے تک رہی تھی — کمر جو وقت خرام اسکی قدم قدم پر لچک رہی تھی

حیا بھی گو اسکو آنکھوں آنکھوں میں سر اٹھانے سے روکتی تھی — مگر یہ حالت تھی مارے شوخی کے بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی

عجب مزے کی تھی ہاتھا پائی نہ ایسی لذت کبھی اٹھائی — مرا گریباں تھا ٹکڑے ٹکڑے تو اسکی چولی مسک رہی تھی

جو عشق میں خواریاں سہی ہیں وہ دل سے اب تک نہیں گئی ہیں — نہ کوئی ذلت اٹھی رہی تھی نہ کوئی باقی ہتک رہی تھی

بشر ہی آخر تو تھا خدایا بنایا مجھکو نہ تھا فرشتہ — گناہ سرزد نہ ہوتے کیونکر نہ مجھ میں روح ملک رہی تھی

پڑی یہ افسوس کیا مصیبت امید بھی ہو گئی جو رخصت — یہی تو لے دیکے بیکسی میں بس ایک بس ہر کمک رہی تھی

عبث چھپاتا ہی مجھسے ساقی لے اب تو دیدے جو کچھ ہو باقی — کہ خم کا جب تو رہ رہا تھا تو میری پسلی پھڑک رہی تھی

تلاش میں تیری او ستمگر کہاں کہاں لیگیا مقدر — جب نہ چھانا ہو جسنے جا کر نہ کوئی ایسی سڑک رہی تھی

نہیں شکایت کچھ اسکی تم سے خفا اگر ہو گئے ہو ہم سے — اثر یہ اسکا ہی مدتوں سے جو آنکھ میری پھڑک رہی تھی

وہ گل جو آیا تھا میکشی کو تو عید تھی رند میں سبھی کو — دو گھونٹ بھی سے خون دختر رز بھی کیسی کیسی ہمک رہی تھی

جو دختر رز نے منہ نکالا نکھار اس کا تھا اس غضب کا — کہ دیکھکر جس کو شیخ جی کی بھی آج نیت بہک رہی تھی

نہ ہوگی ایسی کسیکو چاہت یہ دختر رز سے مجھ کو تھی الفت — کہ بعد مردن بھی میکدے ہی میں روح میری بھٹک رہی تھی

اگرچہ پیتا نہیں ہے زاہد مگر میں اسکی تو ہم بھی شاہد — کہ دیکھا آج دختر رز کو رال اسکی ٹپک رہی تھی

ہوا برآمد جو وہ گل تر تو غنچہ دل کھلا سراسر — کہ بوئے گیسوئے عنبریں سے تمام محفل مہک رہی تھی

تمام محفل تھی پر مسرت۔ دلوں سے جاتی رہی تھی کلفت
نشاط نے یہ غزل پڑھی تھی کہ کوئی بلبل چہک رہی تھی

(از جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ)

ترے ناوک جگر کے پار نکلے — بڑے چلتے ہوئے خونخوار نکلے

لئے بوسے ترے نقشِ قدم کے — میرے ارماں دمِ رفتار نکلے

محبت مجکو دہوکہ تو نہ دیدے — کہیں یہ راہ بھی دشوار نکلے!

نہ تھا ہمت کے آگے عرش اونچا — مگر نالے مرے بیکار نکلے

وہاں بھی مستحقِ جام کوثر — یہی میکش یہی میخوار نکلے

مزا کیا یکدلی کا وصل میں جب — کوئی جھگڑا کوئی تکرار نکلے

کھٹکتا ہے رقیبوں کا تصور — الہی دل سے یہ بھی خار نکلے

کبھی تو سامنے بے پردہ آؤ — کبھی تو حسرتِ دیدار نکلے

ہزاروں پیچ قسمت میں ہماری — مثالِ گیسوئے خمدار نکلے

مجھے ڈر ہے شب وعدہ کہیں پھر — زباں سے آپ کی انکار نکلے

دمِ پرسش عزیزؔ اپنی مدد کو
میرے مولا میرے سردار نکلے

حضرت حفیظ جونپوری کو کتابت کی غلطی سے مرحوم لکھا گیا جس پر آپنے ایک غزل جو مخزن ماہِ مارچ نمبر میں درج ہو چکی ہے لکھی اُسے دیکھتے ہی میری غم خوردہ طبیعت نے بھی طرارہ بھرا اور مندرجہ ذیل اشعار اُگل دیئے۔ (ساغرؔ اکبر آبادی)

کسی کی دل لگی نے مار ڈالا — ہمیں دل کی لگی نے مار ڈالا

کبھی اِس سے کبھی اُس سے لگاوٹ — مذاقِ عاشقی نے مار ڈالا

نزاکت میں یہ تم سے بڑھ کے نکلی — ارے اِس دل لگی نے مار ڈالا

ملے تم غیر سے غیبت میں میری — مجھے شرمندگی نے مار ڈالا

مجسم غم ہے بھی گھٹنے نہ آئی — طویل زندگی نے مار ڈالا

علمی کتابیں

(مصنفہ مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی)

حکمت عملی فلسفہ عملی پر مبسوط اور جامع کتاب ہے اسمیں افراد انسانی کی روحانی ارتقا کی تدابیر کے ساتھ ساتھ قومی ترقی اور عزت حاصل کرنے کے اصول بھی بیان کئے گئے ہیں اور تہذیب اخلاق تدبیر سیاست مدن کے وہ مضامین درج ہیں۔ جو انسان کی ذات میں جوہر شرافت پیدا کرنیوالے اور اسکو زندگی کے مختلف مدارج مختلف زمانوں اور مختلف حالتوں میں اصول حکمت پر کاربند رکھنے والے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم اور حقوق کی نگہداشت کا ذکر بھی موقع بموقع کیا گیا ہے۔ عبارت صاف شستہ رواں ہے۔ قیمت سے ر

الانسان۔ علم الانسان میں یہ پہلی کتاب لکھی گئی ہے جس سے انسان کے تمام قواء نفسانی اور جسمانی اور خصوصیات طبعی کی کیفیت اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے۔ علم الانسان اور مشاہدہ ذات کی تعریف اور کیفیت بیان کرنیکے بعد انسان کی جسمانی ساخت۔ ارتقا۔ قدامت۔ انواع و اقسام وغیرہ کے متعلق زمانہ حال کی تحقیقات۔ احساسات اور نطق کی حقیقت۔ حیات نفس کی کیفیت اور نفس کی تمام قوتوں کا حال مشرح بیان کیا ہے۔ علم اخلاق۔ معاشرت و تمدن کا فلسفہ نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ طرز بیان نہایت دلچسپ۔ زبان بامحاورہ و شستہ۔ علوم جدیدہ کی اصطلاحات بھی قایم کیگئی ہیں۔ جابجا قرآنی آیات سے استدلال کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مذہبی۔ علمی۔ ادبی حیثیت سے قابل مطالعہ ہے۔ قیمت عا ر

تمنائے دید قصہ کے پیرایہ میں اخلاق معاشرت و تمدن کے سبق سکھاتی ہیں نہایت دلچسپ ہے۔ ۱۰ ر

مبادی سائنس (مترجمہ مولوی معشوق حسین خان صاحب بی۔ اے) مفید جدید معلومات سے پر۔ عا ر

ملنے کا پتہ:- **مینیجر رسالہ "مخزن" بھاٹی دروازہ۔ لاہور**

یہ پراثر پُر درد اور سبق آموز نظم ہندوستان کے مشہور انشا پرداز و بےمثل ہندوستانی ڈراما نویس جناب آغا محمد شاہ صاحب حشر کاشمیری کی فکر عالی اور طبع رسا کا نتیجہ ہے۔ جو لاہور کے طبیب حاذق حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی تلمیذ حاذق الملک دہلوی کی فرمائش سے لکھی گئی ہے۔ نظم کیا ہے؟ مسلمانان عالم کے اضطراب درونی کا اظہار ہے۔ درحقیقت وہ ایک قیامت خیز نوکر ہے جو دعا ہے کہ مسلمانوں کیا بلکہ عام مشرقیوں کو جگانیوالی ثابت ہو۔ اسمیں یورپ کی ترک تازیوں اور دستبرد کو مسلمانان عالم اور اہل مشرق کے لئے باعث بیداری ٹھیراکر یورپ کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ اور یہ ہی بھی درست۔ اسلئے مدعائے نظم اپنی نوعیت میں بیحد قابل تعریف ہے۔ ایڈیٹر

مدتوں سے نغمۂ توحید محو خواب تھا — سازِ ہستیٔ مسلماں تشنۂ مضراب تھا
پیکرِ احساس میں خوابیدہ روحِ درد تھی — شعلہ ریزیٔ نواہائے اخوت سرد تھی
کرچکا تھا اپنی ہستی مسلمِ پرجوش گم — گرم ہنگامہ تھے سب یہ محشرِ خاموش گم
ماضیٔ رنگیں تماشۂ حیرتی حال تھا — روزگارِ جلوہ زا کے لب پہ کیف الحال تھا
آمد و رفتِ نفس لاتی تھی پیغامِ حیات — ورنہ نذرِ خود فراموشی تھا نظامِ حیات
چشمِ بینا حیرتِ طفلانہ کا گہوارہ تھی — صرفِ تعمیرِ تحیر طاقتِ نظارہ تھی
نغمہ سنجِ قدس چپ تھا گلشنِ تکبیر میں — بند تھا شورِ انا مسلم لبِ تقریر میں

مدفنِ صد جلوۂ آشوب زا آئینہ بود
یک جہانِ بیقراری ہم بجز دو سینہ بود

وہ پیام آخری اسلام جس کا نام تھا — وہ ظہورِ صدق جو پروردۂ الہام تھا

وہ تجلیٔ حقیقت جو ضلالت سوز تھی — گرمیٔ قلب محمدؐ سے تپش اندوز تھی
روشنی دنیا کو دی جس مہر عالمتاب نے — زنگ فطرت دھو دیا جس نور کے سیلاب نے
ظلمت آگیں خلقت انساں کو بینا کر دیا — سنگریزے کو جلا دے کر نگینہ کر دیا
شعلے پیدا کر دئے خاکستر افسردہ میں — زندگی کی لہر دوڑا دی حیات مردہ میں
شورش ہنگامہ آرا آب و گل میں ڈالدی — شور بادل کا تڑپ بجلی کی دل میں ڈالدی
ایک ہلچل پڑ گئی جذبات زنگ آلود میں — آگ سی گویا لگادی تودۂ بارود میں

بارہا نالید و گفت اے قوم ما بیدار شو!
حصۂ خود از حریفاں گیر و گرم کار شو!

پر ز غوغا شد جہاں شور قیامت از سر گذشت — پنبہ در گوشی چرا؟ برخیز! کآب از سر گذشت
مایۂ صد آفت است ایں گوش ناشنوائے تو — ہوش کن! زامروز گردد خوار تر فردائے تو
شرم کن! محو ادائے کفر ساماں کردۂ — آں دل و جانے کہ اول نذر قرآں کردۂ
ایکہ فطرت نرم و ہمت ہمچو آہن داشتی! — قطرہ بودی، مگر طوفاں بدامن داشتی
پر کن از صہبائے دوشیں ساغر ایام را — باز رنگ جلوہ دہ! از صبح ماضی شام را
صرف نسیاں ہیبت غرناطہ و بغداد شد — باز برخواں آں سبق کو خلق را از یاد شد
سطوت فاروقؓ بنما شیوۂ حیدرؓ بگیر! — تاج از کسریٰ ستان و باج از قیصر بگیر!

حال و استقبال ہر دو حاصل تدبیر تست
ہاں بجہد آمادہ شو در دست تو تعمیر تست

ہاں چھڑک پیشانیٔ ظلمت پہ افشان سحر — ٹانک دے دامان شب میں پھر گریبان سحر
بہرہ ور کر دل کو سوز احمد بے میم سے — جگمگا دے بزم جاں کو شمع ابراہیم سے
اپنی ہستی نذر دے ملت کی قربانگاہ کو — زندہ کر دنیا میں آئین خلیل اللہ کو
ڈالدے شور نوا! معمورۂ ظلمات میں — دوڑ جا! آہنگ بن کر ساز موجودات میں

خاک کو بھر دے سُرورِ آسماں پرواز سے ۔ گرم کر دے رُوح مستی شعلۂ آواز سے

حُسنِ آرایش سے زینت عالمِ امکاں کو دے ۔ خلعتِ تجدید آئینِ کہن ساماں کو دے

کُلیاتِ دہر کی اِک شرح نو تحریر کر! ۔ نظمِ ہستی کی نئے الفاظ میں تفسیر کر!

طرحِ نو اندازو بنیادِ جہاں از سر فگن!
شعلہ در پیراہنِ آتش بخشک و تر فگن!

تیری لب بندی سبق آموزِ گویائی ہوئی ۔ طعنہ زن ہیں تجھ پہ قومیں تیری ٹھکرائی ہوئی

آج اُن ذرّوں کو بھی نازِ اپنی تابانی پہ ہے ۔ تیرے در کا نقشِ سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے

منتظر نظارے ہیں چشمِ خمار آلود کھول ۔ اُٹھ! کلیدِ فتح بن قفلِ درِ مقصود کھول

اَے خوشا غفلت! جو ممنونِ اثر کچھ بھی نہیں ۔ کان نے سب کچھ سُنا دل کو خبر کچھ بھی نہیں

گو صدائے ہمت افزا تا بگوش آتی رہی ۔ نالۂ شبگیر پیہم آوازِ سروش آتی رہی

پھر بھی ننگِ زندگی آسودہ خواری رہا ۔ سونے والے پر وہی خوابِ گراں طاری رہا

جب تغافل اپنا شیوہ خفتہ قسمت نے کیا ۔ اور ہی سامان بیداری مشیت نے کیا

دفعتہً از جلوۂ عیسیٰ افق تابندہ شُد
قُم باذنی گفت مغرب روحِ مشرق زندہ شُد

اَے زمینِ یورپ! اَے مقراضِ پیراہن نواز ۔ اَے حریفِ ایشیا! اَے شعلۂ خرمن نواز

چارہ سازی تیری بنیادِ دانگن کاشانہ ہے ۔ تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے

اشکِ حسرت زا سے چشمِ حریت نمناک ہے ۔ خونچکاں روداد اقوامِ گریباں چاک ہے

صرفِ تصنیفِ ستم ہے فلسفہ دانی تری ۔ آدمیت سوز ہے تہذیبِ حیوانی تری

عظمتِ دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے ۔ دھل گیا حُسنِ قدامت خون کے چھڑکاؤ سے

جلوہ گاہِ شوکتِ مشرق کو سونا کر دیا ۔ جنتِ دنیا کو دوزخ کا نمونہ کر دیا

اُٹھ رہا ہے شورِ غم خاکسترِ پامال سے ۔ کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبانِ حال سے

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

گرچہ اک دنیا کا دل تیری طرف سے خون ہے　　اُمت خیر الوریٰ لیکن تری ممنون ہے
کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کہاں ہوں؟ یہ حقیقت کھل گئی　　تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشم ملت کھل گئی
چوٹ کھا کر بھر گیا دل لذت ایثار سے　　جلوے جاگے شیشۂ لشکستہ کی جھنکار سے
یک بیک خون تن بیجاں میں ہیجان آ گیا　　قطرہ دریا بن گیا دریا میں طوفان آ گیا
چونک اٹھی روح اخوت ایک ہو گئے　　پتیاں گل بن گئیں گل مل کے گلدستہ ہوئے
ہو گئیں بکھری ہوئی اینٹیں بہم تعمیر کی　　مل گئی ہر ایک کڑی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی
بت شکن وحدت پرست اک جسم اک جاں ہو گئے　　غل ہوا دنیا میں "پھر کافر مسلماں ہو گئے"

از کرم بپذیر یارب! جوش بے اندازہ را
تا قیامت زندہ دار! این زندگیِ تازہ را

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے　　بادلو ہٹ جاؤ۔ دیدو راہ جانے کیلئے
اے دعا! ہاں عرض کر عرش الٰہی تھام کے　　اے خدا اب پھیر دے رُخ گردش ایام کے
صلح تھی کل جن سے اب وہ برسر پیکار ہیں　　وقت اور تقدیر دونوں درپے آزار ہیں
ڈھونڈھتے ہیں اب مداوا سوزش غم کیلئے　　کر رہے ہیں زخم دل فریاد مرہم کے لئے
رحم کر اپنے نہ آئیں کرم کو بھول جا!　　ہم تجھے بھولے ہیں۔ لیکن تو نہ ہمکو بھولجا
خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے　　آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں　　کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی اُمت میں ہیں

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

حسرت

ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔ یہ نمبر ۹۳، خریداری کا نمبر نہیں بلکہ ڈاکخانہ کا وہ جسٹر نمبر ہے جو مخزن کو دیا گیا ہے

(۶) قابل استفسار امور کیلئے جوابی کارڈ یا ۱ر کا ٹکٹ آنا چاہئے ورنہ عدم جواب کی شکایت معاف

(۷) جو احباب مخزن ایکمرتبہ جاری کرالینگے وہ اسوقت تک خریدار سمجھے جائیں گے جب تک کہ ان کی طرف سے عدم خریداری کی باضابطہ اطلاع دو ہفتہ قبل اختتام چندہ سابق نہ آجائے گی۔ ورنہ ان کے نام سال بسال رسالہ مخزن بذریعہ وی۔پی روانہ کیا جائے گا جس کا وصول کرنا ان کا فرض ہوگا۔

قیمت مخزن قسم اول ۶ر فی پرچہ ۸ر

قیمت مخزن قسم دوم ۳ر فی پرچہ ۴ر

ہاف ٹون عکسی تصویریں

شائقین جلد منگائیں

علمی اور ادبی دنیا کے مشاہیر کی تصویریں جو رسالہ مخزن میں وقتاً فوقتاً شایع ہوتی رہی ہیں انہیں سے بعض ایسی ہیں جنھیں اکثر صاحبان علیحدہ علیحدہ اپنے پاس رکھنا یا فریم میں لگانا چاہتے ہیں اس لئے انکی کچھ کچھ کاپیاں زاید چھپائی گئی ہیں۔ جو اب برائے فروخت پیشکش کیجاتی ہیں۔

(۱) داتا گنج بخش لاہوری (۲) ظفر آخری بادشاہ دہلی (۳) نورتن اکبر (۴) دربار شاہجہاں (۵) نورجہاں بیگم (۶) نظام حیدرآباد دکن (۷) باباگورونانک (۸) حافظ شیرازی۔ قیمت فی تصویر ۱ر

درخواستیں بنام منیجر مخزن لاہور آنی چاہئیں

اُجرت اشتہارات

سالم صفحہ یکمرتبہ ۸ر	سالم صفحہ اول یا آخر سرورق سالانہ للغہ
سالم صفحہ اندرونی سالانہ ۵ہ	؍؍ ؍؍ ششماہی ۸ہ
نصف صفحہ اندرونی سالانہ للعہ	نصف صفحہ اول یا آخر سرورق
؍؍ ششماہی ۸ہ	سالانہ ۸ہ

نمونہ کے پرچہ کے لئے ۲ر کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔ ورنہ وی پی پارسل بھیجا جائیگا۔ پرچہ مفت نہیں دیا جاتا۔

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

رسوم دہلی - مولفہ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ - قیمت ۱۲؍

اقبال دلہن (مصنفہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب) قسم اول ۱۲، قسم دوم عہ

خواب ہستی - (مرزا محمد سعید ایم - اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن) عہ

ابو مسلم خراسانی رسالہ "الہلال" مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف جس کو مولوی محمد حلیم صاحب ردولوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے قیمت عہ

مقام خلافت - شیخ عبد القادر صاحب بی - اے بیرسٹرایٹ لا کا مقبول عام سفرنامہ قسطنطنیہ با تصویر . . . . قیمت ۱۲؍

صبح زندگی - مولوی عبد الراشد صاحب الخیری کے زور قلم کا نتیجہ - جو مستورات کیلئے نہایت درجہ دلچسپی رکھتی ہے - قسم اول ندارد - قسم دوم قیمت عہ

انتخاب مخزن - مخزن کی سابقہ جلدوں کا انتخاب . . . . قیمت عہ

درد جانستاں (مصنفہ مولوی سید ناصر نذیر فراق دہلوی) دلی کی زبان میں دہلی کا سچا واقعہ قیمت ۸؍

خیالستان - یعنی سید سجاد حیدر صاحب بی - اے کے مصنفہ قصوں کا مجموعہ قیمت ۶؍

مثنویات میر حسن - مثنوی بینظیر بدر منیر کیساتھ مثنوی گلزار ارم ایک قلمی نسخہ سے نقل کر کے شامل کر دی گئی ہے عہ

حیرت انگیز کتاب فیما بعد من تبت کا بامحاورہ اردو ترجمہ ملک تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ - ۱۰؍

تیر و نشتر چھپ کر تیار ہو - دہلی کے مشہور حضرت آغا شاعر قزلباش المخاطب افسر الشعرا کا دیوان اس مجموعہ میں تمام وہ غزلیات جو مقبول عام ہو کر زبان زد خلایق ہیں اور کچھ وہ غزلیات جو آجتک کسی رسالہ یا اخبار میں شایع نہیں ہوئیں - علاوہ انکے قصائد بھی آخر میں بڑہا دیئے گئے ہیں - قیمت ۱۰؍

درخواستیں بنام منیجر "مخزن" لاہور آنی چاہئیں

معیار قومیت پر چہ میگوئیاں

کونین تک تھی ملتی جس دل کی مجھکو قیمت
قسمت کہ اک نگہ پر میں اس کو ٹال آیا

فقیر :- مکرم بندہ! میں اپنی آپ بیتی یا کہانی کیا سناؤں - خوبی قسمت سی نرا نام ہی کا فقیر نہیں ہوں بلکہ نصیبہ کا بھی فقیر ہوں - بچپن سے اس تلاش میں ہوں کہ کہیں صداقت اور وفا کے بھی درشن ہوں - ساری خدائی چھان ماری - مگر جسے دیکھا جل باز ہی پایا - دنیا میں کیا ہے؟ فریب - دہوکا - دم جھانسا - چھل بٹا - ڈھکوسلا دغا - مکر نظرت - حیلہ پاکھنڈ - اسی کا نام آدمیت ہے اور اسی کا مرادف تہذیب - صداقت اور وفا کا تو نام ہی نام ہے - میں تو اس کے لئے دین و دنیا نذر کر بیٹھا - مگر کہیں اس کا پتہ نہ پایا - سر کی کھوپڑی گنجی ہو گئی اور ٹانٹ کے بال بھی اڑ گئے - لیکن کسی سر اور کسی دل میں رمق وفا نہ پائی ؎

ہمیں یقین ہی محبوب بیوفا ہیں سب   وفا کو اپنی میرے مہربان کیا کیجے؟

سوختہ دل۔ بیشک فقیر کی صدا میں صداقت ہے۔ دُنیا اور دنیا والوں کی یہی حالت ہے مگر کیا کیا جائے ؎

بہ ہمیں مرد ماں بباید ساخت

کوئی اور دنیا ہو تو وہاں جا رہیں صرف یہی ایک لکڑی ہوئی کریں تو کیا کریں۔ بات تو فقیر کی باون تولے اور رتی تلی ہے۔ مگر اس کا علاج!"

فقیر۔ مسٹر سوختہ دل رونا تو اس کا ہے۔ کہ اس تہذیب کے زمانہ میں بھی اس قسم کی باتیں اگر پائی جائیں اور جن لوگوں کو تہذیب کا باوا آدم کہا جاتا ہے اُن کے لچھن اور کرتوتیں اس قماش کے ہوں تو کتنے افسوس کی بات ہے ؎

حسن کی لاف زنی کرتے ہیں وہ چاٹ کے خاک
کب بھلا حُسن قبول اس قدر اکسیر میں ہے"

سوختہ دل۔ تہذیب کی ایک ہی کہی۔ وفا تو درکنار اب تک میری سمجھ میں تو تہذیب کا مفہوم ہی نہیں آیا۔ ایشیا کی تہذیب۔ یورپ کی تہذیب۔ مغرب کی تہذیب۔ مشرق کی تہذیب۔ پورانی تہذیب۔ نئی تہذیب کس پر کوئی چلے۔ زمانہ میں بیشک تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اور وہ ہمیشہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ لیکن یہ تو کسی تہذیب کا بھی منشا نہیں کہ صداقت سے مُنہ پھیر لیا جائے۔ یا وفا چھوڑ دی جائے جو قصے آپ نے سُنائے ہیں اُن سے تو یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ اب تہذیب صداقت اور وفا کا نام و نشان بھی نہیں رہا ؎

ہوئی ہے برباد زندگانی۔ رہی نہ ہستی کی کچھ نشانی
صبا نے ہر چند خاک چھانی نہ ہاتھ مشت غبار آیا"

دل نواز۔ ہم ایشیا والوں کی تہذیب ہی کب تھی۔ اگر کوئی تہذیب کا زمانہ گزرا بھی تو خواب کی طرح۔ ہمیں اس پر فخر ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ

ہم تہذیب کے معانی سے بھی اب تک نا آشنا ہیں۔ یہ سہرا تو یورپ والوں ہی کے سر بندھا ہے۔ اور یہ فخر اُن ہی کو حاصل ہے۔ ایشیائی تہذیب یاد کر کے جھوٹ موٹ جیوڑا شاد کرنا ہے۔ ہمارا تو اس پرانی نام کی تہذیب سے کبھی کا جی بھر گیا یورپین تہذیب کی کشش اور اثر کا کیا ذکر کروں جسے سنتے دیکھتے ہی جی پگھلنے لگتا ہے ؎

دل پہ ہزار حرف شکایت سہی تھا ہجوم
مکھڑے کو دیکھتے ہی پہ جی کچھ پگھل گیا"۔

غیرت:- تہذیب یورپ اور عروج مغرب سے ہمیں بھی انکار نہیں۔ ہم بھی ایک حد تک اس کے معترف اور نام لیوا ہیں۔ لیکن یہ کس طرح کہا جائے کہ مشرقی دُنیا اب تک تہذیب سے خالی ہی تھی۔ اچھا یہ تو کہو جب یورپ گرداب جہالت میں ڈوب رہا تھا اس وقت ایشیا کے بعض حصوں کی کیا حالت تھی۔ چاہے کوئی ہی تہذیب ہو آثار کے اعتبار سے اس میں کوئی نہ کوئی اور کچھ نہ کچھ مستثنیات ضرور ہوتے ہیں۔ ظاہری تہذیب کا بہت کچھ مدار آب و ہوا اور کوائف ممالک پر بھی ہے۔ تہذیب کا بڑا بھاری ظاہری نمونہ لباس اور خورد و نوش اور طریق رہائش ہے۔ یورپ کی تہذیب کا ان امور کے متعلق بہت کچھ حصہ ہندوستان میں آکر مدہم پڑ جاتا ہے۔ ناچار وہاں کی مخلوق کو اپنا طرز کچھ نہ کچھ بدلنا پڑتا ہے۔ بہت سے انگریز گرمی کے دنوں میں گھروں میں ویسی کھلا لباس پہننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ لندن میں اگر اس لباس کو زیب تن کریں۔ تو پولیس کی دست برد سے کبھی نہ بچ سکیں۔ دیکھئے آب و ہوا تہذیب میں کیسی کتر بیونت کر دکھاتی ہے ؎

واہ کیا ہوش ربا ہیں تری آنکھیں صیاد
چوکڑی کیا کہ ہرن راہ ختن بھول گئے

سوختہ دل:۔ یہ تو فرمائیے یورپین تہذیب کی صحیح نقل کون اُتارتا ہے۔ غریب تہذیب کو بدنام کیا جاتا ہے۔ اس کا نام لیکر جو کچھ دل میں آتا ہے ہم کرتے کراتے ہیں۔ جو باتیں صحیح الاثر ہیں انکا تو ہم نام بھی نہیں لیتے۔ یورپ میں آجکل جو اتفاق اور جو محبت باہمی ہے وہ ہم ہیں کہاں۔ سارے ہندوستان میں ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا بدقسمت انگریز نہیں ملے گا جو کسی دوسرے انگریز کی شکایت کرنے اور اپنا حال کہے۔ خدا کی پناہ سو میں سے ایک فرد بشر بھی ان خیالات کا مل جائے تو غنیمت ہے۔ سچ کہنے اور صحیح رائے دینے کے واسطے انگریز بل کی قوم تمام عالم میں مشہور ہے۔ نہیں اور ہاں پران کی حکومت ہے۔ اپنے ہاں فرمائیے کتنے اس دل و گردہ کے ہیں ؎

گھٹا نا حوصلہ کا حضرت ناصح کو آتا ہے
کدھر وہ لوگ ہیں جو عاشقوں کا دل بڑھاتے ہیں"

غیرت:۔ کیا خدالگتی کہی ہے۔ اگر ہم میں فیصدی پندرہ بھی انگریزی کیرکٹر کے ہوتے تو ہماری یہ حالت ہی کیوں ہوتی۔ کیسی بدقسمت ہے وہ قوم جو کیرکٹر کے نام سے بھی نا آشنا ہو اور کیسا بے نصیب ہے وہ ملک جو کیرکٹر نرا بے اثر باتوں اور گپوں کا ہی نام رکھتا ہو۔ انگریزوں نے اپنے کیرکٹر اپنے استقلال اپنی محنت اپنی قومی محبت سے ہم پر ثابت کر دیا ہے کہ ان اوصاف میں ہم انکے حاشیہ نشین یا خوشہ چین کہلانے کا بھی فخر نہیں کر سکتے۔

وہ بُت ترسا جو آیا دل ہمارا بڑھ گیا
گھٹ گیا ایمان کعبے سے کلیسا بڑھ گیا"

دل نواز:۔ پھر اس میں انگریزی یا یورپین تہذیب کا کیا قصور۔ یہ تو ہمارے ہی انتخاب کی خرابی اور نقص ہے ؎ از ماست کہ بر ماست"

سوختہ دل "یہ درست ۔ لیکن یہ دعوے کہ یورپین تہذیب ہر پہلو سے ہندوستان کی آب و ہوا کے موافق ہے درست نہیں ۔ جس طرح کہ ہندوستان کی آب و ہوا ہر حیثیت سے انگریزوں کے موافق حال نہیں ۔ انگریزی یا یورپین تہذیب کی بعض باتیں خوش گوار اور خوش آیند معلوم ہوتی ہیں ۔ وہ صرف ایک فریب دِہ جھلک ہے اس میں حیا اور صداقت نہیں ہے نہ ایسی باتیں ہمارے موافق ہیں ۔ یورپین لیڈیاں جو کھلے بندوں بڑی بڑی مجلسوں میں ناچتی ہیں یہ اُن کے ملک کا رواج ہے ۔ جسے وہاں استحسان کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے ۔ لیکن اگر ہندوستان کی بہو بیٹیاں ایسا کریں ۔ تو ٹھیک نہیں ۔ کسی ممبر کونسل نے کہتے ہیں ولایت میں اپنی بیوی نچوائی ۔ سارے ہندوستان میں اس پر پھبتیاں اُڑ رہی ہیں ۔ مانا کہ مسٹر موصوف کے خیال میں یہ فعل بُرا نہ تھا ۔ لیکن اگر وہ یورپین یا عیسائی ہو کر ایسا کرتے تو زیبا بھی تھا ۔ کوئی معترض نہ ہوتا ۔ چونکہ ہندوستانی مسلمان ہونے کی حیثیت سے مسٹر ممدوح نے ایسا کیا ۔ اس واسطے ساری قوم اور سارے ملک میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں

نہ وید اس کو ہوئی مبارک

نہ راس اس کو سنگار آیا"

دل نواز "ہاں ملکی و قومی رواج کے اعتبار سے یہ فعل ان کا کسی حد تک اچھا نہ تھا ۔ لیکن یہ رَو کب تک رُک سکتی ہے ۔ مسرت اور تفریح ایک طبعی ولولہ ہے ۔ جسے کون نہیں چاہتا ۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں بھی گرہستن عورتیں اپنے اپنے گھروں میں ناچتی ہیں ۔ سرحدی علاقوں میں مرد بھی کھٹک کا ناچ ناچتے ہیں ہر ملکے و ہر رسمے ۔ جو لوگ ولایت جاتے ہیں اُن کا اختیار ہے کہ وہاں کے رسم و رواج سے آشنا ہوں ۔ اس میں کوئی الزام نہیں ۔ آخر وہاں کی آب و

ہوا میں بھی تو کوئی جذبِ بادِ اثر ہے۔

دل دیکھے آگیا ترے قابو میں اے صنم

میں اپنے اختیار سے مجبور ہو گیا"

سوختہ دل یہ کیا خوب اس میں بھی انگریزوں سے پھسڈی ہی رہے۔ انگریز تو ہندوستان میں آکر برسوں رہنے پر بھی ہماری اچھی رسموں تک سے مانوس نہیں ہوتے۔ اور ہمارے نوجوان ولایت جاتے ہی وہاں کی اداؤں کا شکار ہو جاتے ہیں

اس کی نخچیر گہ سے روح الامیں

آخر ہو کے شکار نکلے گا"

مانا کہ ناچ اور ناچنا ایک طبعی امر یا موجب مسرت و تفریح ہے۔ لیکن یہ کہاں روا ہے۔ کہ نری تفریح کے واسطے ساری قوم کے خلاف عمل کیا جائے۔ اور بھی بہت سی باتیں طبعی اور مسرت کی ہیں۔ ان سے کیوں احتراز کیا جاتا ہے۔ رواج کی پابندی سے انگریزی عدالتوں میں صدہا مقدمات وراثت کے فیصلہ پاتے ہیں۔ رواج کی حرمت اور توقیر صرف اس واسطے ہے۔ کہ اُسے ایک قوم مانتی ہے۔ قوم کے خلاف بھی بہت سی باتیں کی جاسکتی ہیں۔ لیکن نہ ایسی باتیں جن سے قومیت ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ مانا مذہب اور احکام مذہب کوئی چیز نہیں آخر قومیت تو کوئی شے ہے جس پر آجکل جھوم جھوم کر شب و روز لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ ایسی باتوں سے تو احتراز ضروری ہے۔

دل کو اس دشمن جانی سے لگانا ہی نہ تھا

باتوں پہ اس بت دم باز کے آنا ہی نہ تھا"

غیرت یہ انگریزوں کی قوم میں صدہا باتیں ایسی ہیں جن کی قیمت لگائی ہی نہیں جاسکتی۔ انگریزوں کا استقلال۔ ان کی انصاف پژوہی۔ انکی ہمت۔

انکی صداقت۔ انکی قوم پروری اور قوم شناسی ایسی باتیں ہیں کہ اُن سے ہم آشنا تک نہیں۔ یہ خاک تہذیب ہے کہ مہذب بننے کے واسطے رشتہ قومیت توڑ تاڑ اور باپ دادے کے خون سے روگرداں ہوکر نئی تہذیب کا جامہ پہن لیا۔ ابھی تو ہمیں ان راہوں سے چلنا ہے۔ جو منزلِ مقصود کی راہیں ہیں۔ ان عوارض سے قومیت کب بنتی ہے۔ اور کب اُسے استحکام نصیب ہوتا اور معیار قومیت کب قایم ہوتا اور رہتا ہے۔

تیغ ابرو کے مضامیں ابھی کہنیں ہیں تلاش
راہ چلنی ہے مجھے دھار پہ تلواروں کی ؎

دل نواز یہ میاں رہنے بھی دو کیسی قومیت اور کیسی قوم۔ زندگی کے چار دن خوشی سے گزار لو۔ یورپین قوموں کی یہی فلاسفی ہے۔ خواہ مخواہ کیوں بکھیڑوں میں پڑو۔ کارِ دُنیا کسے تمام نکرد۔ ہماری قومیت ہی کیا۔ ہم تو کبھی کے اُسے رو چکے۔

جیب کیا دامان محشر کی اُڑینگی دھجیاں
ہے یہی عالم جو اپنے پنجۂ چالاک کا ؎

سوختہ دل یہ سو کی ایک کہی۔ اگر آپ ایسے نوجوان رہے تو قومیت کیا قوم پر بھی فاتحہ خیر پڑھ بیٹھیں گے۔ جب قومی کا اندازہ تو آپ کی تقریر سے معلوم ہو ہی گیا۔ بندہ نواز قوم اور قومیت بنانے سے بنتی ہے نکہ باتوں سے۔ چشم بد دور۔ اگر یہی حوصلہ ہے۔ تو ہندوستانیوں کی قومیت بن چکی۔ دیکھیے کسی روز قوم کی ناؤ ڈوب کے رہے گی۔ کیونکہ کوئی قوم اسوقت تک نہیں بنتی جب تک اس میں حمیت اور غیرت نہ ہو۔ غیرت اور حمیت صحیح خون اور صحیح جذبات کے قایم رہنے ہی سے نشو و نما پاتی ہے۔ سلطان عبدالحمید نے ایک دفعہ اپنے کسی وزیر سے کہا تھا کہ ترک نوجوان یورپین عورتوں سے شادیاں کم کرنے

گئے ہیں۔ لیکن اندیشہ ہے کہ انکا خون رنگیک ہوکر حمیت قومی میں فرق نہ آجائے
اب دنیا اس پیشین گوئی کا ظہور دیکھ رہی ہے۔

آخر شب دصال کی جا پیش کی وہی
ہر دن تھا اے فلک مجھے جس رات کا خیال"

دل نواز:۔ یورپین لباس پہننا کوئی گناہ نہیں۔ کوئی عیب نہیں اس سے
قومیت پر کیا حرف آسکتا ہے؟"

فقیر:۔ اسے گناہ اور عیب کہتا ہی کون ہے۔ ایشیائی مذاہب بالخصوص
اسلام نے لباس پر بحث ہی نہیں کی۔ یہ آزادی ہے جو لباس چاہو پہنو۔ لیکن
یہ لباس پہن کر خاندان اور قومیت سے بے لباس نہ ہو جاؤ۔ بہت سے انگریزی
خوان انگریزی ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔ اور انگریزی سوٹ بھی۔ مگر ان کی حمیت قومی
اور غیرت ملکی پورانے لوگوں سے کہیں زیادہ ہے۔

نصیب اہل توکل کو ہے نان خشک بریانی
دل منعم کو ہو وابستگی روغن کے ڈورے سے،

مسلمانوں میں حضرت اقبال اور ہندوؤں میں سرور کو دیکھئے کس خوبی سے
قومی حمیت اور قومی غیرت کے گیت گاتے ہیں حضرت اقبال ولایت بھی
ہو آئے۔ ڈاکٹر بھی ہوئے مگر دل میں وہ اسلامی حب اور اسلامی غیرت
ہے کہ کسی آذر کو کیا ہو گی۔ انکی نظمیں اس پر زبان حال سے شاہد ہیں۔ نظم
شکوہ اور شمع و شاعر کی نسبت چاہے کوئی کچھ کہے۔ ہماری رائے میں انھیں
دو نظموں سے اقبال کی قومی محبت اور دلسوزی کی کیفیت کھلتی اور شہادت ملتی ہے۔

معشوق بے نیاز ہی عاشق کو چاہئے
لب سی کرے جو شکوہ تو دل سی دعا کرے"

دل نواز:۔ یہ نئے فیشن والوں کی تو شکایات ہوئیں۔ انصاف سے یہ بھی کہئے کہ پرانے لوگوں میں کوئی غلطی نہیں۔ منافقت مناقشت مخالفت خودغرضی ان میں بھی ہے۔ کون انسان کون بشر ان باتوں سے خالی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ ہم کسی حد تک زوروں میں اور جولانیوں میں رہتے ہیں۔ جو اس زمانہ کا خاصہ ہے۔ اور وہ لوگ خاموشی سے گزار رہے ہیں۔

زنجیر میں بھی نالۂ زنجیر کی طرح
جوشِ جنوں سے رہتے ہیں جولانیوں میں ہم

سوختہ دل:۔ یہاں فرقہ بندی نہیں۔ دونوں فرقے زیر بحث ہیں۔ پرانوں میں تم سے بھی زیادہ ترفریب دہ خیالات ہیں۔ رونا تو دونوں کا ہے۔ نہ ان میں محبت و دلنوازی اور نہ تم میں۔ اور یہ بھی کہ سارے کے سارے ملزم نہیں بہت سے اچھے اور فخر قوم بھی ہیں۔ برا نہ ماننا خفا نہ ہونا ہماری قوم میں چاہے ہندو ہو چاہے مسلمان جس قدر لغزش بیانی ہے کسی اور قوم میں بھی ہے؟ اور قومیں اس سے پاک صاف نہیں۔ مگر یہاں تو حد ہی ہوگئی ؎

نہ کہہ را منزلت ماندہ نہ مہ را

عدالتوں اور جیلخانوں میں جاکر دیکھو کہ ہماری قیمت کیا پڑتی ہے۔ ڈیر خاموش ہی رہو۔

شراب ہی یہ سمجھ کے پینا خراب کہتا ہے اسکو عالم
کہیں نشہ میں کھلیں نہ جوہر اوہر ہمارے تو ہر تمہارے

دل نواز:۔ کیا دوسری قوموں یا مہذب قوموں میں گناہ اور لغزش نہیں ہے۔ کیا وہ انسانیت سے باہر ہیں تم ان میں بھی دیکھو گے کہ صدہا قسم کے گناہ اور لغزشیں ہیں۔ یہ خوب انصاف ہے کہ اپنوں ہی کو کوستے ہو اور دوسروں پر نظر ہی نہیں۔

نہ چھاڑا غیر کو ہرگز کہ ہو کر جھاڑ لپٹا تھا
مجھی پر گالیوں کا جھاڑ تو نے بد زبان باندھا"

سوختہ دل :- یہ کون کہتا ہے کہ صرف ہم ہی ہیں۔ یہ کمزوریاں اور یہ لغزشیں تو ہر قوم اور ہر گروہ میں پائی جاتی ہیں۔ اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْیَانِ اصل بحث یہ ہے کہ ہمارا کیرکٹر کمزور ہے۔ اور بڑا نقص یہ ہے کہ ہم میں زمانہ کی ضروریات کے مطابق اتفاق نہیں ہے۔ ہندو مسلمانوں میں بات بات پر جو جھگڑے اور تنازعے پائے جاتے ہیں۔ اور پھر ہر دو قوموں کے اندر جو پرخاش پائی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسا نقص ہے جو ترقی کے لئے سخت مانع ہے"

غیرت :- اختلاف رائے تو ہر قوم میں ہوتا ہے۔ اور یہ انسانیت کا خاصہ ہے۔ نہ کوئی بڑا نقص ہے۔ لیکن اختلاف رائے سے عداوت اور دشمنی ہو جانا ایک سخت لغزش ہے۔ اگر واقعی اختلاف رائے ہی موجب کاوش ہو سکتا ہے۔ تو پھر خود انسان اپنی ذات سے بھی عداوت کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیالات بھی اُلٹتے بدلتے رہتے ہیں۔ اختلاف خیالات سے کسی قوم کی حالت نہیں بدلتی۔ ذاتیات کی بحث سے خرابی آتی ہے۔

خوب رو وہ ہے جس کی خواہش میں
شمع صورت حرام ہوتی ہے"

سوختہ دل :- واقعی ہم میں سے خلوص اڑ گیا ہے۔ سچی ہمدردی جاتی رہی ہے۔ خود غرضی کا بہت کچھ زور ہے"

غیرت :- خود غرضی سے بھی کوئی قوم خالی نہیں۔ مگر مشترکہ کاموں میں جو خلوص اور جو ہمدردی بعض اقوام میں پائی جاتی ہے وہی انکی ترقی کا باعث ہے

ہفتاد و دو طریق حسد کے عدو سبھی ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں"

سوختہ دل :۔ یہ کتنی بڑی کمی ہے۔ کہ ہم میں اُمنگ اور تفریح باقی ہی نہیں رہی جسے دیکھو کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ چہرہ پر رونق ہی نہیں۔ اس کا موجب بھی یہی ہے کہ ہم میں خلوص نہیں رہا۔

عشق نے خوار و ذلیل کیا ہم سر کو پھکیرے پھرتے ہیں
سوز و درونِ داغ الم سب دل کو گھیرے پھرتے ہیں "

غیرت :۔ بیشک ہم میں نکتہ چینی بہت ہے اور بدظنی کثرت سے۔ بیجا نکتہ چینی اور ناواجب بدظنی انسانی زندگی کے واسطے قرار واقعی ایک مصیبت ہے۔ ایسی مصیبت جو ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے۔ ہم میں سے چاہے کوئی کیسی ہی نیک نیتی سے کام کرے دوسرے بھائی بند ضرور ہی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان نکتہ چینوں کے باعث ہم ہمیشہ ایک کش مکش میں رہتے ہیں۔ اور زندگی قلق و اضطراب میں گزرتی ہے۔

مر کر بھی ہمارا دل بیتاب نہ ٹھہرا
کشتہ بھی ہوا تو بھی یہ سیماب نہ ٹھہرا "

فقیر :۔ نکتہ چینی بھی جو نیک نیتی سے کی جائے نیکی کا حکم رکھتی ہے غضب تو یہ ہے کہ محض ضد اور ہٹ سے ایسی نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں جن کی غرض سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتی۔ کہ دوسروں کا محض رشک و حسد کے ذریعہ سے دل جلایا جائے۔ اور زندگانی ایک مشغلہ میں گزرے۔

اس سے گلہ کیا کبھی اس سے گلہ کیا
اوقات یونہی شکوہ گزاری میں کٹ گئی "

دل نواز :۔ یہ باتیں انگریزوں میں کہاں ہیں!"

سوختہ دل :۔ ہیں تو کچھ کچھ ان میں بھی۔ لیکن ان کا مضبوط کریکٹر ان

کمزوریوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ اور انکی زندگی بہ نسبت ہمارے ایک خوبصورتی سے گذرتی ہے۔"

غیرت یہ تفریح اگرچہ انسان کی زندگی کا لازمہ ہے۔ لیکن اس طریق سے نہ ہو۔ کہ مذہبی قیود اور سوشیل شرائط کا بالکل خاتمہ ہی کر دیا جائے۔ اخلاقی حکومت بھی باقی رہنی چاہئے اور معیار قومیت بھی قایم۔ ایشیا والوں کی ہن میں حرمت اور عزت ہے۔ گو اس میں تکلیف ہی ہو۔ لیکن انجام اس کا اچھا اور مبارک ہے ؎

سو بار جسے عشق میں ذلت نہیں ملتی
ارباب وفا میں اُسے عزت نہیں ملتی"

فقیر وہ جسے اس دنیا میں ایک دو بھی صادق دوست حاصل ہیں۔ وہ معیار قومیت کے لحاظ سے بہشت میں رہتا ہے۔ باقی ہوس ؎

عشق نے وہ گنج استغنا دیا مرزا ہمیں
جس نے مٹی کر دیا آگے میرے اکسیر کو"

(خان بہادر) مرزا سلطان احمد

غیر سے ملتے ہو تم میرے جلانے کے لئے
کس سے سیکھے ہیں یہ انداز و چلن تم نے کبے
تیری آنکھوں کو جو دیکھیں تو کھڑے رہ جائیں
چوکڑی بھول کے بن جائیں ہرن پتھر کے

ساغر اکبر آبادی

انسان اپنے عالمِ جذبات میں

"وہ دیکھو ناقوسِ کلیسا کی دردناک اور ماتمی آواز اختتامِ روز کی خبر دے رہی ہے۔ تھکے ہوئے
مویشی پیچدار راستوں سے ہوکر سر جھکائے ہوئے چراگاہ سے گاؤں کی طرف لوٹ
رہے ہیں۔ کسان ادھر ادھر آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں
اور سبھوں نے دنیا کو میرے اور تنہائی اور تاریکی کے اوپر چھوڑ دیا ہے" (گرے)

انسانی زندگی ایک لامتناہی سمندر کی مانند ہے۔ اُس کی اُمنگ اور اس کے ولولے مدوجزر ہیں۔ جو اس کی حالت اور اس کی کیفیت میں اُتار چڑھاؤ یعنی انقلاب پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس کے خیالات اس کے جوش جذبات موسمی ہوائیں ہیں جو کبھی سرسبزی اور شادابی پھیلاتی ہیں۔ اور کبھی بادِ صرصر و سموم کی مانند اس کے دل و دماغ میں ناامیدیوں، حسرتوں، ہجوم یاس کی مدد سے ایک پژمردگی اور ایک افسردگی پیدا کر دیتی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی انسانی سمندر میں طوفان بھی آتے ہیں۔ جو اس کی امیدوں۔ اس کی تمام آرزوں اور تمناؤں کے جہازوں بادبانوں اور کشتیوں کو ناکامی اور نامرادی کے چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر چکنا چور کر دیتے ہیں

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

موجودہ زمانہ کے مادہ پرست چاہے اسے کچھ ہی کہیں۔ اور دماغی کمزوری یا تخیل سے تشبیہ دیں۔ لیکن یہ واقعات ہیں جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ایک شخص ابھی کچھ ہے اور ابھی کچھ۔ ابھی تو ہمارے خیالات میں پاکیزگی۔ پاکبازی سلامتی۔ سلامت روی کی ایسی لہریں اُٹھ رہی ہیں جن کی صفائی شفافی اور آبداری

دیکھ کر ایک دفعہ کوثر و سلسبیل میں وضو بنانے والے ملاءِ اعلیٰ بھی چاہتے ہیں۔ کہ اس سے مستفید ہوں اور اس کے فیض سے محروم نہ رہ جائیں۔ ہاں ہاں ہمارے بڑھے ہوئے خیالات تقدس۔ زہد و تقوے پر فرشتوں کو بھی رشک آتا ہے مگر آہ یہ حالت دیر تک قایم نہیں رہتی۔ اور ہم پستی پست خیالی کی ایسی تیرہ و تار بھول بھلیاں میں جا پھنستے ہیں۔ جہاں سے نکلنا تو در کنار نکلنے کا خیال بھی کوسوں دور ہوتا ہے۔

انسان جب تمام دنیا سے ہاتھ اٹھا کر عالم تنہائی کا ایک گوشہ پسند کر لیتا ہے۔ کیا وہ اسوقت اکیلا ہوتا ہے۔ نہیں نہیں۔ جوش جذبات و فور خیالات کا ایک مینا بازار اس کے اردگرد لگا ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی خیالی اشیا کو ترتیب دیکر ایک دوکان سے دوسری دوکان میں لیجاتا ہے۔ اور ایک مقام کو سنسان اور دوسرے کو گلستان بناتا ہے۔

دنیا والے اسے تنہا سمجھکر اس پر افسوس کرتے ہیں۔ مگر وہ ایک خندۂ بیجا۔ ایک تبسم زیر لب سے سب کا جواب دیتا ہے۔ اور زبان حال سے سمجھا دیتا ہے۔ کہ ہم تنہا نہیں بلکہ خیالات کا ایک شہر ہے جو ہمارے گرد بسا ہوا ہے جس میں کبھی تو ناامیدی کا طاعون اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اور کبھی حسرت و یاس کی وبا اپنا رنگ جماتی ہے۔ مگر پھر امید مسیحائی کرتی اور حضرت عشق افلاطون و جالینوس بنکر تمام خرابیوں کو دور کر دیتے ہیں ؎

حیف ازاں روزے کہ در وعشق را لذت نبود
حبذا وقتے کزو سرشار مے آئیم ما!

کیا اچھی وہ گھڑی ہے۔ اور کتنی مبارک وہ ساعت جس میں انسان تمام عالم سے الگ تھلگ ایک دوسری ہی دنیا میں جا بیٹھتا ہے۔ وہ ایک ہی وقت

میں ڈیوجانس کلبی بھی ہے۔ سکندر اعظم بھی جولیس سیزر بھی۔ سسرو بھی۔ خود ہی نپولین بنتا ہے اور خود ہی قانون نپولین۔ کبھی ولنگٹن بنکر واٹرلو میں بلوچر کا انتظار دیکھتا ہے۔ اور کبھی بلر وقون جہاز پر سوار دنیا سے قطع تعلق نظر آتا ہے۔ ابھی ابھی وہ میزینی اور گریبالڈی کی سیف و قلم بنا اور آنا فاناً پانسہ پلٹا۔ اب ہم اُسے غازی انور بے اور شیخ سنوسی کے ساتھ ہمنوائی کرتا دیکھتے ہیں۔ ہاں ہاں وہی ہے جو نوجوان قوم کے ساتھ ٹرکی کی حمایت میں لذاتِ دنیا اپنے اوپر حرام کئے ہوئے نظر آتا ہے۔ اور وہی ہے جو اخباری دنیا میں شور مچانے لگا۔ کہ ٹرکی کی حمایت خلاف وفاداری ہے۔ مگر سچ پوچھو تو یہ وہی ہے جو اب سے چند منٹ یا سکنڈ پہلے تھا ع

سینہ میں قلزم کو رکھ قطرہ کا قطرہ ہا
بل بے سمائی تیری او رے سمندر کے چور

یہ تو ایک طرف سب سے زیادہ دلکش اور موثر وہ زمانہ ہوتا ہے جب کوئی بھولا واقعہ یاد آ آ کر دل میں ایک ٹیس پیدا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں زبردست شاعر تھا۔ فلاں ملک الشعرا تھا۔ مگر سچ یوں ہے کہ ہر انسان کی زندگی ایک شاعری ہے۔ اس کے کارنامۂ زندگی قصائد ہیں جن کی مضمون آفرینی اور معنی پروری کا سلسلہ ان دعاؤں پر ختم ہوتا ہے جنھیں ہم لوگ "موت" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان قصائد کی تشبیب ہمارے جذبات ہیں جو خدا جانے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچاتے اور کس مقام سے کس مقام پر لا ڈالتے ہیں۔ ابھی ہم کسی لعبت طناز کے مصحف رخسار کی تلاوت میں محو تھے کہ کسی پہلے ہمنشیں کی یاد نے ٹھونکے دے دے کر چھین کیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے طبیعت میں سوز پیدا ہوا۔ اور ہم درد دل کی مثنوی لے بیٹھے۔ پرانے شکوے

شکایتوں کے دفتر کھل گئے جن کا فوری اثر یہ پڑا کہ پچھلے زخم جو اب انگور ہو گئے تھے
ہنس پڑے۔ اور ہم اُنکی دلجوئی اور دلداری میں مصروف ہو گئے۔ کتنی راتیں۔ کتنی
راتوں کے پچھلے پہرے بچھونوں پر کروٹیں بدل بدل کر کاٹے گئے ہیں۔ آہ کتنے
گل تکئے آنسوؤں کی نذر ہو کر تربتر ہو گئے ہیں۔ مگر اپنا ٹوٹا ہوا گداز ہے کہ پکار
پکار کر کہہ رہا ہے ؎

پشتہ نہیں کہ چرخ کا لے عرش سنبھال
اُمڈے گا مری چشم کا دریا ابھی کچھ اور

کہاں ہیں وہ لوگ جو بزم طرب کے لئے جشن جمشیدی کا سامان کرتے ہیں
اے انجمن دنیا کے دلدادہ اصحاب! آؤ اور ذرا اس تنہائی پسند کے بوستانِ
خیال کی سیر کرو۔ تم کو معلوم ہو گا کہ یہ سناٹا نہیں ہے۔ ویرانہ نہیں ہے۔ بلکہ
ہزاروں حسرتیں لاکھوں تمنائیں۔ کروڑوں آرزوئیں ہیں جو ایک پژمردہ دل پریشان
دل۔ دنیا سے متنفر دل کے گرد صف ماتمی بچھائے ہوئے ایک طرف
سینہ کوبی میں مصروف ہیں۔ اور ایک جانب خوشی اور خرمی کے ڈیرے لگے ہوئے
ہیں۔ وہ عزلت اور تنہائی کا متوالا کبھی دائیں دیکھتا ہے کبھی بائیں۔ اور ایک
سکنڈ میں اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ بند قبا ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اس حالت
کو سکنڈ کا سواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی گذرنے نہیں پاتا کہ ایک آہ۔ ایک
ٹھنڈی سانس آکر بالکل غائب کر دیتی ہے۔ اور یاس و حرمان کی مجسم تصویر
بن جاتا ہے۔

انگریزی فلسفیوں میں "جھونپڑے کی خوشیاں" ضرب المثل ہیں۔ کاش
انھیں اس انجمن در خلوت کے مزے معلوم ہوتے۔ تو وہ تقریباً کل جھونپڑوں
میں آگ لگا دیتے۔ اور تمام ظاہری خوشیوں سے الگ تھلگ ایک ایسی جا

میں آ رہتے ۔جہاں کی سدا بہار چمن آرائی سب کو تھوڑی دیر کے لئے اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے ۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کونسی ایسی بات ہے جس سے یہ گوشۂ تنہائی کے متوالے اپنی دنیا الگ بنائے سب سے کنارے پڑے ہوئے ہیں ۔اور وہ کونسا نشہ ہے ۔جو انھیں اپنے ہم جنسوں چرندوں پرندوں کی ہمنشینی سے مستغنی بنائے ہوئے اس درجہ مسرور کر رہا ہے ۔اس کا جواب ماہران سیاست مدن و علم الارض تو یہ دینگے ۔کہ انسان اوائل زمانہ میں تنہا تھا ۔سوسائٹی سے واقف بھی نہ تھا ۔اس کی یہ خصلت اس کی اولاد میں اب تک باقی ہے ۔اور تعلیم و ترقی نے اس کے شوق تنہائی کو غور و خوض سے بدل دیا ہے ۔لیکن کیا یہ جواب ٹھیک اور دل لگتا ہوا ہے ۔اور خاصکر ان لوگوں کو تسلیم بھی ہے جن کے معتد بہ اوقات ایسے ہجوم خیالات میں گزرتے ہیں ۔اور جو ہزار سوسائٹیوں جلسوں اور انجمنوں پر اپنی ایک سکنڈ کی آزاد تنہائی کو ترجیح دیتے ہیں ۔

حافظ ایں قصہ دراز است بقرآں کہ مپرس

قمر احمد بی ۔اے ۔(علیگ)

معاملہ کے اشعار

حسن دنیا کا بہت قصہ ہے طول	آدمی کو صبر تھوڑا چاہیئے
ترک لذت بھی نہیں لذت سے کم	کچھ مزہ اس کا بھی چکھا چاہیئے
ہے مزاج اس کا بہت نازک امیر	ضبط اظہار تمنا چاہیئے

(امیر مینائی)

رِستا نہیں یہ آبلہ دل کا	عشق کا پانی بھرتا ہے

سگرٹ اور پان کا مناظرہ

لیمپ کی روشنی ہو رہی ہے۔ چار احباب اکٹھے ہیں۔ فرصت کا وقت ہے۔ اور کاروبار سے نبٹ چکے ہیں۔ آپس میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ نئی اور پرانی روشنی کا غلا ملا ہے۔ اس لئے کہیں کوٹ پتلون کی استری کا سین ہے۔ اور کہیں شلواروں کا خوشگوار منظر۔ کرسیوں کے بیچ میں میز رکھی ہے جس پر ایک طرف سگرٹ اپنی سیاہ و سفید رنگت پر ناز کر رہا ہے۔ ایک طرف پان کی تھالی جگمگا رہی ہے۔ جس میں سرخ رنگ کی سرسبزی نظر آتی ہے۔ رفتہ رفتہ سگریٹ دم میں آگیا۔ اور پان کی طرف بہت گھور کر دیکھا۔

سگرٹ:۔ کسقدر بدتمیز رکیک۔ کیسا کثیف جسم پایا ہے دیکھکر جی گھبراتا ہے۔ دانتوں کا نقصان۔ کپڑوں کا زیاں ٹکوں کی بربادی۔ زمانہ کا متروک پھر یہ پان میری مجلس میں کیوں مخل ہوتا ہے۔"

پان:۔ ارے ذو دستے میرے منہ نہ لگ۔ کور چشم میں حسن زیبا ہوں۔ چہرہ کی رنگت مجھ سے بنتی ہے۔ معشوقوں کا سنگھار مجھ سے ہوتا ہے۔ زمانہ دیدہ شاہوں کی مجلس کا مصاحب رہ چکا ہوں۔ آج بھی میرے چاہنے والوں کو میری چاہ ہے۔ میں دل خوش کرتا ہوں۔ مجھ سے غم غلط ہوتا ہے۔ نادان تیرا ظاہر اَور ہے باطن اَور۔ اوپر سے لفافہ ہے اندر سیاہی سے تاریک ہے۔ ننھے کلیجوں کو جلاتا ہے نیند اچاٹنے والا اسل اور دق کی بیماریوں کا شکار بنتا ہے۔"

سگرٹ:۔ منافس کے ٹکے ہیں اسوقت ہفت اقلیم کا سہرا ہوں۔ ایران میں ہوں توران میں ہوں انگلستان میں ہندوستان میں ہوں۔ سیاح ہوں

کوسوں تک پیاس بجھاتا ہوں۔ دور دور کے خریدار مجھے ہاتھوں ہاتھ مول لیتے ہیں تو ہندوستان کے سنسان جنگل سے نکلتا ہے۔ اور پانی کے سہارے سہارے کچھ دیر تک زندہ رہکر مرجاتا ہے۔ میں اگر نقصان دیتا ہوں تو میری پشت پناہ ہزاروں ڈاکٹر ہیں جو مجھ میں رنگ آمیزیاں کرتے اور حفظان صحت کا وسیلہ بتانیکی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دماغ کا بخار نکالتا ہوں۔ معدہ کو صاف کرتا ہوں۔ میزوں اور کرسیوں پر بیٹھتا ہوں۔ مہذب سوسائٹی میں لوگ مجھے قدردانی کے ساتھ جگہ دیتے ہیں۔ میرا عروج میرا مرتبہ میرا اعزوجاہ میرے خریداروں سے پوچھ۔ میں جہاں گرتا ہوں گل ہوجاتا ہوں۔ جہاں اُڑتا ہوں پھول ہوجاتا ہوں میری خوشبو سے محفل مہک جاتی ہے مجھ سے نفرت کرنیوالے کم ہیں۔ تو اپنا حال سقیم دیکھ۔ ناکارہ دیسی اور معمولی طبقے کے لوگ تجھے منہ لگاتے ہیں زمین پر گرتا ہے تو زمین فریاد کرتی ہے برتن پر گرتا ہے تو نوکر لعنت پڑھتے ہیں۔"

پان "اپنے منہ میاں مٹھو۔ اپنا سوز دیکھ ہر محفل میں جلایا جاتا ہے۔ خاک کیا جاتا ہے۔ بیچیا اس ناقدری پر اتراتا ہے۔ تجھے منہ لگانیوالوں کے منہ میں لو آتی ہے ساری محفل تجھ سے سڑ جاتی ہے۔ دماغی امراض کا تو پلیگ ہے۔ معدہ کو ضعیف کردیتا ہے۔ تیرے دلدادہ اپنی بری عادت کے خوگر ہوکر شرماتے ہیں۔ ڈاکٹر تجھے ہلاکت کا نسخہ بتاتے ہیں۔ تجھے پینے والوں کی جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ افیون مدک۔ چنڈو کی طرح تیرا داغ دیکھ دیکھ کر تجھیر ترک استعمال کا فتوے لگاتے ہیں۔ تو تجربہ کاروں سے چوروں کی طرح تھراتا ہے تیرا داؤ اسکول اور کالجوں کے بچوں پر چل جاتا ہے معصوموں کو تباہ کرنا تندرستی کو برباد کرنا تیرا شیوہ ہے۔ میں آج بھی گو خانہ نشین ہوں مگر میری خشک شاخیں عرب و عجم تک لیجاتے ہیں۔ شادی بیاہ کا سنگھار مجھ سے ہوتا ہے۔ جو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں اس کے ساتھ

گھُل گھُل کے اپنا جان نثارانہ خون قربان کردیتا ہوں مجھ سے وفاداری کا نام روشن ہے۔ میں صرف قدردانوں کے ہاتھوں میں رہتا ہوں۔ اور ان کا ہی گن گاتا ہوں"

سیگرٹ "تجھے عقلمند کب منہ لگاتے ہیں۔ تو یورپ میں کہاں پہنچتا ہے۔ تو کسی ٹون ہال میں کب دکھائی دیتا ہے۔ جنگلوں میں تیرا گذر کہاں ہوتا ہے۔ تو ایک درخت کا معمولی پتہ ہے۔ نہ معلوم تیرے دماغ میں اس قدر غرور کیوں ہے اور اتنا کیوں اتراتا ہے"

پان "صاحبزادے تم میرے سامنے کے شیرخوار ہو تمہیں میری حقیقت کیا معلوم۔ میں عالم کا مقیاس عمل ہوں۔ میں زمانہ کی دوا ہوں۔ میری ضرورت دنیا میں عالم کی ضرورتوں سے بہت زیادہ ہے۔ مجھے باقاعدہ استعمال کرنیوالے میرے اکسیری خواص دیکھ دیکھ کر مجھپر شیفتہ ہیں۔ مجھے دیکھنا ہے تو مشرق کے اُجالے میں دیکھ۔ ویدک میں دیکھ۔ ارسطو کے اقوال میں دیکھ۔ مجھ سے پہلے دنیا میں اندھا دُھند تھا۔ یہ میرا ہی دم خم ہے کہ اتنے بڑے سطح گردوں کو روکے ہوئے ہوں۔ اور دنیا پر اپنی جان کو قربان کرکے لاکھوں بلاؤں سے نجات دیتا ہوں۔ میں جہاں ہوں وہاں بھی اور جہاں نہیں وہاں بھی میرا ہی بول بالا ہے۔ مجھکو جو نہیں پوچھتے انکی آنکھوں میں بھی میرا ہی اجالا ہے۔ ہندوستان میں پتہ کی شکل میں ہوں تو انگلستان کی رنگارنگ پیالیوں میں میرا جلوہ مستانہ ہے۔ کہیں سبز ہوں کہیں سرخ ہوں۔ کہیں گہرا ہوں۔ کہیں ہلکا ہوں۔ کہیں میری سفیدی سے اُجالا ہے۔ مجھے بڑے بڑے حکیموں نے نازوں سے پالا ہے۔ سُن۔ میں تجھے اپنی داستان سناؤں

دنیا کا نظم آفتاب کے دور دسکون پر ہے۔ دن میں کچھ ساعتیں ایسی آتی ہیں جن میں آفتاب عالم کے خطوط کا زاویہ چھوڑ دیتا ہے۔ ناداں اسی سے یہ لوند

کا مہینہ نکلتا ہے۔ اتنے سے سکون میں کارخانۂ قدرت کے لاکھوں نقصان ہو جاتے ہیں۔ اجسام میں کثافت۔ خون میں رطوبت۔ جسم میں کدورت۔ دماغ میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ متقدمین حکما نے خون کا دور قایم کرنے کے لئے بڑی بڑی کوششیں کیں۔ مگر قدرت کا نظام بدلنا ان کے اختیار میں نہ تھا۔ نظم قدیر نے مجھے اس کا منتظم بنایا اور میرے خواص میں دماغ صرف کر کے ہندوستان کے سبزہ زار کو مجھ سے شاداب کیا۔ ارسطو کے دارالکونہ میں میرا ذکر ہے۔ سحاب الہویہ الہندیہ الی المقلوب الشمس کے نام سے مجھے یونانی پکارتے ہیں۔ اوقات شمسیہ میں میں ہی وہ جادو کا پتلا ہوں جو خون کے دور کو متحرک رکھتا ہوں۔ میرا ہی وجود ہے جو دنیا میں دور کو قایم رکھنے میں اپنا آپ نظیر ہے۔ میں جسم میں پہنچنے کے بعد حرارت عزیزی کا انعاش کرنا شروع کر دیتا ہوں۔ میرا دور کم از کم چھ گھنٹے تک رہتا ہے۔ سونے میں مجھ میں بیداری کی حالت سے زیادہ قوت ہوتی ہے۔ اور بارہ گھنٹے تک میں چکر کرتا رہتا ہوں گویا میں بستی جسم کا ایسا پاسبان ہوں کہ تمام اخلاط کی محافظت میں پوری قدرت رکھتا ہوں۔ پھر میں مشیت کی مصاحبت کی قابلیت میں اپنے ہمنشیں ایسے رکھتا ہوں جو مجھ سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ اور اپنا کام [illegible] خوبی سے انجام دیتے رہتے ہیں۔ میرا پہلا جزو چونا ہے۔ جو میری رگوں پر جمکر میرے جگری عیوب کو پاک کر دیتا ہے۔ عنفوان حرارت میں اس کا اثر جیسا کچھ ہوگا کسی طبیب سے جا کر پوچھے۔ چونا کس قدر اکال تھا۔ اور اس کا طبعی نقص مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میں جامع کمال طب کی کتابوں کو عرصہ تک الٹ پلٹ کرتا رہا۔ آخر اس کا حریف کتھا میں نے ایجاد کیا۔ دونوں احبا کی ملت سے میرے نسخہ صحت میں ترکیب مساوی پیدا ہوئی۔ ترکیب کے جوہر میں میں نے اخلاط اربعہ کی جامعیت پیدا کرنے کے لئے چھالیہ ملائی۔ اور اب میں وہ جوہر مرکب ہو گیا کہ زمانہ مجھپر ناز کرے۔ تو میری سرخی پر تمیز

کا الزام لگاتا ہے۔ یہ سرخی تیری آنکھوں میں چاہے خیرہ نظری کا مرض پیدا کرتی ہو۔ مگر میں سراسر دم لطیف ہوں۔ جسم میں جاکر میں فضلہ نہیں رہتا۔ بلکہ بجنسہٖ مستقیم خون میں جاملتا ہوں۔ اور خون ہوجاتا ہوں۔ یقین نہ آئے تو دیکھ کالید سومن ویدک کی کتاب جس کو اقتباساً ارسطو نے اندر و ماجس سے نقل کیا ہے۔ اندروماجس وہ علامہ محقق ہے جس نے ویدکی ایجادات کا اقتباس کیا ہے۔ جالینوس اور ارسطو وغیرہ اس کی قابلیت کے قایل ہیں۔ میں بھی اسی کی جودت طبع کا نتیجہ ہوں۔ میرا مدمقابل اگر کوئی ہے۔ تو یورپ میں چار ہے۔ میرے اور اس کے افعال وخواص ایک بنیاد پر ہیں شیمس نہاری میں اس کی ایجاد ہے۔ اس ہی خط سے استفراغ کے لئے ارسطو نے پیدا کی ہے۔ غرض یورپ میں میرا نام چار ہے تو ہندوستان میں پان۔ ربع مسکوں ہم دونوں سے مسخر ہے۔ اور ہم روحانیت کے استاد ہیں۔ ہمارے استعمال کی غلطی اگر کسی کو نقصان دے تو ہم اس کے ذمہ وار نہیں۔ ورنہ جس طرح چاء معتدل القوام بے جوش صرف آثار حرارت کیساتھ استعمال کرنا کسی نوع بشر کو مضر افعال طبعیہ نہیں ہے اسی طرح میں بھی فضلہ کے اوفاع کے بعد کسی جسم کا نقصان دہ نہیں ہوں۔ مجھ سے نقصان وہ لوگ اُٹھاتے ہیں جو میرا فضلہ بھی مارے خست کے نگلجاتے ہیں۔ ورنہ میں اتنا نازک تن ہوں کہ پہنچتے ہی خون کی پچکاریاں بن جاتا ہوں۔ میرا عرق لبکر فضلہ تھوک دینے والے میرے لطف ترتیب سے اپنے جسم کی رنگت دیکھکر خوش ہوتے ہیں۔

میری کثرت کا نقصان بیوقوف میری طبعیت کا جوہر نہیں۔ بلکہ انسان اپنی قوت سے زیادہ مقویات کا جب استعمال کرتا ہے نقصان اُٹھاتا ہے۔ کیا تونے ایسا دیکھا ہے کہ زیادہ قوی دوا قدر تعین سے زیادہ استعمال کرنے سے نقصان نہیں دیتی۔ لوگوں نے میرے ساتھ جب سے تجھکو پایتر ے جیسے

جوہر کو شامل کر لیا ہے علت ہو گیا ہوں ۔ ورنہ میری ذات میں کسی کے پیچھے پڑنے کی عادت نہیں جس نے منہ لگایا اس کے ساتھ ہو لیا جس نے کبیدگی کی حسن مجلس بتا رہا۔ رکھے رکھے عمر طبعی ختم کر کے نظروں نظروں میں گھلا جاتا ہوں ۔ گویا شمع صفت ہوں جو جلے اور آواز بھی نہ دے۔ تیری طرح بدلگام نہیں ہوں۔ جو اژدہے کی طرح زبان نکال نکال کر کھانے کو دوڑوں +

حکیم سید سلیم (ایم۔اے) سند یافتہ طبیہ کالج قسطنطنیہ

غزل

تیرِ نظر نے ان کے اگر کچھ ذرا کہا — بہلا کے زخمِ دل نے وہیں مرحبا کہا

جب رو کے ہم نے حالِ دلِ مبتلا کہا — ظالم نے سر ہلا کے فقط ہاں سنا کہا

تجھ سے ہزار بار کہا دل کا مدعا — اک دن بھی تو نے اس سے نہ بادِ صبا کہا

کس بھولے پن سے پوچھتے ہیں مجھ سے وہ وصل میں — کس واسطے رقیب کو تم نے برا کہا

بولے سوالِ وصل پہ تلوار کھینچ کر — کہئے تو آپ نے یہ ابھی مجھ سے کیا کہا

کہتا ہے نامہ بر کہ بگڑنے سے فائدہ — ہم نے تو اُن کے منہ سے جو کچھ سنا کہا

ذلت کی کوئی حد بھی ہے ظالم خدا سے ڈر — تو نے عدو کے سامنے مجھ کو برا کہا

دل کا خیال لو سے ناصح کی رائے اور — اس سوچ میں ہوں مان لوں کس کا درست کہا

صادق ہزاروں مر گئے اُس بت کی چاہ میں

ناداں دیکھ مان خدارا مرا کہا

منشی محمد عبدالغنی صادق۔ مارہروی

دیہاتی اور شہری زندگی

دیہاتی اور شہری زندگی کا مبحث درحقیقت نہایت ہی دلچسپ اور عجیب وغریب ہے۔ اس پر اکثر مشرقی اور مغربی مصنفوں نے اپنے خیال و مذاق کے موافق بڑے بڑے دلچسپ مضامین لکھے ہیں۔ جن کا ماحصل یہ ہے۔ کہ ایک سادہ یعنی دیہاتی زندگی کو پر تکلف یعنی شہری زندگی پر اس طور پر ترجیح ہے۔ یورپ میں اکثر اور ایشیا کے بعض بعض ممالک کے سادگی پسند لوگ دیہاتی زندگی کے نہایت شایق۔ دلدادہ اور مداح رہے ہیں۔ ان لوگوں کا مذاق اصلی یہ رہا ہے۔ کہ ہر ایک شے کا استعمال اس طرح کیا جائے۔ کہ اس کی اصلی کیفیت اور تاثیر مفقود نہ ہو۔ اور ہر ایک نظارہ کا اسکی اصلی اور نیچرل یعنی قدرتی حالت میں مشاہدہ کیا جائے۔ اور اسمیں بھی کچھ شک نہیں۔ کہ تکلفات سے جس پر شہری زندگی کا دارومدار ہے۔ ہر ایک شے کی اصلیت اور اس کی نیچرل خوبی بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ مگر یہ ضرور کہنا پڑتا ہے۔ کہ ایسی اصلاحات کے جس سے کسی شے کی اصلیت اور اس کی تاثیرات کایا پلٹ نہ ہوں طرز زندگی میں داخل کرنیکا کچھ مضائقہ نہیں۔

دیہاتی زندگی نہایت سادہ اور اس کا سامان اور لوازمہ معاشرت نہایت چھوٹے پیمانے پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیہاتیوں کو اصلی خوشی کے جس سے مراد حقیقی اطمینان قلب ہے حاصل کرنے کے لئے نہ کچھ زیادہ سامان اور اسباب کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ بڑی جدوجہد کی حاجت۔ کھانے میں اگر ان کو بجائے خشک روٹی کے تھوڑا سا گھی ملجائے یا قدرے دال بہم پہنچ جائے۔ تو

وہ معمول سے زیادہ خوش ہو جاتے ہیں۔ پوشش میں بجائے گاڑھے کے اگر لٹھا ململ مل جائے۔ تو وہ اُس کو باغنیمت سمجھتے ہیں۔ رہائش کے لئے اگر بجائے چھپر کے کچا مکان ملجائے۔ تو وہ اُس کو شاہی محل خیال کرتے ہیں۔ گویا ان کی زندگیاں قناعت میں اطمینان وراحت پاتی ہیں۔ لیکن اگر ایک شہری کو یہ سامان جس کو ایک دیہاتی نہایت خوشی کی نظروں سے دیکھتا ہے ملے۔ تو وہ اس کو اپنے لئے ایک نہایت مصیبت اور عسرت کی زندگی خیال کرے گا۔ انواع واقسام کے کھانوں سے بھی ایک شہری جیسا کہ چاہیئے خوش نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح اس کو اعلیٰ سے اعلےٰ لباس اور عمدہ سے عمدہ مکان کی تلاش رہتی ہے۔ اور چونکہ شہری زندگی میں ایک بڑے پیمانہ پر سامان زندگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ایک شہری کو اس وجہ سے کہ ہر ایک شخص کو اس کی خواہش کیمطابق سامان بہم نہیں پہنچ سکتا۔ سچی خوشی اور اطمینان حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک دیہاتی سادہ زندگی بسر کرنیوالا جو کچھ قدرتی نظارے اور عجائبات عالم اپنے گھر سے باہر جنگل اور کھیتوں میں بلاتکلف دیکھتا ہے۔ اور تازہ ہوا کھا کھا کر خوش ہوتا ہے وہ ایک شہری امیر کو باوجودیکہ اس کے پاس عمدہ عمدہ مکانات اور باغات بھی ہوں میسر نہیں ہو سکتے۔ قدرتی کیفیات اور جذبات جو انسان کی زندگی کی حقیقی آرائشیں ہیں ایک دیہاتی کو بلاجدوجہد حاصل ہوتی ہیں۔ مگر شہری کو باوجود تلاش کے خواب میں بھی نصیب نہیں ہوتیں۔ قدرت دیہاتی کے لئے اور دیہاتی قدرت کے لئے ہے۔ ایک شہری کو یہ بات کہاں نصیب!۔

ہندوستان اور اس کے مشہور مقامات دہلی۔ لکھنؤ وغیرہ میں جو صدیوں سے مرکز علم۔ تہذیب اور شائستگی رہے ہیں۔ ایک پرتکلف زندگی کو سادہ زندگی پر ترجیح دیجاتی ہے۔ اور یہ ایک بڑا نقص ہے۔ یہ لوگ سادہ زندگی کی بالکل

قدر نہیں کرتے۔ اور اس کو نہایت تحقیر کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ ان تمام خوبیوں کا جو ایک سادہ اور دیہاتی زندگی کے طفیل حاصل ہو سکتی ہیں۔ صحیح اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ ہر ایک شے جو ان کے مذاق کے موافق ان کے سامنے آتی ہے۔ خواہ وہ آرائش کی ہو یا کھانے پینے کی۔ وہ تکلفات یعنی تصنع سے مزین ہوتی ہے۔ گویا اس کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ اس کی اصلی ماہیت اور اصلی خوبی اس سے مفقود ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کو ان کی اس پر تکلف زندگی نے اُن تمام قدرتی عجائبات کے نظاروں اور فائدوں سے محروم کر دیا ہے۔ جو دیہات اور ان کے گرد و نواح کے میدانوں اور جنگلوں میں عام طور سے نظر آتے ہیں اور جن سے ایک محقق بڑے بڑے نتائج پیدا کرتا ہے۔

صبح و شام کی صحت بخش ہوائیں۔ طرح طرح کے پرندوں کی خوشنما صورتیں اور آوازیں۔ انواع و اقسام کے درخت اور پودے۔ ان کے رنگ برنگ کے پھول۔ ان تمام عجائبات کی ایک غریب زمیندار جو ایک سادہ زندگی بسر کرتا ہے۔ دن بھر ہل چلاتا ہے اور محنت کرتا ہے۔ مفت سیر کر کے اپنے دل کو خوش کرتا ہے۔ اور اس طور سے اپنے جسم و دماغ کو مضبوط اور کارآمد بناتا ہے۔ مگر ہندوستان کے شہروں کے لوگ تکلفات کے باعث ایسے آرام طلب ہو گئے ہیں۔ کہ وہ نہ صرف عجائبات قدرت کے نظاروں سے۔ بلکہ ان صنائع و بدائع کے نظاروں سے بھی جن کے دیکھنے کے لئے ممالک غیر کے سیاح کالے کوسوں کا سفر کر کے بڑے شوق سے یہاں آتے ہیں۔ بالکل محروم ہیں۔ اور ان کے تکلفات نے ان کے مذاق کو یہاں تک مسخ کر دیا ہے۔ کہ وہ اس قدرتی برکت سے بھی جو ان کی حیات مستعار کے ابقاء کے لئے نہایت ضروری و لابدی ہے یعنی تازہ و صاف ہوا خوشگوار مطلع اور

موسم اور صحت بخش تاثیرات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔

اگرچہ ایک شہری کی پرتکلف زندگی بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کے نتائج پر غور کیا جاتا ہے تو انسان کے لئے اس کی نہایت مضر اور تکلیف دہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے۔ سب سے پہلے انسان کی زندگی کا اچھی آب و ہوا پر انحصار ہے چنانچہ یہ دونوں چیزیں شہر میں مفقود ہوتی ہیں جو کھلی ہوا باہر دیہات میں مل سکتی ہے۔ وہ شہر میں ہرگز نہیں ملسکتی۔ کثرت آبادی کی وجہ سے ہمیشہ شہروں کی آب و ہوا خراب رہتی ہے۔ گو سائنٹیفک طریق سے صفائی وغیرہ کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ تاہم دیہات کی اس کھلی و صاف ہوا سے جس میں زہریلی گیسوں کی کچھ آمیزش نہیں ہوتی کچھ بھی مقابلہ نہیں ہوسکتا شہروں کے پرتکلف مکانات میں جن کی چار دیواریاں اور عمارتیں سر بفلک ہوتی ہیں۔ ان تازہ ہواؤں کا بالکل گزر نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوا وہاں پہنچتی ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کثیف اور خراب ضرور ہوتی ہے۔ جس سے صحت پر اچھا اثر نہیں پڑتا اور یہی وجہ ہے۔ کہ شہر کے لوگ خصوصاً ان شہروں کے باشندے جہاں گنجان آبادی ہے۔ ہمیشہ کمزور اور زرد رو ہوتے ہیں اور امراض۔ آلام۔ اور مصائب کا پورے طور پر مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے ہیں۔

برخلاف اس کے ایک گاؤں میں جہاں صفائی کے سامان بھی مہیا نہیں ہیں ہمیشہ توانا اور تندرست لوگ نظر آتے ہیں۔ شہروں کے عام باشندے بالخصوص امرا پا پیادہ پھرنے اور اپنے ہاتھ سے اپنی روزانہ زندگی کے متعلق سامان بہم پہنچانے کو عیب خیال کرتے ہیں۔ اور ایسے بیدست و پا ہو جاتے ہیں۔ کہ بعض وقت کسی ملازم کی عدم موجودگی سے بھوکے پیاسے بیٹھے رہتے ہیں اور خود اٹھکر بھوک پیاس کے رفع کرنے کا سامان تک بہم نہیں پہنچا

سکتے۔ ہمیشہ دوسروں کے محتاج رہتے ہیں۔گویا تندرست ہاتھ پاؤں رکھتے ہوئے اپاہج اور بدست و پا بنے رہتے ہیں۔اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ ان کی صحت اچھی رہتی ہے اور نہ ان کے مال میں کوئی کفایت ہوتی ہے دیہات کے مالدار بھی اپنی ضروریات کو اپنے ہاتھ سے باوجودیکہ ان کے ملازم ہوتے ہیں۔خود ہی انجام دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔اور یہی سبب ہے کہ وہ نہایت چاق وچوبند تندرست وخوش وخرم رہتے ہیں۔شہری لوگ بیمار۔ادویات کے عادی طبیبوں کے محتاج رہتے ہیں۔شہروں میں بھی وہ لوگ جو کل کام خود کرتے ہیں۔مثلاً مزدور وغیرہ بہ نسبت دیگر اشخاص کے جو کسی قدر مرفہ الحال ہوتے ہیں ہمیشہ توانا و تندرست دیکھے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان شہری مزدوروں کی زندگی بھی بہ نسبت دیہاتی لوگوں کے کسیقدر پر تکلف ہوتی ہے۔

شہریوں کی خوراک بھی خالی از تکلف نہیں۔طرح طرح کے مصالحوں سے پر اور مرغن ہونیکی وجہ سے بطی الہضم (دیر میں ہضم ہونیوالی) ہوجاتی ہے۔اور بجائے اس کے کہ اس سے خون صالح پیدا ہو اور صحت پر اچھا اثر پڑے وہ نہایت مضر صحت ہوتی ہے۔دیہات کے لوگ نہ اس قدر مصالح استعمال کرتے ہیں۔اور نہ اسقدر مرغن اشیا کھاتے ہیں۔ایک وقت میں ایک ہی طرح کے کھانے کے سوا انواع واقسام کے کھانے نہیں کھاتے۔وہ سادہ روٹی بقولات یعنی ساگ پات اور ترکاریوں کے ساتھ جنمیں تھوڑا سا نمک مرچ ہوتا ہے۔کھاتے ہیں۔یہی سادہ غذا ان کو تنومند بناتی ہے۔علیٰ ہذا پوشش کا بھی یہی حال ہے۔شہری تنگ وچست اور باریک کپڑے استعمال کرتے ہیں۔جو نشوونما اور صحت کے لئے مضر ہیں۔دیہاتی ہمیشہ موٹے

اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتے ہیں جس سے ان کی صحت ہمیشہ اچھی رہتی ہے
اس پر تکلف شہری زندگی نے عورتوں پر بہت ہی بُرا اثر ڈالا ہے۔ امراء اور
متوسط الحال لوگوں کی عورتیں ان پر تکلف زندگیوں سے ہمیشہ بیمار و کمزور رہتی
ہیں۔ اور جو اولاد ان سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ نہایت کمزور و حقیر ہوتی ہے۔
دیہاتی عورتیں جو سادہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ چکیاں پیستی ہیں چرخے کاتتی
ہیں۔ بوجھ اٹھاتی ہیں۔ محنت کے کام کرتی ہیں۔ نہایت قوی اور تندرست
ہوتی ہیں۔ اور اُن سے اولاد بھی نہایت قوی پیدا ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ دیہاتی زندگی میں بمقابل شہری زندگی
کے طرح طرح کے آرام اور آسائشیں ہیں۔ اور انسان کے لیئے اس قسم کی
زندگی ایک بڑی رحمت ہے۔ انسان اگر چاہے تو شہر میں بھی کسی قدر
سادہ زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اگرچہ وہ کل فوائد و خوبیاں جو دیہاتی زندگی
والوں کو حاصل ہیں۔ حاصل نہیں ہو سکتیں تاہم کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچ سکتا
ہے۔

ہمارے مسلمان بھائیوں کا طرز معاشرت سب سے زیادہ پُر تکلف
ہے۔ حالانکہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ابتدا میں یہ قوم
نہایت سادگی کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اور مذہبی تعلیم بھی ان کی اس کی حامی
ہے۔ کہ سادہ زندگی بسر کیجائے۔ مگر افسوس کہ اس قوم نے اپنے شعار اصلی
اور مذہبی پند و نصایح کو بھلا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یہ قوم دیگر اقوام سے
بلحاظ علم و دولت اور صحت سب سے پیچھے ہو گئے۔ وہ قوم جو ایک سادہ
زندگی بسر کرتی ہے نہایت خوش قسمت ہے۔ سادہ زندگی بسر کرنے سے
آسمانی برکتیں یعنی صحت۔ دولت و علم وغیرہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ سادہ زندگی

میں ترقی کا ایک بڑا راز مخفی ہے۔ اس سے ترقی صحت ترقی دولت اور ہر قسم کی خوشی بخوبی مل سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت ذوق نے خوب فرمایا ہے

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

اگر کوئی شخص دنیا میں کمال آرام سے زندگی بسر کرنا اور ترقی کرنا چاہتا ہے۔ تو سب سے پیشتر اس کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ سادہ خوراک سادہ پوشاک اور سادہ طرز بود و باش اختیار کرے۔ بر سبیل تذکرہ میں بیان کر چکا ہوں۔ کہ مسلمانوں کی زندگی زیادہ پُر تکلف ہوتی ہے۔ لیکن ہندوؤں کی زندگی تکلف اور تصنع سے ایک بڑی حد تک بری ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کا عمل اس فلسفیانہ اصول پر ہے۔ کہ

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

اور اب جو ہندوؤں پر شہری زندگی اور پر تکلف معاشرت کے نقصانات آشکارا ہوئے ہیں۔ تو وہ تکلف کو برطرف کرتے جاتے ہیں ورزش اور کھلے میدان میں صبح کو سیر کرنے۔ دریا پر جانے اور سادہ خوراک کھانے کی طرف عملاً زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔ برعکس اس کے شہری مسلمان کاہلی اور تکلفات کی زندگی کے آغوش کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتے جو ان کے قومی تنزل و انحطاط کے زبردست اسباب ہیں۔

منشی ابرار احمد۔ مہندر کالج
پٹیالہ

وزیر اور فقیر

نمبر ۲

مخزن کے معزز ناظرین نے ابھی وزیر اور فقیر کو فراموش نہ فرمایا ہوگا۔ کیونکہ میرا یہ مضمون اپریل میں چھپ کر پیش ہو چکا ہے۔ میں نے اس کی تمہید میں گذارش کیا تھا کہ نواب سعداللہ خاں صاحب وزیر ہندوستان کے متعلق کچھ حالات حضرات صوفیہ کی تاریخ سے بھی انتخاب کر کے ہدیہ کروں گا۔ تاکہ اس زمانہ کے بیخبر نوجوانوں کو معلوم ہو کہ جب تک مسلمانوں میں اقبال باقی تھا۔ انھیں سب قسم کے کمالات سے شوق تھا۔ رزم کے میدان میں اگر وہ رستم و اسفندیار بنکر آیا کرتے تھے۔ تو بزم کی رنگینی میں وہ کیخسرو اور جمشید کو پرے بٹھایا کرتے تھے۔ سونے کی لپی ہوئی خوابگاہوں میں سوتے تھے جواہر کے جڑاؤ برتنوں میں کھاتے پیتے تھے۔ مگر ان کے دل فقیر تھے۔ خدا سے لگن لگائے رکھتے تھے۔ غرور اُن کے پاس نہ پھٹکتا تھا۔ وہ فقیروں کی تنگ اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں پھٹے ہوئے بوریوں پر جاکر خوشی سے بٹھا کرتے تھے۔ انکی قدمبوسی کیا کرتے تھے۔ شاہ محمد اکرام براسوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب اقتباس الانوار میں لکھتے ہیں کہ:۔

"شاہجہاں کا لاہور میں قیام تھا۔ نواب سعداللہ خاں اور مُلّا مخدوم الملک جلسہ میں شریک تھے۔ علمی تذکرے ہو رہے تھے۔ جو حضور والا کو خیال ہوا کہ حضرت میاں میر کے پاس چلنا چاہیے۔ سُنا ہے وہ فقیر بھی کامل ہیں اور ظاہری علوم میں بھی تبحر رکھتے ہیں"۔

حضرت میاں میر صاحب کو کون نہیں جانتا ہے۔ آپ حضرت خضر بیابانی کے

مُرید تھے ساری عمر آپنے لاہور میں ایک کونے کے اندر کاٹ دی۔ روپیہ پیسہ لینا تو درکنار آپ کبھی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ داراشکوہ شہید کو انہی سے ارادت تھی۔ شاہجہاں اور نواب صاحب اور مخدوم الملک میاںمیر صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے۔

میاں میر صاحب کی عمر بھی بہت تھی۔ مگر مجاہدہ نے انھیں رہا سہا سکھا دیا تھا جہاں پناہ آپ کی زیارت سے بہت خوش ہوئے۔ اور نواب صاحب نے حضورِ والا کے اشارہ سے کچھ اشرفیاں آپ کے سامنے پیش کیں۔ میاںمیر صاحب نے ان کے لینے سے انکار کیا۔ نواب سعداللہ خاں نے مخدوم الملک کی طرف دیکھا تاکہ بادشاہ کی نذر قبول کر لینے کے واسطے کوئی علمی دلیل سید صاحب کی خدمت میں پیش کریں۔

مخدوم الملک "جناب سید صاحب نذر کے نہ لینے سے ایک حدیث نبوی کی تکذیب ہوتی ہے"

سید صاحب "وہ کونسی حدیث ہے"

مخدوم الملک "جس میں یہ مذکور ہے۔ کہ آدمی جس قدر بوڑھا ہوتا ہے اسکی حرص جوان ہوتی ہے"

سید صاحب "مولانا پڑھنا اور شے ہے سمجھنا اور چیز۔ آپ حدیث کا منشا بالکل نہیں سمجھے"

مخدوم الملک "وہ کیونکر"

سید صاحب "وہ اس طرح کہ بڑھاپے میں حرص کی جوانی سے یہ مراد ہے کہ انسان کے دل میں جس قسم کی حرص ہوتی ہے وہ بڑھ جاتی ہے۔ یعنی اگر دنیا کی حرص ہوگی وہ بڑھے گی۔ اور اگر دین کی حرص ہوگی وہ زیادہ ہو جائے گی۔ چنانچہ فقیر

کے دل میں دینی حرص بڑھی ہوئی ہے۔اس لئے نذرانہ لینا پسند نہیں کرتا۔آپ
کے دل میں دنیاوی حرص بڑھی ہوئی ہے اس لئے آپ باوجود اس علم وفضل کے
شاہنشاہ کے سات پڑے پھرتے ہیں۔مخدوم الملک اس توجیہ سے لاجواب
ہوئے۔تواُنھوں نے گفتگو کا پہلو بدلکر کہا:
اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ وَالشَّفَقَۃُ عَلَی الْخَلْقِ سے کیا مراد ہے۔
اس کنایہ سے یہ مدعا تھا کہ بادشاہ اولوالامر میں سے ہیں۔انکی تعظیم آپؐ۔
واجب ہی۔اس لئے نذرانہ رد نکرنا چاہیئے۔اور میں اور نواب صاحب خلق میں سی
ہیں ہمپر آپ نے شفقت کیوں نہ فرمائی اور ٹکرہ توڑکر کیوں دیدیا۔
سید صاحب نے (مسکراکر) میں یہی توعرض کرتا ہوں کہ آپنے پڑھا تو
ضرور ہی مگر گنا نہیں ہے۔اے جناب امر سے مراد انسان کی روح اور خلق سے
مراد اس کا جسم ہے۔اس کا ماحصل یہ ہے کہ آدمی اپنی روح کو دنیاداری میں
پھنساکر اس کی بیحرمتی نہ کرے۔اور ہاتھ پاؤں سے گناہ نہ کمائے۔یہی جسم پر
شفقت اور مہربانی ہے"
یہ جملہ اس قدر پرتاثیر تھا کہ مخدوم الملک اور نواب صاحب اور بادشاہ سلامت
شنکر چپ ہوگئے۔اور جب تک بیٹھے رہے کسی نے گردن نہ اُٹھائی۔اسی طور سے
جب شاہجہاں نے حضرت سید آدم بنوری (جو حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ
کے خلیفہ تھے) کے کمالات کا شہرہ سُنا۔تو نواب سعداللہ خاں کو اُن سے ملنے
کے لئے بھیجا۔اور مُلّا مخدوم الملک کو انکے سات کیا۔دونوں صاحب حضرت سید
آدم بنوری کی مجلس کو دیکھکر حیران ہو گئے۔شاہجہانی دربار میں بھی وہ ادب اور
قرینہ نہ تھے جو یہاں پائے۔سینکڑوں مریدوں اور ہزاروں حاجتمندوں کی بھیڑ
لگی ہوئی تھی۔ان دونوں صاحبوں کو اپنی امارت اور وزارت کا خیال تھا اس لئے

وہ سمجھتے تھے۔ کہ سید صاحب ہماری بڑی تعظیم و تکریم کریں گے۔ مگر وہ انکی اُمید کے خلاف معمولی طور سے پیش آئے۔ آپ کی بے پروائی دیکھکر مخدوم الملک نے نواب صاحب کے اشارہ سے منہ پر رکھ ہی دیا۔ کہ فقیروں کو غرور زیبا نہیں ہے۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا معزور لوگوں کے سات غرور کرنا عبادت ہے۔ اس جواب نے مخدوم الملک اور نواب صاحب کو برہم کر دیا۔ وہ آزردہ ہوکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور آکر بادشاہ سلامت سے کہدیا۔ سید آدم نبوری کے لاکھوں مرید ہیں جن میں ساٹھ ہزار ولایتی افغان ہیں۔ جو مرشد کے اشارہ پر کٹ مرنا ثواب جانتے ہیں۔ ایسے شخص کا سلطانی قلمرو میں رہنا ملک داری کی مصلحتوں کے خلاف ہے۔ بادشاہوں کے کان تو ہوتے ہی ہیں سُنتے ہی حکم دیدیا کہ سید آدم سے کہو ہماری سلطنت یعنی حدود ہندوستان سے نکلجائیں۔ ناچار آپ لاہور سے اپنے وطن جیت بنور آئے۔ اور مدینہ شریف کو ہجرت کر گئے اور وہیں آپ نے وفات پائی۔ اسی طرح دلّی کے لال قلعہ میں تخلیہ کی صحبت تھی۔ شاہجہاں کے پاس خواجہ ابوسعید حضرت مجددؒ صاحب کے بڑے فرزند اور شیخ داؤد صاحب گنگوہی چشتی صابری تشریف رکھتے تھے۔ تصوف کی مزہ دار باتیں چھڑ رہی تھیں۔ بادشاہ سلامت نے شیخ داؤد صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ کیوں حضرت درویشی کے سلسلوں میں سے کونسا طریقہ بہتر اور افضل ہے۔

شیخ داؤد۔ شمع کی محبت کے مدعی تو بہت سے جاندار بنے ہوئے ہیں۔ مگر انھیں اپنی جانیں عزیز ہوتی ہیں۔ اس لئے جب شمع اپنے آتشی چہرہ سے تاریکی کی نقاب اٹھاتی ہے۔ تو وہ دور سے ہی دیکھا بھالی اور گھورا گھاری کیا کرتے ہیں مگر پاس نہیں پھٹکتے۔ کیونکہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سفاک محبوب بڑا بے رحم ہے اپنے چاہنے والوں کو جب تک جلا کر راکھ نہیں کرلیتا ہے پیچھا نہیں چھوڑتا۔

دوسرا عاشق شمع کا پروانہ ہے۔ جو جلکر مر جانے کو اپنی حیات جانتا ہے۔ رات کے وقت جب شمع اپنے منہ پر سنہری پوڈر ملکر اور دھواں دھار اپنی کالی چوٹی گوندھ کر زریں تخت پر جلوہ آرا ہوتی ہے۔ تو سب سے پہلے وہ سوختہ اختر بلائیں لینے کے لئے بڑھتا ہے۔ اور اس قدر صدقہ داری ہوتا ہے کہ اپنی جان کھوکر بے نام و نشان ہوجاتا ہے۔ میں زیادہ تشریح کرنی نہیں چاہتا ہوں۔ کیونکہ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

ظل اللہ خدا رکھے سب سلسلہ اور اہل سلسلہ سے واقف ہیں۔ خیال فرما سکتے ہیں۔ کہ شمع اور پروانہ کی لو اور لگن کس طریقہ میں پائی جاتی ہے۔"

اس دل آویز تقریر نے شاہجہاں کو رلا دیا۔ اور اس کے دل میں ایک آگ لگ گئی شمع کی طرح گورہ گورہ چہرہ پر گرم گرم آنسو دیر تک بہتے رہے۔ اور شیخ داؤد صاحب کے سات خاص عقیدت پیدا ہوگئی۔ بار بار ان کی زیارت سے مشرف ہوتے اور انکی صحبت کو غنیمت جانتے۔ ایک دن نواب صاحب نے حضور والا کی خدمت میں عرض کی کہ شیخ داؤد صاحب کے مقام ولایت کو تو جیسا اندازہ کیا جان سکتا ہے۔ مگر ظاہری علوم سے تو شیخ بالکل بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں۔

شاہجہاں :۔ سعد اللہ خاں تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ شیخ کو ظاہری علوم و فنون بھی خوب آتے ہیں۔ ہمنے تو اس کی آزمائش کرلی ہے اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو تم بھی آزما لو"

نواب صاحب :۔ بہت خوب فدوی کسی موقع پر شیخ کے ظاہری کمالات کی ضرور جانچ کرے گا"

اسی دن سے نواب صاحب نے کئی جاسوس اس ٹوہ کے لئے مقرر کر دئے کہ جسدن شیخ مہرولی شریف حضرت قطب الاقطاب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لئے جائیں۔ تو فوراً خبر دیں۔ ایک دن یہ موقع آگیا۔ اور جاسوسوں نے رپورٹ دی۔ کہ شیخ داؤد مہرولی جانیکے لئے سوار ہو گئے۔ یہ سنتے ہی نواب سعداللہ بھی ایک صبا رفتار گھوڑے پر چڑھ کر چلدئے۔ اور شہر پناہ سے نکلتے ہی شیخ صاحب سے جا ملے۔ سلام اور مزاج پرسی کے بعد کہا۔ میں بھی مہرولی جا رہا ہوں۔ اِدہر اُدہر کی باتیں کر کے نواب صاحب نے حکمت کے مشکل اور اٹکھڑ سوال گفتگو میں لا ڈالے۔

دلّی سے مہرولی کو گیارہ میل کا فاصلہ ہے۔ بحث مباحثہ کا بڑا موقع اور بہت سا وقت ملگیا۔ شیخ نے ایک ایک سوال کا جواب چودہ چودہ طرح پر دیا۔ اور ہر جواب ایسا دلنشین اور تسلی بخش تھا جسکو سُن کر نواب صاحب نہایت محظوظ ہوئے۔ دوسرے دن نواب صاحب نے حضور والا کی خدمت میں ہاتھ باندھکر عرض کیا۔ کہ فی الواقع شیخ داؤد ظاہری علوم میں بھی یکتا ہیں۔ کل فدوی نے قطب کے رستہ میں شیخ کا امتحان لیا۔ تو معلوم ہوا کہ ان کے سینہ میں کمالات کا سمندر پنہاں ہے۔ اور اس کی موجیں اُٹھ اُٹھ کر آسمان تک جا رہی ہیں۔ حضور والا نے فرمایا ہمیں تو شیخ کے ظاہری باطنی دونوں طرح کے کمالات کا تجربہ تھا۔ مگر شکر ہے کہ تم بھی اس سے واقف ہو گئے۔

سماعی۔ ایک دن حضور والا نے نواب صاحب سے کہا آج تم دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے پاس پھیرا کرو۔ اور آزما کر دیکھو ولیعہدی کے قابل دونوں میں سے کون ہے۔

دارا شکوہ شاہجہاں کے بڑے بیٹے تھے اس لئے نواب صاحب پہلے انھیں کے پاس گئے۔ حاجب نے اطلاع کی کہ وزارت پناہ در دولت پر حاضر ہیں۔ دارا شکوہ

وزارت پناہ کا نام سنتے ہی دروازہ تک دوڑے آئے بڑے احترام سے لے گئے اور مسند پر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ کیونکہ جانتے تھے۔ باوا کے منہ چڑھے ہوئے ہیں۔ اور بادشاہ ان کے کہنے میں ہیں۔ اگر میں انکی خوشامد نہ کرونگا۔ تو خدا جانے کیا لگائی بجھائی کرینگے۔ اور ولیعہدی ملنی دشوار ہو جائے گی۔ جب تک بیٹھے رہے۔ طرح طرح سے انکی خاطر و مدارات کرتے رہے۔ نواب صاحب نے باتوں باتوں میں کہا۔ صاحب عالم آپ کو خبر ہے آج شہر میں گیہوں کا کیا بھاؤ ہے۔

داراشکوہ: "نواب صاحب آپنے یہ عجیب سوال کیا۔ میں بنیا نہیں۔ بقال نہیں، بنجارہ نہیں۔ کھاری باؤلی کا چودہری نہیں جو مجھے اناج کا بھاؤ معلوم ہوتا میں تو ہر وقت تصوف کی کتابیں دیکھا کرتا ہوں۔ اگر آپ وحدت وجود اور وحدت شہود کا فرق پوچھیں تو بتا سکتا ہوں"۔

نواب صاحب نے کہا بجا ارشاد ہوا۔ جب نوابصاحب اٹھے۔ تو داراشکوہ نے ایک ہزار روپیہ کی اشرفیاں انعام کے طریق پر ان کو دیں۔ وہ انھوں نے بے تامل لے لیں۔ اور سلام کر کے رخصت ہوئے۔ اور اورنگ زیب کی حویلی پر پہنچے۔ یہاں بھی اطلاع ہوئی۔ اور حکم آگیا کہ اندر آنے دو۔

کیسی پیشوائی اور کس کا استقبال جب نوابصاحب کمرہ میں پہنچے۔ تو دیکھا۔ چوکی پر جانماز بچھی ہوئی ہے۔ اور اورنگ زیب اس پر قبلہ کی طرف منہ کئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے رحل پر قرآن شریف دھرا ہوا ہے۔ اور تلاوت میں مشغول ہیں۔ سیدھے ہاتھ کے پاس ہی ایک خاراشگاف برق دم تلوار رکھی ہوئی ہے۔ اگرچہ نیام میں ہے مگر قبضہ کیطرف سے دو انگل باہر نکلی ہوئی میرزا غالب کے اس شعر کے مضمون کو اپنی زبان سے ادا کر رہی ہے ؎

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہئے　　سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

بیٹھنے کا یہاں موقعہ ہی نہ تھا۔ اس لئے وزارت پناہ کو ناچار ہاتھ باندھکر کھڑا رہنا پڑا۔ خدا جانے روز ہی اس قدر دیر تک تلاوت کی جاتی تھی یا نواب صاحب کو ستانے کیلئے آج دو گھنٹہ تک قرآن شریف پر سے نظر نہ اٹھائی کھڑے کھڑے نواب صاحب کی ٹانگیں شل ہو گئیں۔ گھبرا گئے دم نہ مار سکے۔ جب کلام اللہ کو گردان کر نوکر کے حوالے کر دیا۔ تو نواب صاحب کی طرف مخاطب ہوئے۔ مگر نگاہ میں اسقدر ہیبت اور رعب تھا۔ کہ نوابصاحب جیسا جری شخص تھرا گیا۔ اداب بجا لائے اور ہاتھ باندھکر پھر سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ کچھ دیر کے بعد اشارہ ہوا کہ بیٹھ جاؤ۔ نواب صاحب پھر آداب بجا لائے۔ اور دو زانو بیٹھ گئے۔ جب گفتگو شروع ہوئی۔ تو نواب سعداللہ خاں سے ان سے بھی یہی سوال کیا کہ دلی میں آج گیہوں کا کیا نرخ ہے۔

یہ کہکر وہ چپ ہو گئے۔ اورنگ زیب نے گیہوں۔ جو۔ چنا۔ ماش۔ مونگ۔ مٹر۔ چاول۔ گڑ۔ شکر۔ قند مصری گھی۔ کھانڈ۔ پان چھالیہ۔ میوے۔ ترکاریاں ساگ پات۔ سونے چاندی جواہر دنیا بھر کی ادنےٰ اعلیٰ سب چیزوں کے نرخ بتا دیئے۔ پھر یہ بھی بتا دیا۔ کہ دارالسلطنت میں ان جنسوں کا آج یہ نرخ ہے۔ کل یہ تھا۔ پنجاب کے شہر اور قصبوں میں یہ نرخ ہے۔ دوآبہ میں یہ ہے بہار میں یہ ہے۔ بنگال میں یہ ہے۔ اودھ میں یہ ہے روہیلکھنڈ میں یہ ہے پھر یہ بھی بتا دیا کہ کونسی جنس کہاں پیدا ہوتی ہے۔ وہاں سے دلی کیونکر آتی ہے۔ بنجاروں کے بیل۔ خچر اونٹ گدھے ٹٹو جو جنسیں لاد کر لاتے ہیں انکا کرایہ کیا ہوتا ہے۔ کن کن جنسوں پر محصول ہے اور محصول کی شرح کیا ہے۔ غرض ہزاروں باتیں بیان کر ڈالیں جن کو سنکر وزارت پناہ دنگ ہو گئے۔ اپنے جی میں کہنے لگے خدا نے اس شاہزادے کو کیا دماغ اور کیا حافظہ دیا ہے۔

واللہ اعلم درپردہ کیا انتظام اور اہتمام کر رکھا ہے۔ جو ہندوستان کے چپہ چپہ کی ذرا ذرا سی خبریں روزمرہ تازہ اس کے پاس آتی رہتی ہیں۔ شاہجہان کے بعد یہی تخت و تاج کے لایق ہے۔

جب وزارت پناہ رخصت ہوئے تو نوکر کو اشارہ کیا۔ پانچ روپیہ انکو دیدو۔ پانچ روپیہ نواب وزیر کے لایق کب تھے۔ مگر اسکو صرف اپنا دبدبہ دکھانا تھا۔ کہ اگر حقیر سمجھکر لینے میں ناک بھوں چڑھائی تو پھر خیر نہ سمجھنا۔ اور یہ بھی جتانا تھا کہ میں داراشکوہ نہیں ہوں جو تم سے دبوں یا تمہاری للو پتو کروں۔ نہ مجھے اسکی پرواہ ہے۔ کہ تم میرے باپ سے جاکر جھوٹ سچ لگاؤ گے۔

وزارت پناہ نے شاہزادے کے تیور پہچان۔ وہ پانچ روپیہ سر اور آنکھوں پر رکھکر لئے۔ انکے دل میں نقش ہوگیا۔ کہ اورنگ زیب کو ہندوستان کی حکومت باپ دیدے یا وہ خود لے مگر پہنچیگی ضرور۔ اور سب کے سب منہ تکتے رہ جائیں گے۔ جو لوگ آج اس کے ساتھ بری طرح پیش آئیں گے۔ وہ کل اُن کو دہنیہ کی کھوپری میں پانی پلوائے گا۔ اور ناک چنے چبوا دیگا۔ اس واسطے انھوں نے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوکر پہلے تو داراشکوہ اور اورنگ زیب کی لیاقتوں کا حال بیان کیا۔ اور اس کے بعد کہدیا کہ سلطنت کی لیاقت تو خدا نے اورنگ زیب کو ہی بخشی ہے۔

حضرت شاہجہاں مدبر اور منتظم ضرور تھے۔ مگر عیش و نشاط کی طرف بھی انکی طبیعت مائل تھی۔ تفریح کا کوئی پہلو ان سے نہیں بچتا تھا۔ اتفاقاً ایک شب کو سوتے سوتے آنکھ کھل گئی۔ تو دیکھا رات بہت ہی دلکش اور سہانی ہے۔ چودھویں رات کا چاند دیوان خانہ کی سنہری برجیوں اور چھجوں پر نور برسا رہا ہے۔ اور سنگ مرمر کی سفیدی کا روپ اس طرح جھلک رہا ہے کسی ماہ جبین

دل آرا کو شراب پیکر اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہے۔ اور اس کا گورا گورا پنڈا ہلکے پھلکے کپڑوں میں سے موقع اور بے موقع کھلجائے۔ اور عاشق مزاج یہ نورانی جلوہ دیکھ دیکھ کر گریباں چاک کرڈالیں۔ بادِ نسیم لہرا رہی ہے۔ اور کسی کی زلف عنبریں میں لس لس کرا ترا رہی ہے۔ غنچے چٹک رہے ہیں۔ پھول مہک رہے ہیں پرندے پنجروں میں چہک رہے ہیں حوض کے پانی چھلک رہے ہیں۔ مار بل کی شفاف شفاف نہر میں موتی جیسا پانی اور اس میں چاند تاروں کا عکس ہرے ہرے درختوں کا سایہ پڑ رہا ہے جس کو مجنون اگر دیکھ لے تو لیلی کا سودائے عشق مٹ جائے۔ مہتاب کی یہ جلوہ آرائی دیکھکر حضور والا کا دل بیتاب ہو گیا۔ حکم ہوا ہوا دار ابھی حاضر کرو۔ مابدولت واقبال چاندنی کی سیر کریں گے۔

بات کہتے میں ہوادار آگیا۔ حضور والا سوار ہوگئے۔ اسوقت اردلی میں صرف چار خواص تھے۔ کہار ہوادار کو آہستہ آہستہ لئے جاتے تھے۔ کبھی حکم ہوتا تھا عقب حمام کیطرف چلو کبھی اشارہ فرماتے تھے۔ کہ نقارخانہ کی جانب بڑہو۔ کبھی دیوان عام کبھی قلعہ کے لاہوری دروازہ کی طرف آتے اور جاتے۔ اور چاندنی کی بہار ملاحظہ فرماتے۔ اس سیر و تماشہ میں بادشاہ کی سواری کئی بار ایک محل کے نیچے سے آئی گئی۔ جس میں خاندان شاہی کی ایک بوڑھی بیگم رہتی تھیں۔ اور شاہجہاں انکا بہت ہی ادب کرتے تھے۔

اس ہیرا پھیری اور کہاروں کی ہوں ہاں سے محل کے پہرہ دار ہوشیار ہوگئے اور بیگم صاحب کی جو محل کی پردہ دار چھت پر سو رہی تھیں آنکھ کھل گئی۔ اور معلوم ہوا آج جہاں پناہ چاندنی کی سیر کرتے پھرتے ہیں۔ اوّل تو محل کی چھت پھر رات کا سناٹا۔ قد آدم قنات میں صدائیں بھلا کب رُکنے والی تھیں۔ یہاں پر بیگم صاحب کا جلکر کہنا شاہجہاں نے اپنے کانوں سے سُن لیا۔ کہ بیگم

فرما رہی ہیں۔ڈوبا وہ ملک جس کا بادشاہ رعایا کی فکر نہ کرے اور چاندنی کی سیر دیکھنے کے لئے آدھی رات دو بجے ادہر سے اُدہر اور اُدہر سے اِدہر دھکے کھاتا پھرے۔

بادشاہ سلامت کے دل پر خدا جانے یہ بات گراں گذری یا کیا اثر ہوا جو فرمایا سواروں کو روکو اور خواص کو حکم دیا۔اس محل کا دروازہ کھلواؤ۔اور بیگم صاحب کو خبر کردو کہ حضور والا آپ کے پاس تشریف لاتے ہیں۔دروازہ اسیوقت کھل گیا۔حضور محل میں تشریف لے گئے۔بیگم صاحب بھی ہانپتی کانپتی کوٹھے پر سے اُتر آئیں۔صحن چبوترہ پر کرسیاں بچھا دی گئیں۔ایک پر بادشاہ اور ایک پر بیگم بیٹھ گئیں۔مگر بادشاہ سلامت نے اس بات کو بیگم کے منہ پر نہ رکھا۔البتہ ایک لونڈی سے کہا۔دیکھو ڈیوڑھی پر ہمارے خواص حاضر ہیں۔اُن سے کہو سیدھے سعد اللہ خاں وزیر کے مکان پر جائیں۔اور ان کو جس حال اور جس ہیئت میں پائیں۔ہمارے پاس جلد لے آئیں۔اگر سوتے ہوں تو مع پلنگ کے اُٹھا لائیں۔درباری لباس نہ پہننے پائیں۔

خواص دوڑے چلے گئے۔آدھ گھنٹہ میں لونڈی نے عرض کیا۔جناب عالی وزارت پناہ دردولت پر حاضر ہیں۔بادشاہ سلامت نے بیگم سے کہا۔آپ ذرا چلمن کے پیچھے تشریف لیجائیے میں وزیر کو اندر بلاؤنگا۔

بیگم چلمن کے پیچھے ہٹ گئیں۔مگر دل میں کہنے لگیں۔آج شاہجہاں کو کیا ہوگیا ہے۔اسوقت پچھلی رات کو میرے محل میں کیوں آئے۔وزیر کو کیوں بلایا۔کہیں دشمنوں نے متوالی کو دوں تو نہیں کھالی ہے۔

الغرض وزیر صاحب محل میں آئے۔مگر یہ معلوم ہوا کوئی سانگ آیا ہے بیگم نے چلمن کے پیچھے سے دیکھا۔چار کہاروں کے سر پر ایک بڑی ساری چوکی ہے۔جس پر سیتل پاٹی بچھی ہوئی ہے اور اسپر سعد اللہ خاں ننگے سر ننگے گل

نیلا تہمد باندھے بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے ایک فتیل سوز روشن ہے۔ اور زانو پر کچھ کاغذ دونوں پہلوؤں میں رکھے ہیں۔ فتیل سوز کی گرمی سے پسینہ میں شرابور ہو رہے ہیں۔

کہاروں نے چوکی اتار کر چبوترہ پر حضور والا کے سامنے رکھدی۔ وزیر صاحب نے چاہا کہ اس طرح دیوانہ وار نہ سر پر ٹوپی نہ گلے میں کرتہ ننگے دھڑ ننگے چلے آنیکی معافی چاہیں۔ اور عرض کریں۔ کہ شاہی ملازم مجھے زبردستی جس حال میں بیٹھا ہوا تھا۔ اٹھا لائے۔ مگر بادشاہ سلامت نے اشارہ کیا کہ خبردار جو تم بولے۔

شاہجہاں۔" میں تم سے صرف یہ پوچھتا ہوں۔ کہ آج رات کو تم کس وقت سوئے۔ اور کس وقت اٹھے"

نوابصاحب۔" غلام سویا ہی نہیں۔ جو اٹھتا۔ کھانا کھا کر جو بیٹھا ہے۔ تو کاغذ دیکھتے دیکھتے چار بجا دئے"

شاہجہاں۔" کیوں نہیں سوئے"

نوابصاحب۔" غلام سو رہتا تو کاغذات کون دیکھتا۔ آج رات کا جاگنا نئی بات نہیں ہے۔ غلام ہمیشہ ساری رات جاگتا ہے۔ اور کاغذ دیکھا کرتا ہے۔ صبح ہوتے کوئی گھنٹہ بھر کے لئے آنکھ بند کر لیتا ہے"

شاہجہاں۔" کیا میںنے تم سے کبھی کہا ہے کہ ساری رات جاگا کرو"

نوابصاحب۔" حضور والا نے تو کبھی جاگنے کے لئے ہدایت نہیں فرمائی مگر فدوی اپنے فرائض کو خوب جانتا ہے۔ جب بندگان عالی نے قلمدان وزارت فدوی کو دیدیا ہے۔ اور اپنی ساری رعایا کی جان و مال کا مالک فدوی کو بنا دیا ہے تو فدوی کے واسطے کب زیبا ہے۔ کہ پاؤں پھیلا کر سوئے۔ اور لاکھوں بندگان خدا کے حلق پر چھری پھیر دے"

جب سعد اللہ خانصاحب چپ ہوئے۔ تو بادشاہ سلامت نے بیگم سے فرمایا آپ نے سعد اللہ کی گفتگو سن لی۔ اور اس کی حالت ملاحظہ فرمالی۔

بیگم:۔ (پردہ کے پیچھے سے) جی ہاں "

شاہجہان:۔ جب خدا نے مجھے ایسا ہمدرد اور خیرخواہ لایق وزیر دیدیا ہے تو میرے لیئے نامناسب نہ ہوگا۔ اگر مینے کبھی کبھار چاندنی کی سیر دیکھ لی۔ آپ نے جو فرمایا تھا کہ ڈوبا وہ ملک جس کا بادشاہ رعایا کی فکر نہ کرے۔ اور آدھی پر دو بجے چاندنی کی سیر کے لیئے دیکھے کھاتا پھرے۔ وہ مینے سن لیا تھا مینے چاہا کہ آپ کو زبانی جواب دیدوں۔ پھر خیال آیا میرے کہنے کا آپ باور نہ کریں گی۔ اس لئے وزیر کو بلا کر دکھادوں۔ اور آپکا شبہ بالکل مٹادوں "

بیگم:۔ میاں مینے جو کچھ کہا تھا وہ نیک نیتی اور خیرخواہی سے کہا تھا۔ بیشک خدا نے تمھیں ایسا ہی نمک حلال وزیر دیا ہے کہ اس کے اوپر جس قدر بھروسہ اور ناز کرو بجا ہے۔ اگر اس وزیر کے اوپر تم سب سلطنت کے کاموں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ اور دن رات پڑے سویا کرو۔ تو زیبا ہے۔ خدا وزیر اور بادشاہ دونوں کو سلامت رکھے اور سب طرح کے سکھ دکھائے "

سبحان اللہ کیا پاک وقت تھے۔ کیا اچھے بادشاہ اور کیا اچھے وزیر تھے۔ کیا اچھی عورتیں تھیں جو بادشاہوں سے بھی نہ چوکتی تھیں اور کھری کھری سنا دیا کرتی تھیں۔ اے پاک روحو! تم پر فراق کا سلام پہنچے۔ تم اپنی قبروں میں چین سے سوتی رہو۔ مگر الحمد للہ کہ ہمارا زمانہ بھی بہت اچھا ہے۔ ہمارا شہنشاہ بھی بہت اچھا ہے۔ اوس کے وزیر بھی اچھے ہیں۔ ہم اپنے شہنشاہ کے سایہ میں بڑے چین اُٹھا رہے ہیں۔ ہمارے دل سے دعا نکلتی ہے بقول داغ

خیر سرکار کی مناتے ہیں!
جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

[illegible]

قدیم ہندوستانیوں کا ملکی انتظام

کچھ شک نہیں کہ جب سے ہندوستان میں انگریزی حکومت آئی ۔ تب سے ملکی نظم ونسق نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہے ۔ گورنمنٹ کا کام متعدد اور مختلف محکموں میں منقسم ہے ۔ ہر محکمہ کے سپرد کسی خاص بات کا انتظام ہے ۔ مثلاً پولیس کے سپرد ملک کا اندرونی انتظام وامن ۔ چنگی کے سپرد اشیاء کے محصول کی تشخیص اور وصولی ۔ محکمہ تعلیم کے سپرد لوگوں کی تعلیم کا کام محکمہ طبی کے سپرد لوگوں کی جسمانی تکالیف وامراض کے دفعیہ کا انتظام ۔ پبلک ورکس کے سپرد سڑکوں اور سرکاری عمارتوں کے بنانے ۔ نہریں کھدوا کر آبپاشی کو وسعت دینے کا انتظام اور محکمہ جنگ کے متعلق سرحدوں کی حفاظت اور ملک کے اندرونی امن وامان کا انتظام اور علیٰ ہذا ۔

جتنے محکمے گورنمنٹ ہند میں آجکل ہیں ۔ باستثنائے چند قریب قریب اتنے ہی مسلمانوں کے عہد حکومت میں بھی تھے ۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر اعظم کا ملکی نظم ونسق اس بات کی کافی شہادت دیتا ہے ۔

قدیم ہندوؤں کے زمانہ میں ملکی انتظام کس قسم کا تھا ؟ اس مدعا کی تائید میں ہم موریہ خاندان کے بانی راجہ چندر گپت کے زمانے کے ملکی نظم ونسق میں سے چند باتیں نذر ناظرین کرتے ہیں ۔ جن سے معلوم ہوگا ۔ کہ اب سے ۲۲ سو سال پہلے ہندوستان کی تہذیب وشائستگی کس قسم کی تھی ۔

چندر گپت جس نے موریہ خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی ۔ وہ ۳۲۱ سنہ قبل مسیح میں ہندوستان کے ایک حصہ پر حکمران تھا ۔ اوّل تو اس نے یونانیوں

کی حکومت جو سکندر اعظم کی فتح سے ہندوستان کے ایک حصہ میں قایم ہوگئی تھی۔ اٹھا دینے کا ارادہ کیا۔ بہت لوگ اس حکومت کے خلاف تھے۔ چندر گپت انکا سرغنہ بنا۔ اس وقت اس کی عمر پچیس سال کی تھی۔ اس نے یونانیوں کے خلاف اس قدر جد وجہد کیا۔ کہ انکی حکومت کو ہندوستان سے ہٹا کر دم لیا۔ اس کے بعد اس نے مگدھ کی زبردست سلطنت کو فتح کیا۔ اور نیز دیگر فتوحات حاصل کر کے اپنی حکومت خلیج بنگال سے لیکر بحر عرب کے ساحل تک قایم کر دی۔

چندر گپت کا پایہ تخت پٹالی پتر تھا۔ جو دریائے سون اور گنگا کے اتصال پر بسا ہوا تھا جس جگہ یہ شہر تھا۔ اس جگہ آجکل شہر پٹنہ اور انکی پور آباد ہیں۔ بقول میگا ستھنیز مورخ پٹالی پتر نو میل لمبا اور ۱½ میل چوڑا تھا۔ اس کے گرداگرد لکڑی کا بلند احاطہ تھا جس میں ۶۴ پھانک اور ۵۷۰ میناریں تھیں۔ اس احاطہ کے باہر ایک عمیق اور چوڑی خندق تھی جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔

شاہی محل اور دربار شان وشوکت اور آرایش کے اعتبار سے سوسہ اور اکباطنہ کے شاہی محلوں اور درباروں سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ دربار میں راجہ ہر روز رعایا کی درخواستیں لیتا اور انصاف کرتا۔ اور غیر ملکوں کے سفیروں سے ملاقات کرتا تھا۔

فوج۔ چندر گپت کی فوج تعداد میں بہت زیادہ اور مشرقی معیار رقابت ملت کے اعتبار سے بڑی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ یہ فوج مستقل تھی۔ اور معقول تنخواہ پانیوالی۔ اسے سرکار کی طرف سے گھوڑے ہتھیار۔ خوراک اور سامان باربرداری دیا جاتا تھا۔ اس فوج میں چھ لاکھ پیادے ۳۰ ہزار سوار۔ ۹ ہزار ہاتھی اور ۸ ہزار رتھ تھے۔ سواروں کے پاس ڈھال اور دو نیزے ہوتے

تھے۔ پیدلوں کے پاس ایک تلوار ایک برچھی یا تیر و کمان ہوتے تھے۔ ہر رتھ میں دو یا چار گھوڑے جتتے تھے۔ اور علاوہ رتھ بان کے دو سپاہی بیٹھتے تھے۔ ایک ہاتھی پر علاوہ مہاوت کے تین تیر انداز۔ اس طرح نوہزار ہاتھی پر ۳۶ ہزار فوج ہوتی تھی۔ ۸۰۰۰ رتھوں میں ۲۴ ہزار فوج۔ کل ہیئران سپاہیوں کے علاوہ لشکریوں کی ۶ لاکھ ۹۰ ہزار تھی۔

محکمہ جنگ۔ اتنی بڑی فوج کا انتظام ایک محکمہ جنگ کے سپرد تھا جنگی محکمہ میں تیس اعلیٰ افسروں کی مجلس تھی۔ جو پانچ پانچ افسروں کے ۶ بورڈوں میں منقسم تھی۔ اول بورڈ کے سپرد محکمہ بحری تھا۔ دوسرے کے رسد رسانی اور کمسریٹ تیسرے کے پیدل پلٹنیں۔ چوتھے کے رسالے۔ پانچویں کے رتھ چھٹے کے ہاتھی چندر گپت سے پیشتر ہندوستان میں محکمہ بحری کا دستور اعلیٰ قسم کا تھا۔ اس کی فوج کی قابلیت اور فن حرب کی واقفیت کا صحیح ثبوت یہ ہے کہ اس نے یونانیوں جیسی سخت جان اور جنگجو فوج کو شکستوں پر شکستیں دیں۔

سول انتظام۔ اگرچہ یہ انتظام محض ایک شخص یعنی چندر گپت کی رائے پر منحصر تھا۔ تو بھی اچھا تھا۔ سب سے زیادہ زور پایہ تخت کے انتظام پر دیا گیا تھا۔ اور یہ انتظام محکمہ چونگی کے سپرد تھا

محکمہ چونگی۔ اس محکمہ کے افسروں کی مجلس میں بھی ۳۰ افسر تھے۔ جو ۵۔۵ ممبروں کے چھ بورڈوں میں منقسم تھا۔ اور ہر ایک بورڈ کے سپرد ایک خاص بات کا انتظام تھا

(۱) صنعت و حرفت۔ اس کا انتظام اول میونسپل بورڈ کے سپرد تھا۔ جو صنائع کی دیکھ بھال کرنا۔ صناعوں کی اجرتیں مقرر کرنا۔ صنائع کے بنانے میں خالص چیزوں کا استعمال کرانا۔ اور کسی صنعت میں نقص پیدا کرنیوالے کو سزا دیتا تھا۔ سزا کے طور پر یا تو ملزم کا ہاتھ کٹوایا جاتا تھا۔ یا آنکھ نکلوائی جاتی تھی۔

(۲) غیر ملک والوں کی نگرانی۔ یہ دوسرے بورڈ کے سپرد تھی۔ غیر ملکیوں کے مقدمات اور فرائض جو فی زمانہ یورپ میں غیر ملک کے سفیروں کے متعلق ہیں دوسرے بورڈ سے متعلق تھے۔ کل ایسے لوگوں کی نگرانی افسر کرتے تھے۔ اور ان کے واسطے رہنے کے لئے مکان۔ سفر کے لئے سواری۔ اور بیماری میں دوا وغیرہ کا بھی انتظام کرتے تھے۔ جو غیر ملکی مرتے تھے۔ انکی تجہیز وتکفین سرکار سے کرائی جاتی تھی۔ اور ان کا مال و اسباب انکے ورثا کے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔

(۳) فوتی پیدائش۔ تیسرے بورڈ کے سپرد فوتی پیدائش کا انتظام تھا۔ تاکہ ٹیکسوں کی تشخیص میں آسانی ہو سکے۔ کیونکہ فی کس ایک مقررہ شرح سے لوگوں سے ایک ٹیکس لیا جاتا تھا۔ فوتی پیدائش کے نقشے مرتب کرائے جاتے تھے۔ یہ کام چندر گپت ہی کے زمانہ کی ایجاد تھا۔ یورپ میں اس محکمہ کی بنیاد کو بڑے ہوئے صرف بہت تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے۔

(۴) تجارت کا انتظام چوتھے بورڈ کے سپرد تھا۔ جو خرید و فروخت۔ اوزان۔ ناپ تول۔ باٹ وغیرہ کے متعلق قوانین بنانا اور سوداگروں سے محصول لیتا تھا۔ جو سوداگر کئی قسم کی چیزوں کی تجارت کرتا۔ اس کو دُگنا محصول دینا پڑتا تھا۔

(۵) دستکاری۔ دستکاری کا انتظام پانچویں بورڈ کے سپرد تھا۔ وہ نگرانی کرتا تھا۔ کہ نئی اور پرانی چیزیں ملا کر نہ بیچی جاویں۔ جو لوگ ایسا کرتے تھے ان کو یہ بورڈ سزا دیتا تھا۔

عشر۔ چیزوں کی فروخت پر دسواں حصہ جسے عشر کہتے ہیں۔ وصول کرنیکا انتظام چھٹے بورڈ کے سپرد تھا۔ اس کے ادا نہ کرنیوالے کو سزائے موت دی جاتی تھی۔ عشرہ ادا نہ کرنیکے عوض سزا کا رواج چندر گپت ہی کے وقت سے ہوا۔ علاوہ پایہ تخت کے اور بڑے شہروں میں بھی چنگی کا محکمہ تھا۔ اس کا پتہ راجہ اشوک

کے ایک فرمان سے لگتا ہے میونسپل کمشنروں کو علاوہ مذکورہ بالا خدمات انجام دینے کے شہروں کے متعلق دیگر باتیں بھی انجام دینی ہوتی تھیں۔ مثلاً بازاروں، مندروں، بندرگاہوں۔ اور سرکاری عمارتوں کا انتظام۔

صوبوں کا انتظام - صوبوں کے انتظام پر شاہی خاندان کے لوگ یا ان کے اور رشتہ دار مقرر کئے جاتے تھے۔ وہ وائسرائے یا نائب السلطنت کہلاتے تھے۔

اخبار نویس چندر گپت کے دربار میں اخبار نویس مقرر تھے۔ جو صوبوں کے حکام کے افعال و انتظام کی خفیہ طور پر نگرانی کرتے تھے۔ اور انکے متعلق گورنمنٹ میں خفیہ رپورٹیں روانہ کرتے تھے۔

قانون تعزیرات - میگاتھینز لکھتا ہے کہ وہ چندر گپت کے لشکر میں جس میں چار لاکھ آدمی تھے۔ عرصہ تک رہا مگر جو چوریاں اس کے وقت میں ہوئیں۔ ان میں سے کبھی چوری کے مال کی قیمت ۸ پونڈ سے زیادہ نہ تھی۔ اگر کوئی کسی کا عضو زخمی کرتا تو اس کا بھی وہی عضو زخمی کیا جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی ہاتھ بھی کٹوایا جاتا۔ اگر مجروح دستکار اور راجہ کا نوکر ہوتا۔ تو زخمی کرنیوالے کو سزائے موت دیجاتی تھی۔ جھوٹی شہادت دینے والے کے جسم پر زخم لگوائے جاتے تھے۔ بعض جرائم کے عوض مجرم کا صرف سر منڈوایا جاتا تھا۔ یہ بڑی بری سزا خیال کی جاتی تھی۔ کسی درخت کو نقصان پہنچانا۔ چنگی کا عشر نہ دینا۔ شاہی جلوس میں خلل ڈالنا۔ ان جرموں کی سزا سخت تھی۔ الغرض یہ کہ چندر گپت کے عہد میں تعزیری قانون زیادہ سخت تھا۔

محصول آراضی - ہندوستان میں زرعی قانون کی رو سے آراضی ہمیشہ فرمانروا کی ملک سمجھی گئی۔ اور فرمانروا کو اس پر یا تو پیداوار کی شکل میں یا نقدی کے طور پر محصول لگانے اور وصول کرنیکا حق حاصل رہا ہے۔ اگرچہ "بندوبست آراضی" اور تعین اور وصولی لگان کا طریقہ اور تفصیل جو چندر گپت کے زمانہ میں رائج تھی۔

بہم نہیں پہنچ سکی۔ اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ ہر سال تازہ لگان لگایا جاتا تھا یا مدت بعد
لیکن یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ کہ رعایا پیداوار آراضی کا چوتھائی حصہ آج
کو دیتی تھی۔ اس طرح یہ بھی یقینی ہے کہ کل ملک میں شرح لگان یکساں نہیں تھا۔

آبپاشی۔ ہندوستان میں آبپاشی کا سوال سب سے اہم اور ضروری ہے۔
کچھ شک نہیں کہ چندر گپت نے ایک خاص محکمہ آبپاشی قایم کیا۔ جس کے سپرد
آراضی کی پیمایش اور پانی کی مقدار وغیرہ کا کام تھا۔ پانی کی مقدار کے لحاظ سے
پانی پر محصول لگایا جاتا تھا۔ کاٹھیاوار کی پہاڑی چٹان گرنار پر جو کتبہ سنہ ۱۵۰ قبل
مسیح میں کندہ کرایا گیا۔ اس سے چندر گپت کے زمانہ میں آبپاشی کے وجود کا پتہ
لگتا ہے۔ گرنار چندر گپت کے پایہ تخت سے کوئی ایک ہزار میل اور بحر عرب کے
نزدیک ہے۔ لیکن چندر گپت نے اپنے سالے پشیا گپت کو جو مغربی
صوبوں کا وائسرائے تھا گرنار کی آبپاشی کا انتظام کرنے کے لئے حکم دیا۔ اس نے
ایک چھوٹے سے دریا کو بند کے ذریعہ سے روک کر ایک جھیل بنائی جس کا نام
سودرسن رکھا۔ اس جھیل کا پانی آبپاشی کے لئے مخصوص تھا۔ مگر یہ بند کئی بار ٹوٹا
کئی بار از سر نو بنایا گیا۔ مگر آخر کار پھر ٹوٹ گیا۔ اور جھیل کا نشان تک باقی نہ رہا۔ البتہ
اس کا ذکر ایک کتبہ میں ضرور موجود ہے۔ ایک تو اس امر سے کہ گرنار جیسے دور دراز
صوبہ میں آبپاشی کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور دوسرے میگاستھینز کی تحریر سے یہ بات
یقین کے درجہ تک پہنچ گئی ہے۔ کہ چندر گپت کی کل سلطنت میں آبپاشی کا رواج
تھا۔ چنانچہ میگاستھینز لکھتا ہے کہ "سرکاری افسر آراضی کی اس طرح پیمایش
کرتے تھے جس طرح کہ مصر میں کی جاتی تھی۔ مزید برآں وہ ان موریوں کا بھی معائنہ کرتے
تھے جن کے ذریعہ سے نہر کی شاخوں میں پانی جاتا تھا۔ تاکہ ہر شخص اپنی ضرورت کے
مطابق پانی حاصل کر سکے۔

سڑکوں کا انتظام۔ ایک خاص محکمہ کے افسروں کے متعلق سڑکوں کے بنانے صاف رکھنے اور آدھ آدھ کوس کے فاصلہ پر پتھر کے نشان یا ستون نصب کرنے اور نشان اور تھونیاں لگانیکا کام سپرد تھا۔

نتیجہ۔ مذکورہ بالا باتوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ چندرگپت کے زمانہ میں اور اس سے پیشتر سکندر اعظم کی فوج کشی کے وقت ہندوستان میں فوجی اور سول انتظام بہت عمدہ تھا جس کا صدیوں کی اصلاح اور ترقی کے بعد ظہور ہوا ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ چندرگپت سے کئی صدیاں پیشتر بھی ہندوستان میں ایک اعلےٰ درجہ کی تہذیب و شائستگی موجود تھی۔ جس کا غیر ملکوں کے مشہور اور مستند مورخوں اور پتھر کے ستونوں پر کے کتبوں اور سکوں کی تحریروں سے بخوبی پتہ لگتا ہے۔

ٹھاکر سکھرام داس چوہان بالک راجپوت گزٹ

تصویر:- آج کے "مخزن" کو حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کی تصویر سے مزین کیا جاتا ہے۔ جو علامۂ عصر۔ سیاح۔ جہانیاں جہاں گشت۔ آزمودہ کار۔ فصیح البیان مقرر۔ بذلہ سنج شاعر۔ عالم باعمل۔ فاضل بے بدل بزرگ گذرے ہیں شیخ کی نسبت یہ مسلمہ ہے کہ کئی زبانوں کے ماہر اور اپنے وقت کے مروجہ علوم میں قادر تھے۔ شاعری کے اعتبار سے آپ فارسی زبان کے ان تین شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں جن کا پایہ نہایت افضل تھا۔ اور جو لسان الغیب تھے۔ اگر فارسی علم ادب سے شیخ کی تصانیف کو خارج کر دیا جائے۔ تو وہ بہت ہی پھیکا رہ جاتا ہے۔ نظم و نثر دونوں کے لحاظ سے آپ نہ صرف سبق آموز مصنف تھے۔ بلکہ معلم الاخلاق بھی مانے گئے ہیں۔ ایڈیٹر

حکیم افلاطون

(سلسلہ تاریخ الحکماء)

یہ حکیم اٹھائیسویں اولمپیاد کے پہلے سال میں پیدا ہوا۔ اور اکاسی سال کی عمر میں قضا کر گیا۔ اپنے وفور علم و شہرت کی وجہ سے افلاطون آلہی کے نام سے مشہور تھا۔ شہر ایتھنز میں پیدا ہوا۔ اور مشہور دس آدمیوں میں سے تھا۔ اس کے باپ کا نام ارسطون تھا۔ جس کا سلسلہ نسب قدروس تک پہنچتا ہے۔ اور والدہ کا نام پیریقتون تھا جس کا نسب سولون تک منتہی ہوتا ہے۔ اس حکیم کا نام ارسطوقلیس رکھا گیا تھا لیکن چونکہ یہ بہت موٹا تازہ۔ قوی ہیکل اور لمبے چوڑے کلے جبڑے کا آدمی تھا۔ اس لئے افلاطون کے نام سے مشہور ہو گیا۔

کہتے ہیں۔ کہ بچپن میں ایک شہد کی مکھی نے اس کے منہ پر شہد ٹپکا دیا جس سے یہ فال لی گئی کہ یہ لڑکا نہایت فصیح و بلیغ ہو گا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ یہ اس فن میں یونان بھر میں شہرت رکھتا تھا۔ بچپن ہی سے شعر کہنے لگا۔ اور دو قصیدے بے مروتی زمانہ پر ایسے لکھے کہ بڑے بڑے شعرا دنگ رہ گئے۔ جب افلاطون نے فلسفہ کی طرف توجہ کی ہے تو یہ دونوں قصیدے جلا ڈالے۔

بیس برس کی عمر تھی کہ افلاطون کے باپ نے اس کو تعلیم کے لئے سقراط کے سپرد کر دیا۔ لکھا ہے۔ کہ ایک رات پہلے سقراط نے یہ خواب دیکھا تھا کہ اس نے ایک چھوٹی سی چڑیا پکڑ کر اپنے سینہ سے لگالی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس چڑیا کے بازو نکل آئے اور پر پھیلا کر آسمان کی طرف اڑ گئی۔ اور نہایت خوش آوازی کے ساتھ گانے لگی۔ صبح ہی کو افلاطون اس کی شاگردی میں دیا گیا۔ تو سقراط نے خواب کی یہ تعبیر کی کہ وہ چھوٹی سی چڑیا یہی افلاطون ہے۔ جو بہت جلد بڑی شہرت

حاصل کرنے والا ہے۔ افلاطون بھی عمر بھر نہایت تعظیم کے ساتھ سقراط سے پیش آتا رہا۔ اور اس کے مرنیکے بعد اقراطولس سے ملا۔ جو ہیرقلیطس کا مقلد تھا۔ اور پھر حکیم ہرموجینس سے ملا۔ جو برمنیدس کا مقلد تھا۔ جب افلاطون کی عمر ۲۸ سال کی ہوئی تو وہ شہر میغار جاکر سقراط کے باقی شاگردوں سے ملا اور اسی موقعہ پر حکیم آقلیدس سے بھی ملاقات ہوئی۔ پھر شہر قیروان گیا اور وہاں جاکر علم ہندسہ سیکھا۔ وہاں سے ملک اٹلی گیا۔ اور فیلولیوس اور ارخنیاس طارنتی اور یتوس سے جو حکیم فیثا غورس کے مشہور شاگردوں میں سے تھے ملا۔ اس پر بھی قناعت نہ کرکے مصر گیا۔ اور وہاں کے حکیموں سے بھی ملا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ہندوستان کے علماء سے بھی ملے۔ لیکن چونکہ اس زمانہ میں بازار جنگ وجدل گرم تھا۔ اس لئے یہ ارادہ فسخ کردیا۔

ان تمام سفروں سے فارغ ہو کر وہ اثینہ واپس آگیا۔ اور ایک چھوٹے سے گاؤں مسمیٰ اکدمیہ میں اس لئے سکونت پذیر ہوا کہ وہاں کی آب و ہوا چونکہ غیر معتدل تھی۔ اس لئے اس کے بدن کی موٹائی کچھ کم ہو جائے۔ اور طبیعت اصلاح پر آجائے چنانچہ اس تدبیر سے افلاطون کو نفع ہوا۔ یہاں قیام کرنے پر اسے کامل ڈیڑھ برس چوتھیہ بخار رہا۔ اور جب علاج معالجہ سے بخار ٹوٹا۔ تو وہ اصلی حالت پر آگیا۔

افلاطون کو تین مرتبہ شرکت جنگ کا موقعہ ملا۔ اوّل مملکت تناغرہ میں۔ دوسری دفعہ شہر قورنتہ میں۔ اور تیسری دفعہ جزیرہ ویروس میں۔ اس مرتبہ اس نے اپنے فریق کی مدد بھی کی تھی۔

تین مرتبہ وہ مملکت سسیلیا میں بھی گیا تھا۔ پہلی مرتبہ پچاس برس کی عمر میں سیاحت اور آتش فشاں پہاڑ کے دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ اسی موقعہ پر وہ مشہور ظالم بادشاہ دینس سے بھی ملا۔ جو اس سے ملنے کا بہت ہی خواہشمند تھا۔ افلاطون نے جرأت کرکے امور سلطنت کے متعلق بھی اس سے گفتگو کی جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اگر دیونی

اور ارسطو میں اس کی سفارش نہ کرتے۔ تو افلاطون ضرور قتل کر دیا جاتا۔ اب اس سفارش پر اس ظالم بادشاہ نے اس حکیم کو بولیدس کے حوالے کر دیا جو اس کی طرف سے ملک لقدمونیہ میں سفیر تھا۔ اور یہ حکم دیا کہ وہ افلاطون کے ساتھ وہی سلوک کرے جو غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بولیدس اس کو شہر چینا میں لیکر پہنچا اور لبطور غلام اس کو بیچدیا۔ اتفاق سے اس شہر کے لوگوں نے یہ عہد کر رکھا تھا۔ کہ اثینا کا جو کوئی آدمی ان کے جزیرے میں پہنچیگا تو اُسے قتل کر ڈالیں گے۔ چنانچہ انھوں نے چاہا کہ افلاطون کو قتل کر کے اپنا عہد پورا کرلیں لیکن بعض بڑے آدمیوں نے اس حکیم کی سفارش کی اور یہ کہا۔ کہ اگر تم کو اپنا عہد ہی پورا کرنا ہے۔ تو کسی اَور کا انتظار کرو۔ اور اتنے بڑے حکیم کو قتل نہ کرو۔ یہ سفارش کارگر ہوئی۔ اور افلاطون کی جان بچ گئی اور اس کی خوش قسمتی سے انقرسیس قیرانی نے جو وہاں آیا ہوا تھا۔ اس کو خرید لیا اور اثینا پہنچا دیا۔

بولیس کو قہر یاس نے اس جرم میں غرق کرا دیا کہ اس نے افلاطون کو غلام بناکر فروخت کر دیا تھا۔ اور ظالم بادشاہ دینیس کو جو خبر پہنچی کہ افلاطون بخیریت اپنے وطن اثینا میں پہنچگیا ہے۔ تو وہ ڈرا کہ لوگوں کو برانگیختہ کر کے مجھ سے بدسلوکی کا بدلہ نہ لے۔ چنانچہ اس نے افلاطون سے معافی مانگی۔ حکیم نے جواب دیا کہ تمہارے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اطمینان رکھو کہ مجھکو میرے اشغال علمی کب اتنی مہلت دیتے ہیں۔ کہ میں انتقام کے لایعنی خیال کیطرف توجہ کروں۔ افلاطون کے بعض دشمنوں نے مشہور کیا کہ فی الاصل بادشاہ دینیس طرح دے گیا ہے۔ اور چند روز کے لئے اُسے چھوڑ دیا ہے۔ افلاطون نے کہا کہ دینیس بیچارہ مجھے کیا چھوڑتا میں نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔

دوسری مرتبہ افلاطون جزیرہ سیسلیا میں اس تقریب سے گیا تھا کہ متذکرہ بالا بادشاہ

ونیس کے بیٹے کو وعظ و نصیحت کر کے ظلم سے روکے۔ اور رعایا کو آزادی دلوادے۔ اس دفعہ افلاطون چار مہینہ وہاں رہا۔ اور جب دیکھا کہ اس کے پند و نصائح کچھ کارگر نہیں ہوتے بلکہ ناعاقبت اندیش بادشاہ نے دیون کو ملک بدر کرادیا ہے اور ظلم و ستم کا وہی حال ہے۔ تو وہاں سے چلا آیا۔ اس کے آنے پر بادشاہ نے اور ٹھیرنے کے لئے بہت ہی اصرار کیا۔ مگر افلاطون نے فضول سمجھ کر نہ مانا۔ اور نہایت عزت و حرمت کے ساتھ پھر وطن چلا آیا۔

تیسری مرتبہ افلاطون سیسلیا میں اس لئے واپس گیا تھا کہ دیون کو پھر بلا لینے کی بادشاہ سے سفارش کرے۔ اور اگر ہو سکے تو جور و تعدی کا خاتمہ کرائے۔ بادشاہ نے پہلے تو وعدہ کر لیا۔ مگر ایفا نہ کیا جس سے افلاطون کو سخت غصہ آیا۔ اور جو کچھ اس کے منہ میں آیا بادشاہ کو کہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے قتل کا حکم ہو گیا۔ ارخیتاس الطارنتی کو بھی اس کی خبر پہنچی۔ اس نے فوراً اپنا آدمی سفارش کے لئے اور ایک جہاز افلاطون کے لئے بھیجا۔ بادشاہ نے اس سفارش پر افلاطون کا قصور معاف کر دیا۔ اور اس کو جہاز میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔ چند روز بعد بخیریت اپنے وطن میں واپس آ گیا اور یہ قصد کر لیا کہ اب کبھی یہاں سے نہ نکلوں گا۔ یہاں اہل اثینا اس سے بہت ہی عزت کے ساتھ پیش آئے۔ اور اسکو اپنا حاکم بنانا چاہا۔ مگر افلاطون نے انکے اخلاق ذمیمہ دیکھ کر اُن کا حاکم بننے سے انکار کر دیا۔ باوجود اس کے تمام لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ اور اس کو محبوب رکھتے تھے۔ سالانہ کھیلوں میں اس کے ساتھ اس طرح پیش آتے تھے۔ کہ جیسے وہ ایک فرشتہ ہے کہ آسمان سے نازل ہو گیا ہے۔ گو یونان کے لوگوں میں سخت اختلاف تھے۔ مگر ان کھیلوں میں شریک ہونے کے لئے تمام یونان اُمنڈ آتا تھا اس لئے افلاطون کی ہر سمت میں شہرت ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی۔ کہ لوگ کھیل تماشوں کو چھوڑ کر اسی کے ہو رہے۔

افلاطون اپنی عمر بھر نہایت خوش خلق رہا۔ حضت وقناعت کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بچپن ہی سے وہ کبھی خواہشات وشہوات کا شکار نہیں بنا۔ وہ شاذ و نادر کبھی ہنستا تھا۔ اپنے نفس پر سخت جابر تھا۔ کبھی کسی پر ناراض نہ ہوتا۔ لکھا ہے کہ اس کا ایک نوکر اپنے وطن واپس گیا۔ تو ایک مرتبہ اس نے اپنے باپ کو کسی پر ناراض ہوتے دیکھا۔ اس شخص کو یہ حالت دیکھکر سخت تعجب ہوا۔ اور بغیر ہنسے اس سے نہ رہا گیا۔ کیونکہ اس نے افلاطون کو کبھی کسی پر ناراض ہوتے ہی نہیں دیکھا تھا۔

افلاطون سوداوی مزاج تھا۔ ہمیشہ غور وفکر میں رہتا تھا۔ ارسطو نے لکھا ہے کہ افلاطون نہایت نرم مزاج اور خوشباش تھا۔ بعض وقت نہایت لطیف مزاح بھی کر لیا کرتا تھا۔ بعض وقت دیون اور زنقراطس کو جو خوش مزاج آدمی تھے اشارہ کر دیتا تھا۔ کہ لوگوں کو اخلاق حمیدہ سکھلائیں۔ اس کے شاگرد بہت تھے۔ ان میں سے اس کا بھانجا اسپوسیپس۔ بوتوت اور ہمنیدون۔ زنقراطس۔ اقلدونی۔ اور ارسطو مشہور تھے۔ تیوفراطس اور دیموشینس کو بھی ان ہی میں شامل کیا جاتا ہے۔ موخر الذکر کی شاگردی کی یہ دلیل بیان کی جاتی ہے۔ کہ وہ ایک مقام پر انطباطر کے حملہ سے بچنے کے لئے جا چھپا۔ انطباطر نے ایک شخص ارغیاس نامی کو بھیجا کہ اس کو وہاں سے نکال لائے۔ لیکن قتل نہ کرے۔ یہ شخص گیا اور حیلے حوالوں سے اس کو وہاں سے نکالنا چاہا۔ اور وعدہ کیا کہ اس کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچیگا۔ لیکن دیموشینس نے نہ مانا۔ اور کہا کہ میں نے زنقراطس اور افلاطون سے سُنا ہے کہ ارواح فنا نہیں ہوتیں۔ بلکہ باقی رہتی ہیں۔ اس صورت میں یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ ذلت کی زندگی کو عزت کی موت پر ترجیح دوں۔

لاثینا اور اکسیوسہ بھی افلاطون کے شاگرد بتلائے جاتے ہیں۔ یہ دونو علماء کا لباس پہنا کرتے تھے۔

افلاطون کو علم ہندسہ کا بڑا اہتمام تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ تعلیم علم فلسفہ کے لئے علم ہندسہ میں مہارت ہونا ضروری ہے۔ آخر میں تو یہانتک نوبت پہنچی کہ اس نے اپنے مدرسہ کے دروازوں پر لکھوا دیا تھا۔ کہ اس میں وہ شخص قدم نہ رکھے جو علم ہندسہ میں ماہر نہ ہو۔

افلاطون کی تمام کتابیں ضائع ہوگئیں۔ البتہ صرف بارہ مکتوبات باقی رہ گئے۔ جو تین اقسام میں منقسم کئے جا سکتے ہیں۔ اوّل وہ کہ جن سے شبہ سوفسطائی کی تردید ہوتی ہے۔ دوئم وہ کہ جن سے جوانوں کی تعلیم کی ترکیب معلوم ہوتی ہے۔ سوئم اس باب میں کہ جوان ہو کر آدمی کو کیا عمل کرنا مناسب ہے۔ ان مکتوبات کی تقسیم اس طرح بھی کیجا سکتی ہے۔ کہ ایک تو خود افلاطون کے اقوال ہیں۔ مثلاً قانون وعظ کہ جس میں اسی حکیم کے اجتہادات ہیں۔ دوئم وہ کہ جو دوسرے حکیم مثلاً سقراط۔ ثیتا۔ یومیدنیس اور زنون وغیرہ کے اقوال ہیں۔ یہ فرق بین طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

افلاطون کا طرز تحریر نہایت پسندیدہ تھا۔ نثر بلیغ لکھتا تھا اور نظم بدیع چنانچہ اس کے شاگرد کا قول شاہد ہے۔ مشہور ادیب قیقرون نے لکھا ہے۔ کہ افلاطون کی عبارت ایسی فصیح و بلیغ ہوتی تھی۔ کہ اگر آسمان سے وحی بھی اُتر آتی۔ تو اس سے بہتر نہ ہوتی۔ بانسیوسس نے افلاطون کو "اوسیبردس" فلسفی (یعنی بلیغ ترین حکیم) لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو افلاطون آلہی اور افلاطون بلیغ کہا جاتا ہے۔

افلاطون نے اپنے مذہب کی بنیاد تین فلسفیوں کے مذہب پر رکھی ہے طبعیات و محسوسات میں اس نے ہیرقلیطس کا ماوراء الطبعیات اور عقلیات میں فیثاغورس کا۔ اور قوانین و آداب میں سقراط کا اتباع کیا ہے۔ موخرالذکر کو افلاطون نے ہر دو مقدم الذکر حکما پر ترجیح دی ہے۔ اور اسکی زیادہ تقلید کی ہے۔

لوطرقس نے اپنی کتاب مسمی آرا الفلاسفہ کے مقالہ اول کے تیسرے باب میں لکھا ہے کہ افلاطون نے تین اصول یعنی خدا - مادہ اور ادراک سے بحث کی ہے۔ اس کا قول ہے کہ خدا بمنزلہ عقل العقول کے ہے۔ اور مادہ ہستی و نیستی کا سبب اول ہے۔ اور ادراک جوہر روحانی ہے۔ کہ ذات خدا کیساتھ قایم ہے ظاہر ہے کہ دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ وہ عدم محض سے مخلوق ہوئی ہے۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالےٰ نے مادہ قدیمہ ہی اس دنیا کو ترکیب دیکر اسکی طرح طرح کی شکلیں بنادی ہیں۔ اسکو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ کہ خدا نے مادہ کو مخفی مقام سے نکالکر ظاہر کردیا۔ اور اسکی شکل و صورت میں ایک دوسرے سے تمیز پیدا کردی۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی معمار پتھر چونہ وغیرہ سے عمارت بنا کھڑی کرے۔

لوگ کہا کرتے تھے کہ افلاطون کو الٰہ حقیقی کی معرفت تامہ حاصل تھی۔ اسکی وجہ خواہ تو اس کی جودت طبع سمجھ لو یا یہ کہ عبرانیوں کی کتابوں سے اسکو یہ علم حاصل ہوا۔ ماری یونس نے بہت خوب کہا ہے کہ افلاطون ان لوگوں میں سے تھا جن کو معرفت الٰہی پوری طور پر حاصل تھی۔ لیکن اس زمانہ کے لوگوں نے اس کی قدر نہ کی اور گمراہ کے گمراہ رہے۔

افلاطون نے اپنی ایک کتاب میں الہیات کے متعلق لکھا ہے۔ کہ مخلوق کے تین مراتب ہیں۔ ایک علویتین متوسطین اور سفلیتین۔ علویین باشندگان آسمان ہیں۔ اور بوجہ اپنے مسکن کے تمام عالم سے بلند تر ہیں۔ انسان اگر ان سے اپنا میل جول پیدا کرنا چاہے تو صرف متوسطین کے ذریعہ سے پیدا کرسکتا ہے۔ یہ متوسطین ہوا میں رہتے ہیں۔ اور جن کہلاتے ہیں۔ اور عالم و علوتین کے درمیان بمنزلہ وزرا کے ہیں۔ کیونکہ ان ہی کے ذریعہ سے اہل عالم کی قربانیاں اور نذریں علوئین تک پہنچتی ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ دنیا کی سرا تسلیم پر ان میں سے ایک ایک حکمراں ہے۔ وہ غیب کے علوم اور کہانت میں منصب سرواری رکھتے ہیں۔ خوارق عادات ان ہی سے سرزد ہوتے ہیں (ظاہر ہے کہ افلاطون کا یہ خیال وجود فرشتگان سے پیدا ہوا ہے کہ جن کا تذکرہ کتب سماویہ میں پایا جاتا ہے) سفلیوں کا

سکن افلاطون نے دریا اور نہریں قرار دیا ہے۔ اور خوابوں اور عجائبات کا منبع ان کو تبلایا ہے
اور بقول افلاطون تمام عناصر عالم و اجزاء عالم سفلیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات
ہمکو نظر آجاتے ہیں۔ اور اکثر اوقات ہمسے پوشیدہ رہتے ہیں ظاہر ہے کہ غیر متمدن اقوام کے
اکثر حکمار نے اپنے مذہب کی بنیاد اسی پر رکھی ہے اور سفلیات وغیرہ میں اسی اصل پر اپنی کتابیں تصنیف کی ہیں

افلاطون تناسخ ارواح کا اسی طرح قائل تھا جسطرح فیثاغورس۔ لیکن آخر میں اس نے ایک
خاص مسلک قایم کر لیا تھا جو اسکی تقریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ بقاء روح کے مسئلہ میں تیزی
طبع نے افلاطون کو سخت مغالطہ میں ڈالدیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ روح دو اجزا سے مرکب
ہے۔ ایک جسمانی دوسرا روحانی۔ روح کا وجود جسم کے وجود میں آنیسے پہلے موجود رہتا ہے اور
جسم کے موجود ہوجانیکے بعد آسمان سے اُتر کر اس میں داخل ہوجاتی ہے۔ اور پھر جسم سے
نکلکر آسمان پر عود کرجاتی ہے۔ اور پھر ایک مدت کے بعد کسی اور جسم میں داخل ہوجاتی ہے
اور اسی طرح مختلف اجسام میں داخل ہوتی رہتی ہے۔ اور آسمان و دنیا کے درمیان
یہی دور لگائے رکھتی ہے۔ افلاطون کا یہ عقیدہ تھا کہ روح بالکلیہ خالی نہیں رہتی۔ کیونکہ اس
نے یہ پایا تھا کہ اجسام سے پہلے اس کا وجود موجود رہتا ہے۔ بس اسی سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ
ہر روح نئی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہی ہوتی ہے جو پہلے آسمان پر عود کر چکی ہوتی ہے۔ اور
اسی سے یہ سمجھ لیا کہ پہلے روح کا وجود ہوتا ہے اور پیچھے جسم کا۔

اس حکیم کی رایوں کا زیادہ ذکر کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا بہتر ہو کہ مختصراً یہ کہدیں کہ افلاطون
کا مذہب اکثر صورتوں میں نہایت شان عالی رکھتا تھا۔ اور بیشک وہ اسی قابل تھا کہ
اس کو افلاطون الٰہی کا خطاب دیا جاتا۔ اور حکما میں درجہ و رتبۂ عالی پاتا۔

اس حکیم نے اکیاسی سال کی عمر میں اسی دن وفات پائی جس دن کہ
وہ پیدا ہوا تھا۔

مولوی محمد خلیل الرحمٰن

ہائے تو کہاں؟

ایک عاشقِ مہجور کی باتیں

دل آویز۔ دل آویز۔ دل آویز میری جان۔ میرا ایمان۔ میری آرزو۔ تو کہاں ہے؟ میرے دردِ دل کی دوا۔ میری زندگی کا سہارا۔ میری اُمید کا آسرا۔ میری جان کی مراد۔ تو کہاں ہے؟

تو میری نجات کا وسیلہ ہے۔ میں عشق اور وہ بھی عشق مجازی میں نجات کا طالب ہوں۔ اے میری مکتی داتا۔ یہ نجات تیرے ہی دم قدم سے نصیب ہوسکتی ہے۔ تو میرے لئے کیا ہے؟ اسے تو یہ دل ہی جانتا ہے۔ یا وہ برتر ہستی جس نے مجھے تجھے دونوں کو پیدا کیا ہے۔

میری داتا سُن! اُلجھنوں میں ہوں۔ گردشوں میں ہوں۔ آفتوں میں ہوں۔ بے قراری دیکھ۔ آہ وزاری دیکھ۔ اشکباری دیکھ۔ داتا دل آویز آنسو دے جن میں نہاؤں اور فرقت کی مصیبت کا غبار دل سے دہوؤں۔ سوزش دے تڑپوں۔ لوٹوں رقص بسمل کا تماشا دکھاؤں۔ کوہکن کا سا دل۔ مجنوں کا قلب مضطر عطا کر۔ نل کا سا اشتیاق بخش۔ رام کی سی محبت دے۔

دل آویز تجھے کس نام سے یاد کروں۔ جانی کہوں یا پیاری۔ دل آویز کہوں یا دل نواز۔ لکھو کہوں یا بچھو۔ معراج کہوں یا چھراج کس لقب سے یاد کروں۔ کیونکہ جتنے نام نظر آتے ہیں۔ چاہے وہ تیرے اصل نام ہوں یا فرضی یا نسبتی۔ لیکن تجھ میں جو خوبیاں ہیں۔ اُن کے آگے سارے نام ہیچ ہیں۔ اور ناموزوں۔ "دل آویز" ہی ایک ایسا نام ہے جو تیرے لئے اس مناسبت سے موزوں ہے۔

جو میرے تجھ سے تعلقات قلبی سے واسطہ رکھتا ہے۔

دل آویز! تو میری معبود ہے۔ تو میری مسجود ہے۔ تو میرا قبلہ ہے۔ تو میرا یروشلم ہے۔ تو میری گنگا ہے۔ تو میری مراد کی منزل مقصود ہے۔ خدا کے ہوتے ہوئے میں بندہ کا بندہ بنا ہوا ہوں۔ دیکھ مجھے مصیبت سے نجات دے۔ اپنا سودا دے کہ در آستاں سے سر ٹکراؤں۔ اپنا جنون دے کہ مجنوں بنکر بادیہ پیمائی کروں۔ اپنا خبط دے کہ مخبوط الحواس بنکر لسان الغیب کی شکل میں راز نہانی کھولوں۔ اپنا خیال دے کہ عالم خیال میں محو رہوں۔ اپنی محبت کا وہ جذبہ دے کہ سرشار رہوں۔ منصور بنوں دار پر چڑھوں۔

دل آویز! اُسن! عزت تجھ سے۔ ذلت تجھ سے۔ راحت تجھ سے۔ مصیبت تجھسے تجھ سے کیا نہیں ہے کہ میں کسی اَور کو دل میں جگہ دوں۔ یا کسی اَور کا آسرا لوں۔ یا کسی اَور کے پاس اپنی آرزو لیجاؤں۔ تیرے پاس سب کچھ ہے۔ جو چاہے دے۔ سب قبول

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

دل آویز۔ تیری صورت۔ تیری چال ڈھال۔ تیری ادائیں۔ تیری حرکتیں۔ تیرا ناز۔ تیرا قد وقامت۔ تیری باتیں۔ ان سب کی تصویر ہر دم آنکھوں میں ناچتی رہتی ہے تو دور ہے۔ مگر آنکھوں میں بسی ہوئی ہے۔ دل میں سمائی ہوی ہے۔ گو تو میرے سامنے نہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہیں کہیں ہوگی۔ جیسے کہ میرے پاس رہتے ہوئے دو چار منٹ کیلئے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ اب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہیں کہیں ہوگی۔ جیسے کبھی کبھی مجھ سے روٹھکر یا ناز آفرینی او نیاز بینی کے لئے میرے پاس سے ہٹ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ اب بھی میری آنکھوں میں یہی نقشہ کھنچا رہتا ہے۔ یہ ایک قسم کی ڈھارس ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو جان حزیں تڑپ کر جسم خاکی سے پرواز کر جائے۔

دل آویز! فرقت سب سے بڑی مصیبت ہے جس کا جھیلنا بھی مصیبت سے کم نہیں۔ آسمان بھی اس کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ لیکن میرا یا کسی اور عاشق صادق کا ننھا سا دل اس کے صدمہ سہ سکتا ہے۔ اس کی چوٹیں برداشت کرسکتا ہے۔ اسکی ٹھوکر جھیل سکتا ہے۔ اس کی گردشیں سنبھال سکتا ہے جو عاشق صادق ہے وہ اس مصیبت میں بھی راحت کے مزے پاتا ہے۔ وہ فرقت میں بھی لطف زندگی اٹھاتا ہے۔

دل آویز۔ تو میرے لئے سب کچھ۔ تو نہیں تو کچھ نہیں۔ نہ آرام۔ نہ چین۔ نہ قرار نہ سکون۔ تیرے بغیر یہ حالت ہے کہ "کل نہ پڑت مورے شام تم بن"۔

اس لئے مجھے تیری خواہش ہے۔ تیری جستجو ہے۔ تیری آرزو ہے۔ تیری لگن ہے۔ تیری لو ہے۔ گو تو میرے پاس نہیں۔ لیکن دل میں ہے۔ اس دل سے تیرا دور رہنا ناممکن۔ یہ نہ سمجھ کہ سینکڑوں کوس کا فاصلہ پر دور بیٹھ کر کشیدہ خاطر ہو کر ناخوش ہو کر تو میرے دل سے نکل سکتی ہے۔ ارے یہ خیال خام ہے تجھ سے اس دل کا تعلق یہ ہے کہ

ہاتھ چھڑائے جات ہو نبھل جان کے موئے
ہردے میں سے جاؤ گے تو مرد بدوں گی توئے

پھر اس دور بھاگنے سے کیا حاصل؟ دل آویز! یہ دن۔ فرقت کے دن۔ ہاں مصیبت کے دن۔ کیونکر کٹیں گے۔ تو یاد آتی ہے۔ تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سینہ سے ایک جوش سر اٹھاتا ہے۔ جو دل وجگر کو تڑپاتا ہوا دماغ کو پریشان کرتا ہے۔ اور بخار بنکر آنکھوں سے آنسوؤں کا چھم چھم چھم چھم مینہ برساتا ہے۔ یوں عارضی سکون ملتا ہے جس کے بعد پھر وہی تڑپ۔ وہی بیقراری۔ وہی گریہ وزاری۔ وہی تنہائی وہی بیکسی۔ وہی اداسی۔ وہی ملال۔ وہی اضمحلال۔ مصیبت زدہ دل ودماغ پر طاری ہوتے ہیں۔

دل آویز! فرقت کا اثر کیسا زبردست ہے۔ اسمیں ہفت رنگی پائی جاتی ہے۔ اِسکے سائے تلے آ کر کبھی دماغ میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے۔ کہ میں اب مرا۔ اب چلا۔ اب دم فنا ہوا۔ اب جان نکلی۔ اب جسم و جان میں جدائی ہوئی۔ وہ موت کا فرشتہ آگیا۔ گویا زندہ ہوتے ہوتے بھی مردہ ہو جاتا ہوں۔ اور یہ سمجھکر کہ کوئی جھجھے ۔۔ نیوالا بھی نہیں۔ اور نوحہ گری نہ صرف دنیا کی رسم بلکہ عاشقوں کا شیوہ اور اُنکی سنت ہے۔ اپنی لاش پر آپ ہی ماتم کرنے لگتا ہوں ؎

یوں شبِ ہجر یں کرتے ہیں غلط غم اپنا مردہ خود بنتے ہیں خود کرتے ہیں ماتم اپنا

دل آویز! جب جوش وحشت جولانیوں کرتا ہے۔ تو جنگل میں لیجاتا ہے۔ تیری صورت کو سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ تیری پرستش کرتا ہے۔ رولاتا ہے۔ گڑ ہاتا ہے۔ تڑپاتا ہے۔ سر دھنواتا ہے۔ سینہ کوبی کراتا ہے۔ درختوں سے بغلگیر کراتا ہے۔ اور عجب عجب کیفیت سے پالا ڈلواتا ہے۔

دل آویز! فرقت ایک مداری ہے۔ جو مجبور عاشق کو طرح طرح کے ناچ نچاتا ہے۔ عاشق ہی کہ اپنے دل سے آپ ہی باتیں کرتا ہے۔ کبھی نڈھال ہو جاتا ہے۔ کبھی یکایک گہری سانس بھرتا ہے۔ کبھی نالہ کھینچتا ہے۔ کبھی خود بخود رو پڑتا ہے۔ کبھی دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی رونی صورت بنا لیتا ہے۔ کبھی محو حیرت ہو جاتا ہے۔ کبھی بت کیطرح خاموش ہو جاتا ہے۔ کبھی سراپا درد کی تصویر بنجاتا ہے۔ نہ تن کا ہوش ہے۔ نہ زندگی کی پروا۔ نہ بدنامی کا خیال۔ نہ رسوائی کی فکر یہ ساری باتیں ناچ نہیں تو اور کیا ہیں ؟

دل آویز! لوگ بدنامی سے ڈرتے ہیں۔ رسوائی سے کوسوں بھاگتے ہیں۔ ذلت کے نام سے کانپتے ہیں۔ آبروریزی سے جی چراتے ہیں۔ مگر تیرا عاشق ہجو بدنامی کو نیکنامی سمجھتا ہے۔ رسوائی کو زندگی کی زینت خیال کرتا ہے۔ ذلت کو عزت مانتا ہے۔ اور آبرو ریزی کو کمال شہرت جانتا ہے۔ نیز اد لداوہ ایکطرح تو بدنصیب ہے یعنی یہ کہ تو اس سے دور ہے۔ مگر دوسری طرح سب سے زیادہ خوش نصیب ہے یعنی یہ کہ تو اس کے دل میں ہے۔ تو نے اسے وہ چیزیں عطا کی ہیں جو سات بادشاہی دیکر بھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔ وہ کیا؟

تڑپ ۔ جلن ۔ بیقراری ۔ آہ وزاری ۔ سینہ کوبی ۔ بےخوابی ۔ کم خوری ۔ غم خوری ۔

خونِ دل ہے پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو
یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

اہاہاہا ۔ دیکھ تو میں کس قدر خوش نصیب ہوں ۔ مجھے کتنی اور کیا کیا نعمتیں ملی ہیں ۔

دل آویزا تو یہ سمجھتی ہے کہ تیرے مجھ سے دور رہنے یا ناخوش ہو بیٹھنے میں تجھے بھول جاؤنگا تیرا خیال چھوڑ دونگا ۔ تیری محبت دل سے نکال دونگا ۔ تیرا یہ خیال بالکل غلط ہے ۔ یہ ممکن نہیں ۔ ارے او دل میں بسنے والی دیوی ۔

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے
تو ہو کے ترش رو مجھے گالی ہزار دے

آزما ۔ ایک بار نہیں جتنی دفعہ جی چاہے آزمالے ۔ کوشش کر لے ۔ اپنا سارا زور لگالے تمام ترکیبیں کر ڈال کیا مجال کہ تیرا سودا اس سر سے نکل جائے ۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں ۔ کہ اگر تجھ میں قدرت ہے ۔ تو تو میرے دل سے نکلجا ۔ یہ کیا ہوا کہ تو دور ہو گئی بات تو جب ہے کہ دل سے بھی دور ہو جائے ۔

دل آویزا تو کہیں رہ کسی حال میں رہ ۔ کسی رنگ میں رہ ۔ جو چاہے کر ۔ دنیا اودھر سے اُودھر ہو جائے ۔ پہاڑ چلنے لگیں ۔ پانی آگ کا کام دینے لگے ۔ آگ پانی بن جائے ۔ زمین آسمان کی جگہ لے لے ۔ آسمان زمین ہو جائے ۔ آفتاب کا شانہ مشرق کی بجائے مغرب سے نمایاں ہونے لگے ۔ کنول کے پھول جو پانی سے پیدا ہوتے ہیں پتھروں سے پیدا ہونے لگیں ۔ یہ سب کچھ ممکن ہے ۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ تو اس دل سے نکلجائے جس طرح تقدیر نہیں بدل سکتی اسیطرح سچے عاشق کا دل بھی نہیں بدل سکتا ۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تجھ میں قدرت ہے تو اس دل کو بدل دے ۔ اس سے اپنا خیال دور کر دے ۔ اس سے نکلجا ۔ جب تو یہ نہیں کر سکتی تو مجھ سے دور بھاگنے سے کیا نتیجہ ۔ میں کہتا ہوں کہ تو کہاں ہے ؟ میں سب ستو

اس دل میں براجمان ہو۔ دل تیرا ہے۔ یہ تیرا ہوچکا ۔ یہ ہمیشہ کے لئے تیرا ہے۔ یہ دل ایک ہے اسمیں ایک ہی چیز سما سکتی ہے۔ اسمیں ایک ہی کیلئے جگہ اور گنجایش ہے۔ اور وہ "ایک" تیری ذات ہے۔

دل آویز! میںنے تجھے کیا دیا اور تجھ سے کیا لیا؟ سُن! میںنے تجھے عزت نہیں دی دولت نہیں دی۔ روپیہ نہیں دیا۔ راحت نہیں دی جائداد نہیں دی مگر سب سے قیمتی چیز تیرے نذر کردی۔ وہ کیا؟ یہ دل جس میں تو سمائی ہوئی ہے۔ اب سُن کہ میں نے تجھ سے درد لیا جنون لیا۔ خبط لیا۔ سودا لیا۔ غم لیا۔ گریہ لیا۔ آہ لی۔ تڑپ لی۔ شورش لی۔ نالہ لیا۔ ناامیدی لی۔ مایوسی لی۔ رسوائی لی۔ ذلت لی۔ بدنامی لی۔ مصیبت لی۔ اور سب سے بڑی چیز لی۔ وہ کیا؟ ناکامی!

دل آویز! سب سے بڑا کام جو تو کرسکتی تھی۔ وہ تونے کرلیا۔ یعنی مجھے غم فرقت دیا۔ تو نے میری دلفریبی کی۔ میرا دل اپنا غلام بنا لیا۔ مگر جو کام تجھے کرنا چاہیے وہ ابھی باقی ہے بات توجب ہے کہ وہ بھی کر دکھائے۔ وہ کیا؟ دلنوازی۔ یعنی مجھ پر نوازش کر۔ اگر یہ منظور نہیں تو ایک اور کام کر۔ وہ کیا؟ میری زندگی کا خاتمہ کردے۔ میری مٹی خراب نہ کر بلکہ اپنے ہاتھ سے اسے ٹھکانے لگادے۔ اس کا تجھے نیک اجر ملیگا۔ اگر یہ بھی منظور نہیں۔ تو تیری مرضی۔ میرا کچھ زور نہیں۔ میں تو اب بھی وہی ہوں جو پہلے تھا۔

دل آویز! آخری التماس۔ آ۔ آ۔ اے جان آ۔ اپنے داس کو درشن دے اپنے متوالے کو ہوش میں لا۔ آ میچا۔ اپنے کشتہ کو زندہ کر۔ آجا نا۔ جلوہ دکھا۔ روپ سروپ دکھا۔ آ جلوہ افروز ہو۔ آنکھ بھبوش اور من سنتوش ہو۔ کس کی دنیا۔ کس کی آخرت۔ کس کی زندگی۔ کس کی موت۔ کیسا خدا۔ کیسی خدائی۔ کہاں کا عذاب۔ کہاں کا ثواب۔ کیسی راحت۔ کیسی مصیبت۔ گھر بار۔ ماں باپ۔ بھائی بہن۔ اپنے بیگانے۔ کس کے؟ یہ سب فرضی اور خیالی ہیں۔ ان میں سے میرا کوئی

بھی نہیں ۔ اور نہ میں کسی کو اپنا سمجھتا ہوں میرے لئے تو ہے حقیقت تو ہے جو کچھ ہے تو ہی تو ہے تیری محبت کا چشمہ اور اس میں اشنان ۔ اسی میں ہیں میرے لئے دونو جہان ۔ سچ ہے

میری زندگی ہی مری جان ہے
مرا دین ہے میرا ایمان ہے ۔

آ ۔ آ ۔ آ ۔

دل آویز! ذرا اپنے نام کا سمرن سن لے جو خود بخود ہر وقت میرے دل میں ہوتا رہتا ہے ۔ وہ یہ ہے کہ

تم میری جگہ ہوتے تو مجھپہ فدا ہوتے — وہ چاہ تمہیں ہوتی ہرگز نہ جدا ہوتے
اے جان ذرا سُن لو الفت کا مزہ جب تھا — میں تمپہ فدا ہوتا ۔ تم مجھپہ فدا ہوتے
انجام محبت کا آخر کو یہی ہوتا — میں بندہ بنا رہتا تم میرے خدا ہوتے
سینہ میں چھپے رہتے اور دل میں بسے رہتے — تم دل کی ادا ہوتے تم دل میں سدا ہوتے
ٹھوکر سے تری مٹتے ۔ اعجاز عطا ہوتا — ہم قبلۂ صنعت ہوتے ۔ ہم خاک شفا ہوتے
کوچہ میں ترے مرتے رتبہ یہ ہمیں ملتا ۔ — ہم دردِ محبت کی دنیا میں دوا ہوتے

گر عجز ہی لکھا تھا قسمت میں میاں ساغر
وہ شاہجہاں ہوتے ہم انکے گدا ہوتے

منور خاں ساغر اکبر آبادی جرنلسٹ (علیگ)

زمیندارہ بنک ۔ منشی جلال الدین سکرٹری انجمن زمینداران نے اس مختصر رسالہ میں زرعی زمیندارہ بنکوں کے فوائد و نتائج اور اُس کا شرعی جواز نہایت تفصیل کیساتھ لکھکر اس غرض سے شائع کیا کہ مسلمان زمیندار و ں میں اس جائز کام کی رغبت ترقی کرے قابل دید رسالہ ہے قیمت چار آنہ ملنے کا پتہ : دفتر انجمن زمینداران [illegible] لاہور

موجِ دریا

(ایک آبدار نظم - خاص مخزن کے لئے)

ہمارے نالۂ ہجراں کا آیا جوش میں دریا
نہ آئے تم۔ تو شب کو آگیا آغوش میں دریا

شراب ناب سے ہی بیخودی کا جوش میں دریا
نہیں کھیا ہی ایسا ہمنے اپنے ہوش میں دریا

نہایت بدمزہ ہوتا نہ ہرگز نوش میں دریا
اٹھا کر سر اگر آتا نہ اتنے جوش میں دریا

ان افتادوں کو۔ کوئی کم نہ سمجھے سربلندوں سے
گرا دے کوہ کو آجائے جب دم جوش میں دریا

پسینہ چوٹی کا ایڑی تک آجاتا ہے محنت میں
غم دوراں سے بہتا ہے مری پاپوش میں دریا

رلاتی ہے تمہاری مچھلیوں کی آب فرقت میں
ہماری آنکھ میں آنسو۔ تمہارے گوش میں دریا

کبھی مرجھا نہیں سکتی ہے کھیتی بادہ خواروں کی
کہ جاری ہے ہمیشہ ساغر مینوش میں دریا

دل اکثر ہمت کم مایہ سے سیراب ہوتا ہے
ندی کی طرح سے آتا نہیں ہے نوش میں دریا

ہمارے دیدۂ گریاں تجھیں جانے ہی نہ دینگے؟
گلے ملتے ہی تا گردن چڑھیگا جوش میں دریا

جو سرکش ہیں انھیں بھی خاکساروں سے تعلق ہے
لئے پھرتا ہے چرخ فتنہ گر آغوش میں دریا

سماں گریہ کا میسے۔ انکی آنکھوں میں سمایا ہے
رہاں کس جوش سے ہے دامن مدہوش میں دریا

گھٹا اٹھتی ہے ساقی دیدۂ تر کیوں نہ بن نکلے
کہیں برسات میں رہتا ہے اپنے ہوش میں دریا

کھلی ہے زلف عنبر فام کیا رخسار سیمیں پر
بہا کس آب کا ہے سطح زریں پوش میں دریا

اگر دل میں نہ ہو رقت۔ تو پھر رونے سے کیا حاصل
کہ کام آتا نہیں ہے کشور خاموش میں دریا

کبھی شانہ ہے گیسو میں کبھی لہراتے ہیں گیسو
کبھی ہے جوش دریا میں کبھی ہے جوش میں دریا

حصار آسمان سے کیا گھری ہے سطح دریا کی
نہ ہے قدرت کیا ہے بند کیا سرپوش میں دریا

گنہگاروں کو تیرے بحر رحمت کا بھروسا ہے
کہ دھل جائینگے سب فرد جب آیا جوش میں دریا

نصیبوں میں اگر چکر نہ ہوتا اپنے اے طالب
تو کیوں آتا ہمارے بخت آفت کوش میں دریا

شہرت

کیسا دل خوش کن ہے اے شہرت ترا ذکر و خیال
کس قدر راحت فزا ہے تیرے گلشن کی ہوا

دل فریبانہ تمنائیں تری کیا خوب ہیں
کونسا دل ہی نہیں جس دل میں تو جلوہ نما

تیرا سکہ شرق سے تا غرب جاری ہے مدام
ہے حکومت سب پہ یکساں شاہ ہو یا ہو گدا

جان دیتے ہیں تری سر آن پر مردانہ وار
کیا مصنف کیا بہادر کیا طبیب و پیشوا

جس کو دیکھو چار سو جویاں ہے تیری راہ میں
گبر ہو یا ہو مسلماں - پارسی یا آریا

تیرے ہی صدقے سے اے شہرت ہوا مشہور عام
شکسپیر[1] ورنہ تھا ایسا کہاں کا پارسا[2]

تو نے ایسی قدر دانی کی کہ دنیا بول اٹھی
اس سے بہتر دوسرا شاعر نہ ہوگا اور نہ تھا

وہ ارسطو مانتے ہیں جس کو اہل علم و فن
ایک ادنے بچہ گو تھا تیرے عز و جاہ کا

تو نے ہی اس کی لیاقت پر لگائے چار چاند
تیری ہی کوشش سے اس کے علم کا ڈنکا بجا

تیری عظمت پوچھتا سعدی سے کوئی نامور
کاش فردوسی بتاتا تیرے رتبہ کا پتا

تیرا قائل تھا سکندر تیرا شیدا ورڈس ورتھ[3]
معترف تھے تیرے کالیداس و تلسی برملا

ہم رکابی میں تری رہتے تھے وہ وہ نامور[4]
جن کی تلواروں سے یورپ میں تہلکہ مچ گیا

---

[1] شکسپیر انگلستان کا سب سے بڑا شاعر گذرا ہے۔ بعض اس کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں یہ ایک معمولی جولاہے کا لڑکا تھا لیکن رفتہ رفتہ ترقی کر کے ڈرامانویسی کا استاد بن گیا۔ [2] کہا جاتا ہے کہ شکسپیر کے نزدیک امراء انگلستان کے محفوظ جنگلوں میں سے ہرن چرا لانا کوئی گناہ نہیں تھا۔ [3] ورڈس ورتھ (ملک الشعرا) انگلستان کا ایک بڑا شاعر تھا۔ اس کی شاعری مناظر قدرت پر مبنی تھی۔ [4] نپولین سے مراد ہے جو ایک معمولی آدمی کا لڑکا سپاہی کے درجے سے ترقی کر کے فرانس کا بادشاہ بن گیا تھا۔ تمام اہل یورپ نپولین کے نام سے کانپتے تھے۔ اختر۔

مرتے دم تک تیرا دامن چھوڑنیوالے نہ تھے ۔۔۔ وہ؟ کہ جن پر سایۂ لطف و کرم تیرا رہا

گرچہ تو خود بیں ہے اور رشیدا کام کے ۔۔۔ لیکن اک اتنی گزارش میری بھی سن لے ذرا

انکا کہنا مانیو قایم ہیں جو انصاف پر ۔۔۔ انکی عزت کیجو خوش جن سے کہ ہو خلق خدا

جن کا باطن نیک ہو نیکی کو انکی کر عیاں

ظاہری شہرت کے طالب کو نہ ہرگز منہ لگا

مخمس بر غزل حضرتِ غالب

رنگ دورِ آسمانی اَور ہے ۔۔۔ سر پہ آفت لسپنے آنی اَور ہے۔

حالت سوزِ نہانی اَور ہے ۔۔۔ کوئی دن گر زندگانی اَور ہے

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اَور ہے

کس طرح اے دل ہوں سرگرم فغاں ۔۔۔ آہ میں منہ سے نکلتا ہے دُہواں

بات کرتا ہوں تو جلتی ہے زباں ۔۔۔ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں

سوزِ غمہائے نہانی اَور ہے

جل رہا ہے سوزِ پنہاں سے جگر ۔۔۔ لب پہ نالہ۔ درد کا دل میں اثر

سامنے استادہ ہے باچشم تر ۔۔۔ دیکھیے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر

کچھ تو پیغام زبانی اَور ہے

بارہا دیکھی ہیں تسکی جستجوئیں ۔۔۔ بارہا آئی ہیں مجھ پر آفتیں

بارہا پیدا ہوئی ہیں کاوشیں ۔۔۔ بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں

پر کچھ ابکی سرگرانی اَور ہے

جس کسی پر بیکسی کا ہے ہجوم ۔۔۔ گردشِ افلاک سے ہے بالعموم

کہہ رہا ہے چرخ ظالم جھوم جھوم قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

زندگانی بھر رہے تم تلخ کام عرصۂ ہستی میں بے نیل و مرام
اتنا باسط کا ہے اب تمسے کلام ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

[illegible]

شکر و سپاس

خدایا فہم انسانی سے باہر تیری رفعت ہے تری قدرت میں سب کچھ ہے مسلم تیری قدرت ہے
بشر کے حسب منشا کام کوئی ہو نہیں سکتا کہ وہ جو نظم عالم تیری مرضی تیری حکمت ہے
تو جس کو چاہتا ہے ذلت و خواری میں رکھتا ہے معزز جو ہے اس کو دی ہوئی تیری ہی عزت ہے
فضیلت ایک کو دی ایک پر حکمت یہ تیری ہے ہوا دنیٰ یا ہوا اعلیٰ تیری ہر اک پر عنایت ہے
تو جیسا جس کو رکھے اس کے حق میں ہے وہی بہتر رہے ہر حال میں خوش آدمی یہ آدمیت ہے
یہ کیا کم تیری بخشش ہے کہ دی جان و خرد تو نے بشر کیواسطے اور اس سی بڑھکر کون نعمت ہے
کیا اشرف فرشتوں سی بشر کو کیسی عزت دی بشر میں ہو نہ کوئی شر یہی اس کی شرافت ہے
بنایا کیا سی کیا انساں کو کیا تھا خاک تھا انساں اور اب بھی کیا ہے اک مٹی کا پتلا بالعجب بالغضب ہے
مگر وہ کام کر جاتا ہے تیرے فضل سی انسان کہ اسکی کامیابی پر فرشتوں کو بھی حیرت ہے
کسی حیواں میں کب ہے ذات انساں میں جو جوہر ہے زبان و دل میں کب کے یہ طاقت یہ جسارت ہے
وہ جرأت ہے کہ تجھ سے دید بازی کا یہ ہے خواہاں وہ ہمت ہے کہ اٹھائے دوش پر بار امانت ہے
مظاہر تیری قدرت کے عیاں اسکی بصارت پر ازل سے تیری وحدت آشنا اسکی بصیرت ہے
غرض تیری خدائی بندگی سے اس کی ہے ظاہر نشان وحدت کا تیری نوع انسانی کی کثرت ہے

خدایا یہ شرف انسان کو دیکر نہ خوار اس کو — سوا اس کے کسی پر کب تری ایسی عنایت ہے

تری ہر ایک نعمت کا خدایا شکر ہے واجب — ادا ہو حق شکر ایسی کہاں انساں میں طاقت ہے

خدایا تو نے ایسے عہد میں پیدا کیا ہم کو — کہ حاصل امن و راحت ہے میسر عیش و عشرت ہے

کہاں تھی ریل پہلے ایسا کب سامان میسر تھا — کہاں ایسی تجارت تھی کہ جیسی اب تجارت ہے

ستار اگلے زمانہ میں تھا تار اس عہد میں نکلا — وہ ہے اک ساز عشرت اور یہ سامان راحت ہے

نفیس اشیا نہایت سستے داموں ہمکو ملتی ہیں — کہ انکی خوبیوں کو دیکھکر عالم کو حیرت ہے

نہ ڈر کار ہزنوں کا ہے نہ چوروں کا ہے کچھ کھٹکا — وہ امن و عافیت حاصل سیاست کی بدولت ہے

ترقی وہ ہوئی علم و ہنر کی اس زمانہ میں — کہ نام جہل سے لوگوں کو آتی سخت غیرت ہے

ہوئے ماہر ہنر سے علم سے صنعت سے حرفت سے — کہاں اگلی سی اب لوگوں میں سستی و بطالت ہے

ہوئی ہیں برکتیں حاصل کچھ ایسی اس زمانہ کو — کہ اب ہم آزماتے جاتے ہیں حرکت میں برکت ہے

ارادے پست تھے قعر جہالت میں تھے ہم جبتک — ہنر میں ہو گئے ماہر بلند اب اپنی ہمت ہے

زمانہ کو نہ تھی حاجت ہماری بے کمالی کی — ہوئے کامل کہ کامل ہی کی عالم کو ضرورت ہے

نہ ہونا تھا بجا ہوتی نہیں ہے قدر ناقص کی — مگر اپنا کمال اب اپنے حق میں وجہ عزت ہے

ادائے شکر خالق اے ذہین ہر وقت ہے لازم
کہ اسکی اپنے بندوں پر بڑی مہر و عنایت ہے

کلام اوج

شاید ہے آج عرس کسی بادہ خوار کا — خیمہ کھنچا ہے چرخ پہ ابر بہار کا

پیمانہ بھر چکا ہے کسی بادہ خوار کا — کیا موسم اجل ہے یہ موسم بہار کا

منظور ہو جو سیر تو آجائیے ادھر — گلشن ہرا بھرا ہے دل داغدار کا

بالیں سے وقت نزع خدا کے لئے سٹو — دیکھو نہ دم نکلتے ہوئے جاں نثار کا
عاشق سمجھ کے قامت جاناں کا باغ میں — دیتا ہے سرو میر سے لئے حکم دار کا
وہ دل جلے ہیں دامن صرصر بھی تنگ ہے — بجھتا نہیں چراغ ہمارے مزار کا
سبزہ کی طرح آج ہرا ہے جو داغ دل — اے گل ہے یہ بھی فیض نسیم بہار کا
گیسو ہیں اُن کے دام بچھانیکے واسطے — آنکھوں کو انکے شوق ہرن کے شکار کا
ہم مرمٹوں کے نام مٹے بعد مرگ بھی — باقی نہیں نشان بھی لوحِ مزار کا
نالے یہ بے سبب نہیں بلبل کے باغ میں — ہے اس کے دل میں داغ کسی گلعذار کا
وہ ہانی لباس میں جو کوئی فاتحہ کو آئے — سرسبز ہو چلا ہوا سبزہ مزار کا
نقش قدم سے راہ میں کیا گل کھلا رہیں — جھونکا ہے تیری چال نسیم بہار کا
مرکر بھی اپنے سوز دروں کا ہے یہ عروج — خورشید ایک شعلہ ہے شمع مزار کا
آئی سرہانے بیٹھ کے رونے کو بیکسی — جب گل ہوا چراغ ہمارے مزار کا

مرجھا کے کہہ رہی ہیں یہ کلیاں خزاں میں آج
اب رنگ ہے یہی چمن روزگار کا

تازہ غزلیں

لب زیریں دبا کر بولتا ہے یار چٹکی میں — سما جاتی ہے دُہری ہو کے یہ تلوار چٹکی میں
مسلتا ہے دلوں کو وہ بت خونخوار چٹکی میں — رچا کرتی ہے مہندی خون کی ہر بار چٹکی میں
ترا دیوانہ سمجھا سحر اسس کو اے پری تیرا — جو لینے سے نہ آیا سایۂ دیوار چٹکی میں
گل و بلبل میں کچھ ہونے نہ پائیں آخری باتیں — وہ بالی ملئے کیوں صیاد نے منقار چٹکی میں
بنا لگا ہمارا مست وحشت کیا کوئی گستا — جو ہیں نادر تری دستار کے کچھ تار چٹکی میں

کیا ہے وصل میں بھی خستہ تن کا شغل کچھ ایسا | اُتاری ہجر میں جسم سے ہم بار چکی ہیں
دل پہ داغ کو چمکی ہیں سیکر مجھ سے کہتے ہیں | کہ دیکھو ہم لئے بیٹھے ہیں کل گلزار چکی ہیں
بجا کہ وہ جلا دیتے ہیں اپنے مرنے والوں کو | عیاں ہیں پھر بھی قسم باذن اللہ کے آثار چکی ہیں
کلیجہ بلبلوں کا پھٹتا ہے آکے گلشن میں | مسلتا ہے جو گل وہ غیرت گلزار چکی ہیں
ملائے جب حنا سے ہتھیلیاں لیتی ہے جب دلبیں | تو حل ہوتی ہے اپنی مشکل دشوار چکی میں
لئے پھرتے ہیں ہم مجنون وحشت کی کرشمہ سے | ترے گوشے کو بھی اے ان گہنا چکی میں

اگرچہ اس زمیں میں جوشش مشکل تھا غزل لکھنا
بفیض عیش لکھ ڈالے یہ سب اشعار چکی میں

قومی غزل (از حضرت صادق)

بڑھتی جاتی ہے برائی قوم میں | ہے کہاں باقی بھلائی قوم میں
جل رہی ہے شعلۂ تفریق سے | آگ یہ کس نے لگائی قوم میں
بھائی جب آپس میں ہیں افراد قوم | کیوں ہے پھر یہ پارٹائی قوم میں
کچھ نہ پوچھو مغربی تہذیب کی | موت کا پیغام لائی قوم میں
ہو گئی ہے سلب خودداری قوم | آگئی ہے بےحیائی قوم میں
بڑھ رہی ہے کفر کی تقلید اب | کر رہے ہیں سب خدائی قوم میں
قوم ہی کی نذر کر دیں جان و دل | کاش ہوں ایسے فدائی قوم میں
اب حکومت ہے نہ تخت و تاج ہے | آگئی صادق گدائی قوم میں

(رباعی)

مینا کی صدا ہوں شور قلقل ہوں میں | سرشار مئے سخن سے بالکل ہوں میں
ہوں بزم سخن کا جوش ایسا شائق | گل ہے جو مشاعرہ تو بلبل ہوں میں

مایوس مریضوں کو خوشخبری

اگر آپ اشتہاری ادویہ۔ ویدوں۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کے علاج سے مایوس اور اُن کی طرف سے بدگمان ہو چکے ہیں۔ تو آپ ہمارے کارخانہ کی ادویہ کو استعمال کر کے قدرت کا تماشہ دیکھیں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ جس کسی نے ایک دفعہ بھی ہماری تیر بہدف ادویہ استعمال کی ہیں۔ وہ اُن کا مجسم اشتہار ہو گیا ہے۔

حب طاقت افزا بچپن کی غلط کاریوں اور جوانی کی بے اعتدالیوں کی خاص مصلح۔ قوت مردمی کی بحالی کی بہترین حامی قیمت فی شیشی علاوہ محصولڈاک ... عمر

طلاء۔ اوصاف بشرح صدر۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک .. عمر

شربت مقوی اعضائے رئیسہ۔ عیاشی۔ جوانی کی بے اعتدالی۔ بچپن کی غلط کاری حرکت خلاف قدرت۔ دیگر طرز کی کمزوری کو دور کرتا ہے بے مثال طاقت بخشتا اور تندرست بناتا ہے۔ قیمت فی شیشی علاوہ محصولڈاک ...... عمر

خوبصورتی۔ چہرہ کی چھائیاں۔ جھریاں۔ داغ دور کر کے کھال کو نرم و صاف بناتا اور حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ قیمت فی شیشی علاوہ محصولڈاک ... عہ ر

خضاب۔ بالوں کا قدرتی سیاہ رنگ کرتا ہے۔ وسمہ اور مہندی کی طرح نہیں لگایا جاتا۔ جلد کو خراب نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ لگانے سے ایک ماہ تک بال سیاہ رہتے ہیں۔ قیمت فی شیشی علاوہ محصولڈاک ..... عمر

منیجر دربار ٹریڈنگ کمپنی لاہور

مقاصد

(۱) اردو علم ادب کی نشوونما اور ترقی اعلیٰ درجہ کے علمی اخلاقی ـ ادبی مجلسی مضامین اور جدید و قدیم طرز کی بہترین شاعری کے ذریعہ سے (۲) اردو داں پبلک میں اعلیٰ درجہ کے مضامین عمدہ اشعار اور نظمیں اور دلفریب افسانے لکھنے اور انکا مطالعہ کرنیکا شوق پیدا کرنا (۳) اردو فارسی مصنفوں اور شعرا کے کارناموں کے متعلق تنقیدی مضامین شائع کرنا (۴) خاص مذہبی نزاعی اور پولیٹیکل مضامین کو مخزن میں جگہ نہ دیجائیگی (۵) اردو نظم ونثر میں مفید اصلاح کرنا (۶) نئے مفید خیالات اور جذبات کا اردو زبان میں داخل کرنا (۷) علوم جدیدہ کی طرف لوگوں کو توجہ دلانا (۸) دوسری زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کو نئے سانچہ میں ڈھالکر اردو میں رواج دینا ـ

قواعد وضوابط

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ کی آخری یا آیندہ ماہ کی اول تاریخ کو شائع ہوتا ہے ـ

(۲) ہندوستان کے مقامات میں جن اصحاب کو رسالہ تاریخ اشاعت سے پندرہ دن کے اندر موصول نہ ہو انکی طرف سے ۲۰ دن کے اندر عدم موصولی کی شکایت دفتر میں آجانے سے رسالہ دوبارہ مفت روانہ ہوگا اور بصیغہ وی پی پارسل جن اصحاب کو ہندوستان سے باہر مقامات میں رسالہ تاریخ اشاعت سے دو ماہ کے اندر موصول نہ ہو انکی طرف سے ڈیڑھ ماہ کے اندر شکایت دفتر میں پہنچنے پر رسالہ مفت بھیجا جائیگا ـ

(۳) نمونہ کے پرچہ کیلئے قسم اول کو ۸ اور قسم دوم کے لئے ۳ کے ٹکٹ آنے چاہئیں ـ

(۴) رسالہ وقت پر نہ پہنچنے کی بابت خریداروں کو اپنے یہاں کے ڈاکخانہ سے شکایت کرنی چاہئے کیونکہ بعض رسالوں کی غفلت سے غیر مسلی چیزیں اکثر منزل مقصود پر نہیں پہنچتیں ـ ایسا کرنے سے اکثر شکایت رفع ہوجائے گی ـ

(۵) [illegible] کیا جائے ہر خریدار کا نمبر پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے

ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔ نمبر ۵ ۔ خریداری کا نمبر نہیں لکھتے تو انکا نام رجسٹر و نمبر رجسٹری سے تلاش کرنا پڑتا ہے مخزن دیکھ لیا ہے

(۶) قابل استفسار امور کیلئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا چاہئے۔ ورنہ عدم جواب کی شکایت معاف

(۷) جو اصحاب مخزن ایک مرتبہ جاری کرا لینگے وہ اسوقت تک خریدار سمجھے جائینگے جب تک کہ انکی طرف سے عدم خریداری کی باضابطہ اطلاع دو ہفتہ قبل اختتام چندہ سابق نہ آجائیگی۔ ورنہ انکو نام سال بسال رسالہ مخزن وی۔پی روانہ کیا جائیگا جس کا وصول کرنا انکا فرض ہوگا۔

(۸) نمونہ کے پرچہ کیلئے ۲ے کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔ ورنہ وی پی پارسل بھیجا جائیگا۔ مفت روانہ نہ ہوگا قیمت مخزن قسم اول ۸ آنے فی پرچہ ۔ قیمت مخزن قسم دوم ۴ فی پرچہ ۳۔ ر

نوٹ رسالہ کی قیمت میں ۲ کا اضافہ لکھائی چھپائی کاغذ کے اخراجات گراں ہونیکے باعث کیا گیا ہے۔ مگر اضافہ کے بعد بھی رسالہ کی قیمت اور رسالوں سے کم ہے۔ مینیجر۔

ہاف ٹون عکسی تصویریں

شائقین جلد منگائیں

علمی اور ادبی دنیا کے مشاہیر کی جو تصویریں رسالہ مخزن میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں انھیں سے بعض ایسی ہیں جنھیں اکثر صاحبان علیحدہ علیحدہ اپنے پاس رکھنا یا فریم میں لگانا چاہتے ہیں۔ اس لئے انکی کچھ کچھ کاپیاں زاید چھپالی گئی ہیں۔ جو اب برائے فروخت پیشکش کیجاتی ہیں:- (۱) داتا گنج بخش لاہوری (۲) ظفر آخری بادشاہ دہلی (۳) نورتن اکبر (۴) دربار شاہجہاں (۵) نورجہاں بیگم (۶) نظام حیدرآباد دکن (۷) باباگورو نانک (۸) حافظ شیرازی ۔ قیمت فی تصویر ۱ ر

درخواستیں بنام منیجر مخزن، لاہور آنی چاہئیں

نرخ اجرت اشتہار

سالم صفحہ یک مرتبہ	[illegible]	سالم صفحہ اول یا آخر ورق سالانہ	[illegible]
سالم صفحہ اندرونی سالانہ	[illegible]	〃 〃 〃 ششماہی	[illegible]
نصف صفحہ اندرونی سالانہ	[illegible]	نصف صفحہ اول یا آخر سرورق سالانہ	[illegible]
〃 〃 ششماہی	عہ [illegible]		

مخزن

فطرت و تربیت

فطرت و تربیت سے مراد آفرینش سرشت ۔ اصل حقیقت ۔ پیدائشی عقل دانائی و فراست ہے ۔ تربیت کے معنی ہیں پرورش کرنا پالنا ۔ جیسے معنوں کے لحاظ سے دونوں میں فرق ہے ۔ ایسے ہی حقیقت اور عملیات کے اعتبار سے بھی فرق ہے ۔ فطرت کیا ہے ؟ جبلت سرشت جو ہر ایک فرد خلقت کو خود قدرت عطا کرتی ہے ۔ ہر خلقت کی فطرت جداگانہ ہے ۔ فطرت کی بلحاظ نوعوں کے جداگانہ قسمیں ہیں ۔ انسانی فطرتیں اور قسم کی ہیں اور دیگر حیوانی اور قسم کی ۔ اور پھر ہر ایک نوع کے اندر بھی فطرتوں کی قسمیں اور خواص یا جذبات جداگانہ ہیں ۔ گو انسانی فطرتوں کا رجحان عامہ اور نسبت وحدت بہت کچھ ایک ہی مرکز کی جانب جھکی ہوئی ہے ۔ اور بہت سے فطرتی جذبات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور یہ کہنا پڑتا ہے ۔ کہ فطرتی اقتضاؤں کا سلسلہ بہت کچھ ایک دوسرے کے مشابہ ہے ۔ مگر پھر بھی ہر فرد بشر کی فطرت دوسرے فرد کی فطرت سے کسی نہ کسی حد تک متغایر اور ممتاز ہے ۔ چاہے یہ امتیاز کلیات میں ہو چاہے جذبات میں ۔ اور بمقابلہ دیگر حیوانات کے انسانی فطرتوں کے امتیازات کچھ اور ہی صورت

رکھتے ہیں شیر کے بچے اور انسان کے بچے کی فطرت میں ایسا ہی فرق ہے جیسے کہ خود انسان اور شیر کی فطرت میں فرق ہے۔

جس طرح ہم یہ کہنے کے عادی ہیں کہ تربیت بری بھی ہوسکتی ہے اور اچھی بھی ناقص بھی اور کامل بھی۔ اس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فطرت بری بھی ہوتی ہے اچھی بھی۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ فطرتوں کے قدرت نے مختلف درجے رکھے ہیں۔ یا یہ کہ فطرتیں ایک درجہ بندی سے مربوط ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ خدائے تعالےٰ قادر مطلق یا قدرت نے نعوذ باللہ ہماری فطرتیں بری اور اچھی دونوں قسم کی بنائی ہیں۔ تو پھر اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ قدرت ہی نے ہمیں برا اور اچھا بنایا ہے۔ ہماری سرشت بد بھی بنائی ہے اور نیک بھی۔ اس سے خدائی افعال پر ایک دھبہ آتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ خود بخود ہی فطرتیں بری اور اچھی بن گئیں۔ تو یہ ہم تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ جب خدائے فعال یہ سب عالم پیدا کرنیوالا ہے۔ اور وہی خالق ہے تو ہم کس طرح اس امر کا اعتراف کریں۔ کہ فطرتیں خود بخود ہی بری اور اچھی بن گئی ہیں۔

ہمارا یہ اعتقاد ہونا چاہئیے۔ کہ خدائے قادر مطلق اور خالق جامع نے فطرتیں درجوں کے سلسلے سے نیک اور اچھی بنائی ہیں۔ دنیا میں اگرچہ اکثر لوگوں کو بدصورت اور کریہہ منظر کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر درجہ بدرجہ دیکھو گے تو پتہ لگ جائیگا۔ کہ درجہ بندی کے اعتبار سے ان میں بھی حسین اور خوش آیند ہوتے ہیں۔ فطرتیں سب نیک اور سعید ہیں مگر درجہ بدرجہ۔ اس درجہ بندی کے اعتبار سے ہم بعض فطرتوں کو اچھا اور بعض کو برا کہنے کے عادی ہیں۔ جب کوئی شخص ہمارے خیال یا ہماری رائے میں شقی الفطرت یا ناقص الفطرت ہے تو اس کا یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہئیے۔ کہ سچ مچ ہی اس کی فطرت ازلاً بد اور شقی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہ عارضی اسباب

کے ماتحت اس کی اصلیت اور حقیقت پر پردہ پڑچکا ہے۔ ورنہ وضع بندی کے اعتبار سے اس میں ذاتی برائی نہیں ہوتی۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ اپنے بعض افعال کی وجہ سے بدنمائی لئے ہوئے ہے۔ تو ہم خیال کرتے ہیں کہ اس کی سرشت اور فطرت ہی میں کوئی بُرائی ہے۔ یہ درست نہیں فطرت تو اس کی درجہ کے لحاظ اور پابندی سے نیک ہیں۔ لیکن بعض اسباب کی وجہ سے اس کی خوبیاں اور کمالات معرض اخفا میں آچکے ہیں اور خود زید آن سے ناواقف ہے۔ ایک شیشہ پر اگر غبار آجائے تو اس میں عکس نہیں اُتر سکتا اور شیشہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی قوت انعکاسیہ میں کیا کچھ فرق آچکا ہے۔

شیشہ کی فطرت کے خلاف انسان کی فطرت خود بھی احساس کرتی ہے یعنی انسانی فطرت صرف احساس کراتی ہی نہیں بلکہ اپنا احساس خود بھی کرتی ہے۔ زید جس کی فطرت پر غبار آچکا ہے کبھی کبھی خود بھی اس کا احساس کرتا ہے۔ اور یہ احساس خود اس کی فطرت کراتی ہے۔ وہ اسباب اور وہ موجبات جو انسانی فطرت پر کسی نہ کسی رنگ میں غالب آجاتے یا آسکتے ہیں وہی اسباب اور وہی موجبات ہیں جنھیں تربیتی اسباب اور تربیتی موجبات کہا جاتا ہے۔ جیسی ہماری تربیت ہوتی ہے ویسی ہی ہماری فطرت بھی کسی نہ کسی حد تک ہوتی جاتی ہے۔ اگر ہماری تربیت نیک اور احسن ہے تو فطرت کی خوبی اور نیکی بھی ٹھیک اپنے درجہ پر عمل پذیر ہوتی ہے۔ اور اگر ہماری تربیت یا اسباب تربیت میں کوئی نقص ہے۔ تو وہ فطرت کی خوبیاں بھی رفتہ رفتہ اسی میں رنگی جاتی ہیں۔

جب کوئی لڑکا یا لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ تو فطرت اور فطرت کی درجہ بندی کے اعتبار سے اس میں احسنت اور نیکی ملی ہوتی ہے۔ عام اس سے کہ ایسی خوبی اور نیکی کسی درجہ کی ہو۔ عالم ظہور میں آکر جس قسم کی اس کی تربیت ہوگی اس کے مطابق فطرتی خواص پر

بھی رفتہ رفتہ اثر پڑ جائے گا۔ اگرچہ فطرت بیرونی اسباب کا بہت کچھ مقابلہ کرتی ہے اور ایک دفعہ ہی نہیں بلکہ صدہا دفعہ ضمیری شمع کے ذریعہ سے غلط اسباب پر روشنی ڈالتی ہے۔ اور اکثر دفعہ ان اسقام اور فریب وہ اسباب کا مقابلہ کرتی ہے جو دائرہ تربیت میں آکر اس کے مارج ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ تربیتی اسباب اور تربیتی گرد و غبار زور سے اور متواتر حملہ آور ہوتا ہے اس واسطے آخر تھک کر رہ جاتی اور اسی رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ بے شک مضبوط اور مستقل فطرتیں ہی اس مقابلہ میں کامیاب اور فتحیاب ہوتی ہیں۔ اور تربیتی غلطیاں اور حملے سرسبز نہیں ہوتے۔ لیکن یہ وہ فطرتیں ہیں جو درجہ بندی کے اعتبار سے بہت ہی اقدس اور اعلےٰ واقعہ ہوئی ہیں۔ جن کی ذہانت و نسبت تقدس بجائے خود قدرتاً ہر ایک قسم کے اسباب اور واقعات پیش آمدہ پر فتح یاب ہو سکتا ہے۔ اگر ہم انسانوں کی مختلف فطرتوں پر تنقیدی غور کریں گے تو ہمیں پتہ لگ جائے گا کہ قدرت نے اس قسم کی نایاب فطرتیں بھی خلق کی ہیں اور ان پر انسانی نسلوں کو فخر و ناز ہے اس قسم کی مقدس فطرتیں ان راہوں میں سالک ہوتی ہیں جو راہیں تقدس اور تمیز کی ہیں اور جن پر چلنے سے اعلےٰ تمدن اور اعلیٰ روحانیت کی منازل تک انسان جا سکتا ہے۔ ایسی فطرتیں خال خال ہیں۔ اور عام فطرتیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔

وہ فطرتیں جو تربیت کی محتاج ہیں اور جن پر تربیتی اسباب بہت کچھ مؤثر ثابت ہوتے ہیں اُن پودوں کی مانند ہیں جو اپنی شکل و ہیئت و خوش آئندگی کی جہت ہی سے نہیں بلکہ اپنی قوت نامیہ اور وسعت نشو و نما اور خوبیوں و عمدگیوں کی وجہ سے بھی چمنستان دہر میں ممتاز ہیں۔ اگر ایسے پودوں کی پوری پوری نگرانی اور پرورش نہ کی جائے اور عناصر متعلقہ کے اثرات اور تصرفات سے انھیں محفوظ نہ

رکھا جائے تو وہ اپنی طاقت کے مطابق نشوونما نہیں پا سکتے۔ اسباب خارجی اور اسباب
ضار وان کی قوتوں کے واسطے ایک ایسی روک ہیں جن کا مقابلہ کرنے پر بھی ان کی
سرشت غالب نہیں آتی۔ انگور۔ سیب۔ آم اپنی قدرتی قوتوں کے زور پر
نشوونما پاکر لذیذ اثمار پیش کر سکتا ہے۔ لیکن اگر بار آور ہونے سے یا بار آور ہونے کی
حالت میں اسباب ضارہ غالب آجائیں تو ویسا ہی پودہ نکلتا ہے کامیابی
اور خوبی کے ساتھ نشوونما پا سکتے ہیں۔ دیکھو ایک سیب آم اور انگور کا درخت
مناسب موسم اور مناسب حالات آب و ہوا میں کس خوبی سے بڑھتا اور پھلتا پھولتا
ہے۔ لیکن ایک ہی دفعہ کی آندھی یا آفت ارضی و سماوی نمودار ہو کر اس کی ساری
قوتوں اور خوبیوں کا ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ ٹہنیاں کملا جاتی ہیں پھل پھول گر پڑتے
ہیں پتے جھڑنے لگتے ہیں تنہ پر ایک مصیبت آجاتی ہے وہ شادابی اور سرسبزی
جو دلوں کو اپنی طرف ایک خوش اسلوبی اور خوش آیند طریق سے کھینچتی تھی اُس کا
نام و نشان بھی نہیں رہا۔ وہی باغبان وہی مالی وہی مالک جو صبح ہی صبح ایسے
خوش نما مناظر سے لطف لیا کرتا تھا۔ مایوسی کی نگاہوں سے دیکھتا اور آہ بھر کے رہجاتا
ہے۔ بلبلیں جو صبح شام نغمہ سرا رہتی تھیں دُور ہی سے دیکھکر دلِ نالاں پر ہاتھ رکھکر
مڑ جاتی ہیں۔

یہ وہی پودے اور وہی درخت تھے جو مدتوں فصلوں اپنی خوش آیندگی
لطافت۔ نفاست کے لحاظ سے دلوں اور دماغوں کی خوشی اور فرحت کا موجب
تھے۔ ایسے کیوں ہو گئے۔ کیا ان کی قوتیں جو قدرت نے انھیں عطا کر رکھی تھیں
بوسیدہ ہو چکی تھیں اور کیا ان کی بالیدگی سلب کی گئی تھی۔ کیا قدرت نے
اپنے ایفائے عہد سے منہ موڑ لیا تھا۔ یا ایسی قوتیں عطا ہی نہیں کی گئیں۔ نہیں
نہیں قدرت کا کوئی قصور نہیں۔ قدرت مادر مہربان کی طرح جو کچھ عطا کر چکی تھی اس کو

واپس نہیں لینا چاہتی۔ اسباب خارجی کی بدولت اِن نونہالان چمن کی یہ دُرگت اور یہ حالت ہوئی ہے۔ اگر مواد خارجی حملہ آور نہ ہوتا اور اگر باغبان دوراندیشی اور احتیاط سے کام لیتا تو یاس آمیز صورتیں مشتمل ہو کر بے رونقی گلستان کا باعث نہ ہوتیں۔ بُرا ہو خزاں کا بُرا ہو اسباب ضارہ کا برا ہو غفلت کا ان بواعث سے لہلہاتے ہوئے چمنستان کو یہ دن دیکھنے پڑے۔ یہی کیفیت انسانی پودوں اور انسانی ذریات کی ہے۔ ہر ایک قسم کی قوتیں انھیں قدرت کی جانب سے عطا ہوتی ہیں۔ ہر ایک مرحلہ پر باعتبار درجہ بندی اور پیمانہ کے وہ کام دے سکتی ہیں۔ انکی قوت نامیہ اپنے اندر ایک ایسی وسعت رکھتی ہے جو نوعی اعتبارات سے ضروری تھی لیکن خارجی اسباب اور تربیت کی خرابی یا کمی سے ایسی قوتیں خوبی کے ساتھ وقت پر نشو و نما نہیں پاتیں۔ رفتہ رفتہ ان پر بیرونی اسباب غلبہ پاکر اُن کی اصلی طاقت گنوا دیتے ہیں اور وہ شگوفہ خوبی جو کھلنے والا تھا رفتہ رفتہ مرجھا کر نشو و نما سے رک جاتا ہے۔

تم مختلف انسانی نسلوں کی تربیت اور تعلیم کے مقابلہ سے اس نتیجہ پر بآسانی پہنچ سکتے ہو کہ جن انسانی نسلوں کی تربیت اور تعلیم باضابطہ اور اچھی ہے اس کی حالت اور کیفیت کوئی اور رنگ رکھتی ہے اور جو نسلیں اس سے محروم ہیں انکی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔ وہ نسلیں اور وہ ذریات جو مدتوں تک زاویہ گمنامی اور گوشہ بدبختی میں رہ کر اپنی ہستی کو رائگاں دے چکی تھیں اور جنھیں قریباً انسانی نسل ہی سے خارج کیا گیا تھا تربیت کی خوبی سے ایسی چمکی ہیں کہ ایک دن وہی مشاہیر نسل انسان قرار پائیں اور سب ذریات نے ان کی شرافت اور خوبی کا اعتراف کیا وہ پتھر وہ کنکر وہ روڑا جو پامالی کی نذر ہو چکا تھا اور جس پر نگاہ تک نہ پہنچتی تھی تربیت کی بدولت سرِ تاج قرار پایا۔

اس کے مقابلہ میں اس کا دوسرا پہلو بھی تم دیکھ سکتے ہو۔ جو نسلیں جو ذریات کبھی اپنے ابنائے جنس سے بہ مختلف وجوہ ممتاز اور سربرآوردہ تھیں جب ان کی تربیت اور تعلیم میں فرق آیا یا صحیح اصول کے تابع نہ رہیں تو انکی کایا پلٹ ہوگئی۔ تاریخیں تمہیں اس کے متعلق ایک نہیں صدہا نظیریں بتائیں گی۔ اور تم دیکھ سکو گے کہ تربیت اور تعلیم کو انسانی فطرتوں کے مقابلہ میں کہاں تک دسترس حاصل ہے۔ یا تو ایک خاندان پورے زور کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے اور یا اس کی حالت دن بدن گرتی جاتی ہے۔ یا تو ایک قوم مینار ترقی کے اقصار تک جا پہنچتی ہے اور یا تحت الثرےٰ میں گر جاتی ہے۔ آخر اس کا سبب کچھ تو ہونا چاہئے۔ قدرت کسی کے ساتھ حسد اور بغض نہیں کرتی جو کچھ اس نے بخشا اور دیا ہے وہ خود واپس نہیں لیتی ہم ہی اُسے رفتہ رفتہ واپس کرتے اور اس سے منحرف ہوتے ہیں۔ خدا اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جبتک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔

فطرتوں میں کوئی برائی نہیں درجہ بندی کے سلسلہ سے ہر فطرت خوبیوں کا خزانہ رکھتی ہے اگر اس پر کوئی غبار آجاتا اور اس میں کوئی کمزوری اور بُرائی پیدا ہوجاتی ہے تو وہ ہماری تربیت تعلیم اور خارجی اسباب کا قصور یا اثر ہے۔ تم روز دیکھتے ہو۔ جو کاشتکار محنت اور تردد کرتا ہے وہ ایک حد تک کامیاب ہوتا ہے۔ اور جو محنت اور تردد نہیں کرتا یا وقت پر توجہ نہیں کرتا وہ عموماً رہ جاتا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ بہت سے ایسے اسباب بھی ہیں جو ہمارے حدود اختیاری سے باہر ہیں۔ اور ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے یا قبل اس کے کہ ہم مقابلہ پر مستعد ہوں اُن کا اثر کام کر جاتا ہے۔ ایسے اسباب یا ایسے حملوں کی بابت انسان کی کوشش اور جد وجہد پر کوئی حرف گیری نہیں ہوسکتی اور نہ اسے ملزم

بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے حملوں کے مقابلہ میں انسان مجبور رہتا ہے۔ ایسے امور کو
ہم قدرتی یا ارضی اور سماوی مداخلت قرار دیں گے۔ مثلاً ایک شخص باوجود ذہن رسا رکھنے
کے بھی کسی ایسے ناگہانی عارضہ میں مبتلا ہو گیا جس کے اسباب اس کے اختیارات
سے باہر تھے۔ ایک نونہال چمن بچپنے ہی میں اکھاڑا یا کاٹا گیا۔ یہ وہ یورشیں ہیں جن کی
ذمہ دار اور جواب دہ خود قدرت ہے اور ہم اس کا راز نہیں پا سکتے۔ ہماری بحث
صرف ان حدود اور ان اختیارات کے متعلق ہے جو انسانی حدود اور انسانی
اختیارات کے اندر ہیں۔ اور جن سے ہماری تربیت اور تعلیم کا سلسلہ وابستہ ہے۔ ہم
وہیں تک ذمہ دار اور جواب دہ ہیں جہاں تک ہمارا اختیار ہے۔ جو باتیں ہماری ذمہ داری
اور حدود اختیاری سے بالاتر ہیں وہ قابل بحث نہیں۔ قدرت کی جانب سے
جو کچھ ہمیں دیا گیا ہے ہم صرف اس کے جواب دہ ہیں۔ ہم سے اسی سرمایہ کا حساب کتاب
لیا جائے گا جو ہماری تفویض میں کیا گیا تھا۔ بایں استثنا ہم اپنے حدود اختیاری
میں جواب دہ اور ذمہ دار ہیں اور ہمیں واقعات بتا رہے ہیں کہ ایسے امور کی
غفلت ہمیں اُن معارج سے محروم رکھتی ہے جو ہمارے واسطے اس عالم میں خاص
ہو چکے ہیں۔ اور جن پر چڑھنے کے ہم مستحق ہیں۔

یہ کہنا یا یہ قرار دے لینا کہ جو کچھ قدرت نے ہمیں بخش رکھا ہے وہ خود ہی
نشوونما پائے گا اکثر حالات میں خلاف حقیقت ہے۔ بیشک قدرت نے بہت کچھ
ہمیں اندرونی رنگ میں بخش رکھا ہے اور ہمیں وہ وہ قوتیں اور جذبات دے رکھے
ہیں جو ہمارے عروج اور ترقی کے واسطے صحیح آلات کا حکم رکھتے ہیں لیکن
جب تک انھیں صحیح اصول پر کام میں نہ لایا جائے تب تک وہ کس طرح صحیح موازنہ
سے کام دے سکتے ہیں اور کس طرح انھیں مسلسل نشوونما کا موقعہ مل سکتا ہے
اگر ایک نوزائیدہ بچہ جنگل میں درندوں کی صحبت میں چھوڑ دیا جائے۔ یا تو اُسے

درندے سے چیر پھاڑ تک سکھا جائیں گے اور زیادہ وحشیوں کی صحبت سے وحشی ہو جائیگا اگر وہی لڑکا انسانی صحبتوں میں رہتا تو وہ کسی وقت ایک زبردست اور نیک انسان ہوتا۔ اگر تربیت اور تعلیم سے انکار کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ تربیت اور تعلیم کا کوئی اثر نہیں ہوتا یا ہو سکتا۔ تو پھر ایک نوزائیدہ بچہ جنگل میں رکھکر دیکھ لو۔ اور اس کے مقابلہ میں اس کا دوسرا بھائی انسانی سرکل میں رکھ کر تجربہ کیا جائے دونوں کی آئندہ حالت ہی تمہیں بتا دے گی کہ اصلیت کیا ہے۔ اور انسانی تربیت اور انسانی تعلیم کا کہاں تک دخل ہے۔

میاں مٹھو طوطوں میں رہ کر میاں مٹھو نہیں رہتا۔ انسانی صحبت میں رہ کر بولیاں بولنے لگتا ہے اس سے ثابت ہے کہ تربیت اور تعلیم کا کہاں تک اثر اور دخل ہے۔ جب **نیک تربیت اور سعید تعلیم** جانوروں پر بھی غالب آتی ہے۔ تو انسان پر کیوں نہ آئے گی۔

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالع ترا طالع کند

جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس انسان اس بشر کی کچھ سرشت ہی ایسی ہے یا ایسی تھی تو اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس سرشت کے ساتھ خود انسانی تربیت اور انسانی تعلیم کا مواد کہاں تک تھا اور کس آب وہوا میں اس بدنام سرشت نے پرورش اور نشوونما پایا ہے۔ اس بحث میں یہ سوالات ہیں جو بحث کے قابل ہیں جب ایک گورا چٹا بچہ۔ خوبصورت لڑکا وحشیوں والے مکان میں رکھا جائے تو ضرور ہے کہ اس کا خوبصورت و سفید بشرہ کالا ہو جائے اور اسکی رنگت میں فرق آجائے اس میں قدرت کا کیا قصور ہے۔

از ماست کہ بر ماست

چنانچہ جو شخص چوروں کی صحبت میں رہے گا اس کی فطرت اس کی سرشت پر ضرور بد اثر پڑے گا وہ ضرور ایک حد تک ماؤف ہوگی۔ اگر اسے نیک روحوں میں رکھا جاتا تو ان کا اثر پذیر ہوتا اور ان کی باتیں اخذ کرتا۔ لوگ ابنائے جنس میں چند کمزوریاں پاکر فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ بڑا بدسرشت زشت فطرت ہے اس کی تربیت و تعلیم پر غور اور نظر نہیں کرتے اور نہ اس کے اسباب متعلقہ کو زیر بحث لاتے ہیں۔ گو اس طریق عمل سے فطرتوں پر تو دھبہ لگتا ہے۔ لیکن اپنی کرتوت بھول جاتی ہے اور اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ قدرت ہی نے ہم میں یہ نقص رکھے ہیں۔ اور قدرت ہی ان کمزوریوں کی ذمہ دار ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں بہت سی کمزوریوں اور نقائص کے ہم خود بھی ذمہ دار ہیں جو تربیت کے نہ ہونیکی وجہ سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اگر ہم وقت پر اپنے مقدور کے موافق تربیتی اصول پر چلتے اور نگرانی رکھتے تو اس قدر اسقام پیدا نہ ہوتے اور اس صورت میں ہمیں اپنی ذمہ داریوں سے غافل رہتے ہیں اور دوسری جانب قدرت کو بدنام کرتے ہیں۔

دیکھو گھریلو۔ پالتو اور جنگلی جانوروں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ یہ کیا ہے صحبت اور تربیت یا سامان تربیت کا اثر۔ انسان ایسی قوتیں رکھتا ہے جن سے وہ بہت کچھ امور اور کیوف اخذ کرسکتا ہے۔ اگر انسان کے کانوں میں خوش آیند آوازیں نہ پڑیں تو اس کے دل و دماغ میں سرور کی موجیں کس طرح متموج ہوسکتی ہیں اگر انسان اندھا ہو تو وہ مختلف مناظر کا لطف کس طرح اٹھا سکتا ہے۔ اسی طرح جب تک تربیتی رنگ میں انسان مختلف مراحل سے نہ گذرے ان مختلف مراحل اور منازل سے کس طرح واقف ہوسکتا ہے۔ اور اس کے دل و دماغ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

قومیں ایک مجموعی فطرت رکھتی ہیں۔ان کا نشو و نما اور افزایش اسی مجموعی فطرت کے ماتحت ہوتا ہے۔جس طرح ایک شخصی فطرت بہت کچھ تربیت اور تعلیم کی محتاج ہے اسی طرح مجموعی قومی فطرت بھی تربیت عامہ اور تعلیم عامہ کی محتاج ہے۔جن قوموں میں اصول تربیت ملحوظ نہیں رہتا انکی قومی فطرت رفتہ رفتہ بھدی اور نکمی پڑتی جاتی ہے یہانتک کہ اس میں سے نشو و نما کی طاقت ہی سلب ہونے لگتی ہے قوموں کی ترقی اور تنزل کے اسباب پر غور کرنے سے اس کا پتہ لگ سکتا ہے بیشک قومیں منتشرہ کا ایک مجموعہ ہیں۔لیکن افراد منتشرہ کا مجموعہ بھی اس صورت میں چل سکتا اور اپنی اصلی حالت میں قایم رہ سکتا ہے کہ جب وہ کسی تربیتی یا تعلیمی ضابطہ کے ماتحت ہو۔زمین تمام کاروبار کائنات کے واسطے ایک مجموعی فطرت کی قوت رکھتی ہے۔اگرچہ زمین کے اجزائے تہ در تہ میں قدرت نے سب کچھ جمع کر رکھا ہے۔مگر جب تک کاشتکار اس میں ہل نہ چلائے بیج نہ بوئے پانی نہ دے اس کی نگرانی نہ کرے وقت پر کاٹے اور صاف نہ کرے تب تک وہ کسی زمین کی نادر اور فائدہ رساں قوتوں سے کس طرح کام لے سکتا ہے۔وہی بنجر زمین جو کوڑی کا بھی فائدہ نہیں دیتی محنت اور ترود سے ہزاروں کے وارے نیارے کرا دیتی ہے۔زمین کی تہ میں صدہا قسم کی دہاتیں مستتر ہیں ہزاروں لوگ ان جگہوں پر سے گزر جاتے ہیں جہاں چاندی سونے تانبہ لوہے کے ذرات مدفون ہیں۔جب تک فن معدنیات کی رو سے چھان پھٹک نہ کی جائے تب تک ایک پیسہ کا نفع بھی نہیں ہو سکتا۔بغیر محنت کرنے کے کیسے معلوم ہو کہ اس زمین کے ٹکڑے کے نیچے یہ یہ سامان بھرا رکھا ہے۔ٹھیکریوں میں سے ہیرے اور یاقوت وہی چن سکتا ہے جو دونوں کی کیفیت جانتا ہے۔اور جسے خبر ہی نہیں وہ کیا کر سکتا ہے۔

یہ سب طریق عمل تربیت ہی نہیں ۔ کیونکہ تربیت میں ہی سلیقہ اور تربیت ہی کا جزو اعظم ہوتا ہے ۔ کسی خاص شخص اور کسی قوم کا اجارہ نہیں کہ کمالات اور ترقیات کی وارث ہو ہر شخص اور ہر قوم کوشش ۔ تربیت ۔ تعلیم سے بازی لے جاسکتی ہے بشرطیکہ خود قدرت اس میں مزاحم نہ ہو ۔ فتدبّر ۔

(خان بہادر مرزا سلطان احمد بہاول پور پنجاب)

غزل

(از جناب ملک محی الدین احمد صاحب قمرؔ)

اے دل چہ شنیدی و ز دلدار چہ دیدی — خون گشتی و از دیدۂ خونبار چکیدی

در حیرتم از دل کہ سراپا شدہ افگار — تیرے نفگندی و کمانے نکشیدی

اے قاصدِ فرخ پے و فرخندہ پیامم — رفتی و چہ گفتی چہ شنفتی چہ شنیدی

خط و رخِ او ہر دو یکے گشتہ بتقلیم — زاں رو کہ ہم اعداد سیاہیست سپیدی

اے بیخبر از لذت مستی کہ بمستی — یار ے نگزیدی لب لعلے نگزیدی

کے وستگہ سینہ بریدن بتو بخشند — اے آنکہ گہے جیب و گریبان نہ دریدی

عمریست قمرؔ اینکہ شب و روز نیالم
میگروی و تا حال بجائے نرسیدی

علمی رسالوں میں قصے کی جگہ

قصہ سے کس کو دلچسپی نہیں ہوتی؟ بچپن میں اس کے شیدا تھے۔ جوانی میں اس کے گرویدہ رہے۔ بڑھاپے میں بھی کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی داستانیں جب زندگی کی اور خوشیاں رخصت ہو چکی تھیں اپنا لطف دکھاتی رہیں۔ اور بچوں اور نوجوانوں کے دلوں کو بوڑھوں کی ایک واحد پسندیدہ صفت بن کر بار لبھاتی رہیں۔

قصہ سے وابستگی کیوں نہ ہو؟ عالم میں ہمارے وجود کے ساتھ ساتھ ایک نیا قصہ بھی موجود ہوا۔ جو دم مرگ تک جاری رہا۔ اور بعض اوقات پس مرگ بھی مدتوں تک آنیوالی پشتوں کے لئے باعث شادی یا اشکباری رہا۔

قصہ کے دلدادہ کیوں نہ ہوں؟ خود مذہب نے اس کا خوگر بنایا۔ احادیث قصص انبیاء، راماین و مہابھارت پران اور کتھائیں قصوں کی شکل میں ہیں۔ وہ ہمیں اس طرز کلام کا عاشق بناتی رہیں۔ حتیٰ کہ اب قصہ ہماری زندگی کا حصہ بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے بعض شناسوں نے قصہ کی مقناطیسی کشش کے قائل ہو کر دقیق فلسفیانہ مضامین کو بھی فسانوں، داستانوں کی صورت میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ اور اب حالت یہاں تک پہنچی ہے کہ جدید سے جدید علوم بھی جن کے لئے اُردو زبان میں علما کی طرف سے نام بھی موضوع نہیں ہوئے۔ ناولوں اور قصوں کے ذریعہ یورپ اور امریکہ میں عوام میں مشہور ہو گئے۔

ہندوستان میں اس وقت علمی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ اکثر پرچوں میں چند سال سے علمی مضامین نکلنے لگے ہیں۔ غرض اس سے یہ ہے کہ عوام میں

علمی مذاق پھیلے مگر میری رائے ناقص میں جو طریقہ عموماً اختیار کیا جا رہا ہے ہر چند کہ قابل تعریف ہے تاہم اصولاً غلط ہے۔ مشکل علمی مضامین کا انگریزی زبان سے لفظ بلفظ ترجمہ کر دینا۔ ترجمہ میں مجبوراً کئی غیر مانوس الفاظ کا استعمال کرنا۔ عبارت کا حد درجہ خشک و درسی ہونا۔ کیا یہ ایسی باتیں ہیں جو علمی مضامین کی طرف عوام میں دلچسپی بڑھائیں گی؟ عموماً وہ رسالے جو ایسے مضامین سے پُر ہوتے ہیں انھیں قلت اشاعت کی شکایت رہتی ہے۔ اور یہ شکایت باوجود عمدہ علمی مضامین اور قابل مضمون نگاروں کے باقی رہتی ہے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ عوام کو ایسے دقیق و نادر مضامین سے نہ تو دلچسپی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ نہ اس سے کوئی بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ایسے مضامین صرف طلباء اور خاص شائقین کے لئے مفید مطلب ہو سکتے ہیں مگر عام ناظرین تو ان سے برداشتہ خاطر ہی رہیں گے۔

میں نے ایک شہر کی پبلک لائبریری میں قریب بیس نہایت قابل انگریزی رسالے میز پر سجے ہوئے دیکھے۔ یہ سب مشہور مغربی علمی رسالے تھے۔ مگر صرف علمی ورسگاہوں کے لئے۔ لائبریرین سے پوچھا انھیں کوئی دیکھتا بھی ہے؟ کہا۔ کبھی کبھی کوئی کالج کا طالب علم دیکھ لیتا ہے ورنہ یہ یونہی پڑے رہتے ہیں۔ پبلک لائبریری اور پبلک ایسی ناقدردان! وجہ صرف یہ ہے کہ پبلک کے مذاق کا کچھ خیال نہ کیا گیا۔ اسی شہر میں ایک چھوٹا سا ریڈنگ روم بھی دیکھا صرف چند رسالے موجود تھے تاہم ناظرین کے ہاتھ سے مشکل سے چھٹتے تھے۔ ان رسالوں کا طرز تحریر عوام الناس کے مذاق کے حسب حال تھا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کیا جائے؟ کیا علمی مضامین رسالوں میں نکلنے بند ہو جائیں؟ جواب یہ ہے کہ عوام کی ناقدردانی آپ ہی رنگ لا کر رہے گی۔ رسالوں کے مہتمم اپنی جیب خاص سے سال بہ سال کب تک روپیہ لگاتے رہیں گے؟ مگر

بہتر بات تو یہ ہوتی کہ عوام کے مذاق کا مطالعہ کیا جاتا اور مضامین کو پبلک کے نقطۂ خیال سے دلچسپ اور مفید بنایا جاتا۔ اس حالت میں ایڈیٹر صاحب بھی مالی تفکرات سے آزاد رہتے اور ناظرین بھی نہ صرف علمی حظ اٹھاتے بلکہ علم کے عملی ثمرہ سے بھی بہرہ ور ہوتے۔

اپنی بات کو اور زیادہ واضح اور مدلل کرنے کے لئے ایک اور مثال پیش کرتا ہوں یورپ میں انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں تعلیم دینے کا وہی طریقہ تھا جو زیادہ تر ہندوستان میں اسوقت رائج ہے یعنی استاد چھڑی کا خوف دلا کر یا علم سے غیر متعلق کسی دوسری شے کا لالچ دے کر علم کو شاگرد کے ذہن نشین کرنیکی کوشش کرتا تھا جس کا نتیجہ ویسا ہی نا خاطر خواہ ہوتا تھا۔ جیسا کہ ہندوستان میں اب ہے۔ مزید ثبوت کے لئے ناظرین اپنے طفل مکتب ہونے کا زمانہ یاد فرمائیں (یاد نہ آئے تو مدد کے لئے کسی علمی رسالے کا کچھ دیر تک مطالعہ فرمائیں) طوعاً کرہاً سبق یاد کیا جاتا تھا۔ یا الہی۔ قمچی کی مار بری ہوتی ہے۔ خیر اگر کسی طرح آنکھیں کتاب کی طرف لگ بھی جائیں تو دل تو چھٹی ہونے اور شام کو طفلانہ لہو و لعب میں شریک ہونے پر لگا رہتا تھا۔ ورنہ اس کا کیا مطلب تھا کہ آخری گھنٹے ٹنے بجے بستہ جو آدھ گھنٹہ پیشتر ہی سے بندھا رکھا ہوتا بغل میں دبا کر بے ساختہ گھر کی طرف دوڑتے تھے۔ اور بس یہی تھی کہ پڑھتے تو اڑتے پھرتے یا گھر پہنچکر روز روشن کا خیر مقدم پتنگ ڈور گیند بلے۔ گلی ڈنڈے سے کرتے ان دنوں ہم بدنصیبوں کا آفتاب شام کے پانچ بجے طلوع ہوتا تھا۔ اور ایک دو گھنٹے ہی کے بعد حسرت و ارمان بھرے دل کو داغ مفارقت دیکر چلدیتا تھا۔ یہ تھا مکتب کا زمانہ جو ہم مکتب نژدل اور ڈرپوک تھے انھوں نے استاد کے خوف سے کچھ تھوڑا بہت سیکھ لیا جو آزاد طبع شجاع تھے کھیل کود کے پیچھے انکی عمر تباہ ہو

آخر یورپ میں ایسے بزرگوں نے جنھیں لڑکپن کی مکتب کی قید اور ماریاد تھی معصوموں کو ایسی فرعونی غلامی سے رہا کرنے پر کمر باندھی۔ اور وہ طریقۂ تعلیم ایجاد کیا۔ جسے "کنڈرگارٹن" کہتے ہیں۔ اسمیں اصول یہ ہے کہ بچوں کو کھیل کود کے ذریعہ تعلیم دیجائے مکتب اُن کے لئے قیدخانہ نہیں بلکہ گلزار و چمنستان بن جائے۔ چنانچہ اسکولوں میں جدید طرزِ تعلیم یعنی ابجیکٹ لیسنس (اسباق الاشیاء)۔ باتصویر کتابوں کا استعمال وغیرہ اسی قسم سے ہے۔

ابھی حال میں ملک اطالیہ کی ایک خاتون میڈم مانٹیسوری نامی نے کنڈرگارٹن کے اصولوں کو اور بھی نشو و نما دے کر ایک تیسرا طرزِ تعلیم ایجاد کیا ہے جس کا بیان مثل ایک دلچسپ فسانے کے ہے۔ یورپ اور امریکہ کے تعلیمی حلقوں میں اس نئے طریقے کا بہت کچھ چرچا ہے اور لگاتار کوششیں ہو رہی ہیں کہ مزید تحقیقات و تجربات کے بعد یہ طرزِ تعلیم عام طور سے استعمال کیا جائے۔

اُوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ تعلیم دینے کا رجحان کس طرف ہے۔ وہی طریقہ جو بچوں کی تعلیم کے لئے مفید ہے عوام کی تعلیم کے لئے بھی کارآمد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے رسائل و اخبارات زیادہ تر باتصویر و باقصہ نظر آتے ہیں علمی مضامین کو قصوں کا لباس پہنا کر زیادہ موثر زیادہ دلاویز بنایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک علمی مضمون بچوں کی حفظ صحت پر لکھا جائے۔ اور اس میں مشہور و مستند طبی کتب کا حوالہ دیکر بچوں کی صحت کے متعلق ہدایات درج کی جائیں کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔ یہ مضمون مفید تو ہوگا مگر خشک ہونے کے سبب سے شاید پڑھا ہی نہ جائے۔ یا ہدایتوں سے پُر ہونے کی وجہ سے شاید اس کی ایک بات بھی یاد نہ رہے۔ مگر اسی مضمون کو اگر ایک قصہ کے پیرایہ میں پیش کیا جائے کہ بعض ضروری قوانین صحت سے غافل رہنے کی وجہ سے کسی خاندان پر اولاد کے

ننھے بچوں پر کیسی کیسی مصیبتیں پڑیں اور آخر کار کیسے خدا خدا کر کے رہائی ملی۔ تو غالباً خوب موثر ہو۔ اور مدت تک یاد رہے۔

رسالوں کو اس طرز کے اختیار کرنے میں چند شکلیں پیش آئیں گی۔ ایسے مضمون نگار کہاں سے ملیں گے جو اچھے قصہ نویس ہوں۔ علمی مضمون لکھنا آسان ہے۔ دقیق مغربی مضامین کا ترجمہ کرنا سہل ہے۔ مگر ایک عمدہ قصہ لکھنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ مغرب کے ایک نقاد قصہ نویس کا قول ہے "قصہ نویس میں تین باتوں کا ہونا لازمی ہے:۔

(۱) وہ اپنے گانوں۔ قصبہ یا شہر ہی کا نہیں بلکہ کل دنیا کا باشندہ ہو۔ یا دوسرے لفظوں میں اس سے مراد یہ ہے کہ کنوئیں کے مینڈک کے لئے فلسفہ کی گتھیاں سلجھانی آسان ہیں مگر ایک دلچسپ قصہ لکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ قصہ لکھنے والے کو چاہیئے کہ اس کے حواس خمسہ نہایت تیز اور خارجی اثرات قبول کرنے کے لئے ہر وقت مستعد ہوں۔ تاکہ وہ بنی آدم کے خوشی و رنج کے راز دل سے بخوبی واقف ہو جائے۔ اور اپنے قصہ کو انسانی جذبات احساسات کی ایک جیتی جاگتی تصویر بنا کر پیش کر سکے۔

(۲) قصہ نگار میں یہ صفت بھی ہونی چاہیئے۔ کہ وہ خود اپنے اندرونی جذبات کے مطالعہ کا مشتاق ماہر ہو۔ خود شناسی فن قصہ گوئی میں بھی زینۂ کامیابی ہے۔ جس شخص سے خود اپنے دل کے راز پوشیدہ ہیں وہ اپنے اہل جنس کی زندگی کی پیچیدگیوں کو کیا سمجھے گا اور کیا سمجھائیگا؟

(۳) قصہ نویس میں یہ وصف بھی ہونا چاہیئے۔ کہ وہ کتب بینی کا شیدا ہو۔ اس کے لئے کتب بینی گویا اپنی معلومات سے دوسروں کی معلومات کا مقابلہ کرنا ہے۔ دوسروں سے مفید اور کار آمد اشارے حاصل کرنا۔ اپنے خیالات سے دوسروں کے خیالات کو جلا بخشنا اور اپنی مشکوک رائیوں کو دوسروں کی رائے

کی روشنی میں یا تو رد کر دینا یا تصدیق تک پہنچانا ہے؟

ان تینوں باتوں میں سے قصہ نویس اگر کسی ایک کو کم ضروری سمجھے تو وہ تیسری صفت کتب بینی ہے۔ کیونکہ اس کی تلافی پہلی دو سے ممکن ہے۔ مگر پہلی دو کی عدم موجودگی میں قصہ نویسی تو کیا ہر قسم کی مضمون نویسی سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ورنہ مضمون نیم حکیم نسخہ سے بھی زیادہ ضرر رساں ثابت ہوگا۔ خیال فرمائیے کہ مذکورہ بالا شرائط کیسی سخت ہیں۔ موجودہ رسالوں کے کتنے مضمون نگاران شرائط کے معیار سے پورے اتریں گے۔

قصہ نویسی کے لئے صرف علم نہیں بلکہ عمل کی بھی ضرورت ہے۔ صرف کتابی علم نہیں بلکہ انسانی علم بھی ہو۔ تب مضمون میں دلچسپی اور عملی خوبی پیدا ہوگی۔ ایک طرف وسیع علم دوسری طرف وسیع تجربے کی ضرورت ہے۔ یہ گھر بیٹھے ہیں کیسے حاصل ہو؟ اسی کے حاصل کرنے کے لئے اہل مغرب دنیا بھر کی سیر کرتے۔ متوحش جنگلوں۔ سنسان بیابانوں کا دورہ کرتے۔ وحشی دانشمند۔ فاضل و جاہل۔ امیر و غریب۔ سب سے ملتے جلتے۔ تعلقات بڑھاتے اور اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالتے ہیں۔ تب کہیں کوئی گوہر نایاب ہاتھ آتا ہے۔ اسے بازار ناظرین میں سب سے دلکش پیرایہ میں پیش کرتے ہیں۔ اسی کو قصہ کہتے ہیں جس کا لطف دیدار دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

پس بڑی ضرورت ہے کہ عوام الناس میں علمی ذوق بڑھانے کے لئے علمی مضامین لباس اوقات قصوں کی صورت میں پیش کئے جائیں۔ مختصر قصہ کا اس مطلب کے لئے اور زیادہ استعمال کیا جائے۔ رسالوں کے ہر نمبر میں کم از کم چار مختصر قصے ہوں پھر دیکھئے ناظرین کی قدر دانی کا حال۔

کیا وجہ ہے کہ ہفتہ وار اخبارات کی اشاعت بمقابلہ علمی رسالوں کے بہت زیادہ ہے؟ یہی کہ اخباری مضامین نسبتاً قصہ کے آئیڈیل کے قریب تر ہوتے

ہیں۔ قصہ کی اپیل دل پر ہوتی ہے۔ علمی مضمون کی دماغ پر۔ اور ہم بہ نسبت اپنے علم کے اپنے جذبات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ کیا تعجب کہ علمی رسائل کے شائقین کا شمار گھٹے اور دلچسپ اخباروں کے خریداروں کے شمار میں روز افزوں ترقی ہو۔ جب علمی رسائل عوام الناس کے مذاق کے موافق اپنی پالیسی بدلیں گے۔ تو عوام الناس کی قدردانی خواہ مخواہ بڑھ جائے گی۔ اور قابل مضمون نگار و قصہ نویس خود بخود پیدا ہونے لگیں گے۔ کیونکہ ان کی بھی مانگ بڑھ جائے گی اور قدر زیادہ ہونے لگے گی +

(س۔ س۔ الہ آباد)

سچ کا کہنا شیوہ ہے انسان کا بہترین زیور ہے یہ انسان کا
ایسے زیور میں کبھی لگنے نہ دو زنگ کذب و افترا بہتان کا

پوچھا مسلم سے کوئی تجھ میں ہنر مولوی نے جو کہ تھا شوریدہ سر
تھے بہت۔ اب بھی ہے تجھ میں کوئی اپنی ہستی کو سمجھ اور پیدا کر

خواب غفلت چھوڑ کچھ کرنا ہے مسلم خوابیدہ اب اٹھنے کو ہے
مدتیں گذریں ہوئے اس کو غلام دہر میں پھر نام یہ کرنے کو ہے

غلام محمد خاں غلام
سکاٹ لینڈ

انگریزی تعلیم یافتوں کی بدولت اسلامی اور ملکی صنعتوں کا زوال

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کاشتکاری پیشہ بہت کم تھے۔ مگر بقدر ملازمت پیشہ تھے اسی قدر دستکار بھی تھے۔ ان کی صنعتیں کثیر المنفعت اور فیض رساں تھیں ہر ایک صنعت میں دستکار کے اہل خاندان اور اس قسم ذکور و اناث کے علاوہ منفعت اُٹھانے کے دوسرے لوگ جوان بچے بوڑھے بیوائیں پردہ نشین اور باہر پھرنیوالی مجبور و بیکس غریب اپاہج اور ہمسایہ اس صنعت کی شاخوں سے محنت کر کے معاش حاصل کر سکتے تھے۔

تاجروں کو خاطر خواہ منافع ملتا تھا۔ اور طبقہ مذکورہ بالا کے لئے روزگار کی کمی نہ تھی۔ عموماً صنعتیں خوشنما صاف ستھری کم خرچ کثیر المنفعت تھیں۔ اسلامی صنعتوں پر جس قدر غور کیا جائے اسی قدر انکی تعداد زیادہ ملیگی۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ باوجود حکمراں ہونیکے دستکار بھی تھے۔

جدید فیشن والے۔ نئے تعلیم یافتہ اور نئی روشنی کے دلدادہ طبقہ ذکور و اناث کی بدولت اسلامی صنعتیں ملیامیٹ ہوگئیں۔ کار خانے اُجڑ گئے۔ دولت کی آمد بند ہوگئی۔ عموماً عالم اسلام پر افلاس کا بادل چھا گیا۔ ہمدردی و حب الوطنی مفقود ہوگئی۔ غریب غربا معذور بچے بوڑھوں بیواؤں کی معاش پر جھاڑو پھیر دی گئی۔ نوجوان محنتی اپاہج بنا دیے گئے۔ ان سب کی روزی کا دروازہ بند ہوگیا۔ یہ الزام اس وجہ سے ہے کہ زیادہ تر خوشحال فرقہ ہی تعلیم و صنعت و حرفت کا قدردان ہو سکتا

ہے۔ اور نئی روشنی کی تعلیم وہی شخص حاصل کرتا ہے جو متمول ہو۔ اور جدید فیشن کے اختیار
کنندہ و محرک بھی وہی ہوتے ہیں۔ ان کے مادۂ خاموشی و سلسلہ جنبانی میں سے
دونوں میں خاص اثر ہے۔ انکی بے توجہی پامال کرسکتی ہے اور توجہ خوشحال بناسکتی
ہے۔ لیکن یہ سخت بیرحم نکلے۔

سچ تو یہ ہے کہ اب جو کچھ بھی اسلامی صنعتیں نیم مردگی یا حالت سکرات میں
زندہ ہیں وہ قدیم الوضع پرانے تعلیمیافتوں کی بدولت یا غیر تعلیمیافتوں کی بدولت
جو جدید فیشن سے متنفر اور جدید تعلیم سے خوش قسمتی سے بے بہرہ ہیں۔ انھی کے طرز
عمل سے حب الوطنی اور قومی و ملکی فلاح کا پتہ ملتا ہے۔

ان نام نہاد تعلیمیافتوں یعنی انگلش کلرکوں کے خیالات جدید فیشن پر دوڑے۔
مگر مالی ضرورتوں کو محسوس کرکے انھوں نے نہ تو کوئی مفید کارخانہ ہی قایم کیا۔ اور نہ کوئی
مفید صنعت ہی ایجاد کی۔ اس بارہ میں بھی ہم پرانے بزرگوں کو ترجیح دیں گے۔ جن
کی بدولت پیپر مل۔ فلور مل۔ آئیس مل۔ سگر مل وغیرہ وغیرہ اور بہت سے کارخانوں
مثلاً چھاپہ خانوں۔ ہوٹلوں وغیرہ کے مسلمان و ہندو مالک ہوگئے۔ کالج اسکول یونیورسٹی
قایم کرنے کے لئے پرانے تعلیمیافتہ ہی متوجہ ہوئے۔ تجارتی کاروبار سے وعام
شراکتی روپیہ سے گھر بیٹھے بہت سے یتیم بچّے اور معذور زن و مرد منافع کثیر و قلیل
سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اور ان فیضرساں چشموں سے سیراب ہو رہے ہیں۔

نئی روشنی والوں اور نئے تعلیم یافتوں کی بدولت یورپ کے ہر قسم کی صنعتوں
کو اس وجہ سے ترقی ہوئی ہے۔ کہ ان کی قدر ہندوستان میں ہونے لگی۔
یورپ کے مال سے لدے ہوئے جہازوں سے خلیج فارس اور خلیج بنگال بھر گیا
بازار پٹ گئے ان کی قدردانی دن دونی رات چوگنی ہوگئی۔ فل ڈریس اور یورپ
ساختہ چیزوں کے قدردان نئے تعلیمیافتہ بنے۔ پرانی وضع کے پابند ہندوستانی

چیزوں کے شایق غیر تعلیمیافتہ قرار دئے گئے۔ انکی وضع قطع اور طرز بود باش پر مضحکہ کیا گیا۔ ان افعال سے اسلامی پیشوں کا زوال شروع ہوا۔

میں ہر ایک عبرت خیز صنعت کی بشکن ضخیم تشریح چند لفظوں میں کروں گا۔ غور کرنے سے ہزار ہا صنعتیں ہونگی۔ میرے خیال ناقص میں بالفعل چند ہی آئی ہیں۔ جو ہر عمر کے ذکور و اناث کی روزی کا باعث تھیں۔

موسم سرما کا لباس شرفا امرا اور اوسط درجے کے لوگوں کا لاہور۔ کشمیر۔ امرتسر۔ لدہیانہ اور پنجاب کے اکثر اضلاع و بعض مقامات ہند سے ملیار ہو کر آتا تھا۔ شال۔ دوشالہ۔ پٹو۔ الوان۔ مالیدہ۔ بانات۔ وغیرہ زیادہ تر اسلامی کارخانہ دار بناتے تھے۔ یہ چیزیں لکھوکہا روپیہ کی اندرون و بیرون ملک میں فروخت ہوتی تھیں۔ جو فیشن ایبل و فل ڈریس استعمال کرنیوالوں کے کام کی نہ رہیں۔ کوٹ۔ پتلون۔ واسکٹ اور کوٹ چسٹر فیلڈ وغیرہ کے کام کا نہ تھا۔ یورپ کی ساختہ سرجیں فلالینیں کشمیرے اور کمبل کو ترجیح نہ دیتے۔ ان کی عدم توجہی سے یہ صنائع برباد ہو گئیں۔

موسم گرما کے لباس کے لئے مسلمان دستکار ململ۔ ڈوریہ۔ کامدانی۔ چکن۔ شربتی۔ ادھی۔ جامدانی۔ مشروع۔ گلبدن۔ سنگی۔ زربفت۔ تاش۔ بادلہ۔ کمخواب۔ مشجر ہمرو۔ اور بہت سے ریشمی و سوتی کپڑے۔ سستے و بیش قیمت لکھوکھا روپیہ کے تیار کرتے تھے۔ انکی قدر رالپاکہ۔ زین کھڑائی وغیرہ کے مقابلہ میں نہ رہی۔ سادگی پسند جنٹلمینوں اور لیڈیوں نے دستکشی کی۔ کوٹ پتلون کے کام کے قابل یہ صنایع نہ تھیں۔ ان صنعتوں کو نقصان عظیم پہونچا۔ کارخانہ داروں کا دیوالہ نکل گیا۔ مسلم دستکاروں کا گلا گھونٹا گیا۔

اونی وسوتی وریشمی زردوزی۔ کامدانی۔ سوزنی۔ کبھی ہر ایک قیمت کی ٹوپیاں و صافہ لکھوکھا روپے کے لکھنؤ۔ میرٹھ۔ دہلی۔ جونپور۔ لاہور اور مختلف بلاد ہند میں مسلمان

ہی بناتے تھے۔ انکی جگہ پر یورپ کی ساختہ ترکی ٹوپیوں۔ فلٹ کیپ۔ اور شولا ہیٹ وغیرہ کو دی گئی۔ اس لئے ان اسلامی صنائع پر بھی فاتحہ پڑھا گیا۔

جوتے۔ سلیپر۔ گھیتلے اور ہر قسم کے سلیم شاہی۔ دلّی والے۔ زری کے سادے زردوزی کے سستے اور بیش قیمت زنانے مردانے بچوں کے لکھوکہا روپے کے مسلمان ہی بناتے تھے۔ اس صنعت کو یورپ کے ساختہ ڈاسن وغیرہ کے کارخانوں کے بوٹوں نے برباد کر دیا۔ یہ صنعت بھی انگریزی ولایتی بوٹ پہننے والوں کو رو رہی ہے۔

لباسوں کو مکلف بنانے کے لئے گوٹہ۔ ٹھپا۔ سلمہ۔ ستارہ۔ کناری۔ گوکھرو۔ نبت۔ رنگوره۔ بانکڑی۔ لیس۔ زردوزی کی بیلیں اور بہت سی قسم کی آرائشی چیزیں لکھوکہا روپیہ کی مسلمان مرد عورتیں بچے بچیاں گھر بیٹھے بنا کر معقول مزدوری حاصل کرتی تھیں۔ سادگی پسند جنٹلمینوں اور انکی لیڈیوں نے انکا استعمال بند کر دیا۔ بجائے ان کے یورپ کی ساختہ لیسوں۔ ریشمی بیلوں وغیرہ کو ترجیح دی گئی مسلم گروه کو فاقہ کشی کی ہدایت کی گئی جس کے باعث لکھنو وغیرہ کی بیوائیں غریب غرباب بحالت تباہ نیم فاقہ کشی کر رہی ہیں۔

رنگریزی اور چھپائی کا کام عموماً مسلمان ہی گروہ کیا کرتا تھا۔ جاجم۔ فردیں۔ لحاف۔ پردے وغیرہ وغیرہ لکھوکہا روپے کے تیار ہوتے تھے۔ اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے تھے۔ انکا رنگا ہوا کپڑا اور مذکورہ بالا چیزیں خلاف فیشن قرار دی گئیں۔ ان کے ساختہ رنگوں کی قدر نہ رہی۔ انکی جگہ پر ولایتی چھینٹیں اور ولایتی پردے وغیرہ استعمال ہونے لگے۔ بجائے لحاف اور رضائیوں کے ولایتی کمبل وغیرہ مستعمل ہونا شروع ہوئے۔ اس صنعت کو بھی ضعف شدید پہنچ گیا اور کارخانہ دار تباہ ہو گئے۔

کشیدہ فی تبا کہ چوان حقے۔ سنگ۔ بدری کام کی چیزیں معمولی قیمت سے لیکر

بیش قیمت تکیے سادے۔ زردوزی۔ طلائی۔ نقرئی لکھو کھا روپیہ کے تیار ہوتے تھے۔ یہ بھی وہ منفعت خیز تجارت مسلمانوں کی تھی۔ اس کی جگہ سگار۔ سیگرٹ اور پائپ کو دی گئی اسلامی تاجروں اور دستکاروں کو نقصان پہنچانے کیلئے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی گئی۔

خوشبویات عطر و تیل و عرقیات وغیرہ کو اسلامی کارخانے جونپور۔ قنوج۔ لکھنؤ بہرائچ۔ غازی پور۔ فرخ آباد۔ اور مختلف بلاد ہند میں مسلمانوں کے تھے۔ اسکی وجہ سے دولت ان کے ہاتھوں میں آتی تھی۔ اس کا انسداد خاطر خواہ لیونڈروں اور ولایتی روغنوں کے استعمال سے کر دیا گیا۔

بسکٹ سازی کے کارخانے مسلمانوں کے تھے۔ کچھ تو خود ان صناعوں کی بے احتیاطی سے اور کچھ نئے تعلیمیافتوں کی ناقدردانی سے زوال میں آگئے۔ ان کی جگہ پر پامر وغیرہ کے بسکٹوں کی قدر افزائی کی گئی۔ جبکہ اس خوشحال فرقہ تعلیمیافتہ نے خرید بند کر دی۔ تو اس صنعت کو بھی زوال شروع ہو گیا۔ بہتیرے کارخانہ دار تباہ ہو گئے۔

ہاتھی دانت اور ہڈی کے کام کے عموماً مسلمان ہی نہایت نفیس قلمدان عطردان۔ سنگاردان۔ قلم۔ قطزن اور بہت سی خوش وضع چیزیں بناتے تھے۔ بوجہ ہڈی ہونیکے صنعت خالص مسلمانوں کی تھی۔ اس کے ذریعہ سے بھی وہ کثیر منفعت حاصل کرتے تھے۔ ان کا استعمال خلاف فیشن قرار دیا گیا۔ تعلیمیافتہ اس کے قدردان نہ رہے۔ بازار میں مانگ نہ رہی دستکاروں کا ذریعہ معاش تنگ ہو گیا۔

منیہارے کا کام عموماً مسلمان کرتے تھے۔ نہایت بیش قیمت چوڑیوں کے جوڑے فروخت کرتے تھے۔ علاوہ اس کے لاکھی رنگین چوبی پایہ پلنگ اور پٹاریاں وغیرہ تیار کرتے تھے۔ ان کا استعمال نئی روشنی والوں کی ناپسندیدگی کے خیال سے وتیز انکی تحریک سے طبقہ نسواں سے بھی اٹھ گیا۔ بیا ولایتی ساختہ ہر قسم کی چوڑیاں

زیادہ تر افراد کے ہاں استعمال ہونے لگیں۔ یہ نفع بخش تجارت بھی برباد کی گئی۔
سادہ کاری۔ مہرکنی۔ نگ سازی کا کام عموماً مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ انکا استعمال یا تو خلاف فیشن ہوگیا یا ناقدری ہوئی۔ یہ منفعت بھی جاتی رہی۔ اب نہ برائے نام باقی ہے۔
مختلف بلاد ہند کے عموماً اور بدر۔ مراد آباد کے خصوصاً ظروف سازی کے کارخانے تام چینی۔ چینی اور شیشہ کے ظروف کے مقابلہ میں بے قدر کئے گئے۔ اور ولایتی ساختہ ظروف داخل فیشن قرار دئے گئے۔
کاغذ سازی کے کارخانے جونپور۔ سیالپورہ اور مختلف مقامات پر مسلمانوں کے تھے وہ عام ناقدر دانی اور ولایتی فیشن ایبل کاغذوں کے مقابلہ میں بے حقیقت سمجھے گئے۔ چنانچہ یہ کارخانے بند ہوگئے اور دستکار تباہ۔
فن تعمیر و بنت کاری وغیرہ میں مسلمان کاریگر بھی بخوبی ماہر تھے۔ اس کو ان تعلیم یافتوں کی سادہ پسندی نے کھو دیا۔ یہ لوگ اس کے قدردان نہ رہے۔
کتبہ طغرا۔ وصلیوں وغیرہ کے لکھنے میں مسلمان خاص طور پر ماہر تھے۔ انکی صنعت سے مکان کے در و دیوار آراستہ ہوتے تھے۔ دلچسپ اخلاق کے درست کرنے والے نقرات خوشنمائی سے پیش نظر رہتے تھے۔ دستکاروں کو معقول معاوضہ محنت کا ملتا تھا۔ انکی جگہ یورپ کی ساختہ تصویروں کو ترجیح دیگئی
ادب و لٹریچر یعنی مادری زبان کو بھی ان کی ذات سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔ انگریزی داں یا گریجوایٹ ہوجانے کے بعد مادری زبان اردو سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اور مادری زبان کی تحریرات رسالے اور اخبارات وغیرہ کو دیکھنا یا اس میں کچھ لکھنا باعث کسر شان سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اردو۔ فارسی عربی داں وغیرہ کچھ قابلیت ہی نہیں رکھتے۔ وہ غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ عام ملکی مجمع میں خواہ سب انگریزی سمجھنے والے بھی

نہ ہوں یہ انگریزی میں ہانک لگاتے ہیں۔ یہ انگریزی اخبارات اور انگریزی رسالے خریدتے اور ان کے شوقین ہوتے ہیں۔ ان کی ذات سے لٹریچر کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ ان کے خیالات چند نفر انگریزی دانوں تک محدود رہتے ہیں۔

انکی تعلیم نے ان کو ہمجنسوں کی صحبت سے بھی الگ کر دیا۔ وہ ہندوستانی سوسائٹی کو چھوڑ کر سول لائن کے بنگلوں میں رہنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ بیگانگی بڑھتی ہے۔ جہاں ہم محلہ متوسلین و متعلقین کی رسائی بغیر صرف کرایہ سواری کے دشوار ہو جاتی ہے۔ حالانکہ انھوں نے غیر سول لین میں رہکر تعلیم حاصل کی ہو۔

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی قدیم وضع کی پابندی اور طرز معاشرت سے جہاں کل ہندوؤں کی قدیم صنعتوں کو مدد مل رہی ہے وہ ان کا تحفظ کر رہے ہیں۔ وہاں اس کے ساتھ اسلامی ہندوستانی صنعت کو بھی مدد دے رہے ہیں۔ متعصب اور کوتاہ نظر چاہے اس کی قدر نہ کریں۔ لیکن آزاد خیال اس اظہار سے باز نہ رہے گا۔ مثلاً گوٹہ۔ ٹھپا وغیرہ وغیرہ کے وہ دستکار نہیں ہیں مگر بلحاظ دولتمندی ان کے تاجر ہیں۔ اسی طرح ہر چیز پر غور کرنے سے کچھ دکچھ امداد ملتی ہوئی ضرور معلوم ہوگی۔

غرضیکہ یہ ایک درد انگیز داستان ہے اسلامی ملکی صنعتوں اور ان بیرحم ناعاقبت اندیش لوگوں کی جنکو لازم تھا کہ اگر ہندوستانی صنعتیں انکے مذاق کے موافق نہ تھیں وہ نئی ایجاد و اختراع کرتے یا پرانی صنعتوں میں ترمیم کرتے مگر انھیں برباد نہ ہونے دیتے۔ ان فیشن کے دلدادوں کو غور کرنا چاہئے کہ مسلمانوں نے قسطنطنیہ کو کوٹ پتلون یا یورپ کا لباس پہنکر فتح نہیں کیا تھا۔ مصر کو قبطیوں کے لباس میں نہ ایران کو ایرانی لباس میں نہ ہندوستان کو دہوتی لنگوٹے سے۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ترک یورپین لباس اور طرز معاشرت کے تتبع سے سلطنت کھو رہے ہیں۔ اس لئے تم قومی صنعتوں کو یورپ کی چیزوں کی قدردانی کر کے فنا نہ کرو۔ لازم ہے کہ سودیشی چیزوں کی

آپ بیتی

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

کاشی جی یا بنارس کی سیر دریائے گنگا کے اس منظر سے مراد ہے جو توسی شکل میں کسی محبوب کی ابروئے خمدار کی طرح شمال سے جنوب تک چلا گیا ہے۔ اسی گھاٹ سے لیکر راج گھاٹ تک سینکڑوں مندر ہزاروں شوالے اور بیشمار رفیع الشان قیمتی محل دریا کے کنارے کھڑے ہوئے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور اُن کے نیچے ہزاروں گھاٹ اور گھاٹوں کی انگنت سیڑھیاں ہیں۔ جہاں بنارس کے خورشید نگار سرو قد حسینوں کا جمگٹ سیاح کو راجہ اندر کا اکھاڑہ یا بہشت بریں دکھا دیتا ہے۔ مگر آپ جس قدر شمال کی طرف بڑھتے جائیں گے شہر کی آبادی اور دریا کے کنارے کی رونق بڑھتی جائے گی۔ یہانتک کہ جب آپ عیدگاہ کی زیارت اور لاٹ بھیروں کے درشن سے فارغ ہوکر آگے چلیں گے تو کاشی کے اجڑے قلعہ کے ٹیلے دکھائی دینگے۔ اور دریائے گنگا کا کنارہ عمارت اور مندروں سے اس طرح خالی دکھائی دیگا جسطرح ایک یورپین لیڈی کا گورا گورا ماتھا سیندور اور ٹیکہ کی آرائش کے بغیر بُرا معلوم ہوا کرتا ہے۔ چونکہ یہ مقام الگ تھلگ اور بالکل سنسان ہے اس لئے بابا تلسی داس کو پسند آگیا ہے۔ وہ پھونس کے دو پولوں کی جھونپڑی ڈالکر یہاں بیٹھ گیا ہے۔

تلسی داس دراصل دکن کا رہنے والا فقیر تھا۔ جسے یہاں آئے ہوئے چند مہینے ہو گئے تھے۔ یہ فقیر توحید میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس لئے نہ اس کے ساتھ کوئی چیلا

تھانہ بالکا۔ رات دن مرگ چھالا بچھائے آسن مارے بیٹھا رہتا اور نرنکار جوتی سروپ کا نام جپے جاتا۔ لوگوں نے دیکھا کہ یہ فقیر نہ کبھی شہر میں آتا جاتا ہے نہ آس پاس کے کسی گاؤں میں۔ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے نہ اس کی جھونپڑی میں کھانے پینے کا سامان رہتا ہے۔ سونا چاندی اور خاک مٹی دونوں اسکی نظر میں ایک ہیں۔ تو اس کے ساتھ اعتقاد پیدا ہو چلا اور ساری کاشی اس کے قدموں میں آپڑی۔ یہ بے پروا فقیر آنیوالوں کو برا بھلا کہتا گالیاں دیتا روپیہ اشرفیاں جو بھینٹ کے لیے لوگ لیکر آتے انھیں دریا میں پھینک دیتا مگر حاجتمند نہ ٹلتے اور ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑے رہتے تیسرے چوتھے دن مرگ چھالے پر سے اٹھتا ایک تونبہ میں گنگا جل بھرتا اور ایک تھالے میں لاکر ڈالدیتا جو اس نے اپنے جھونپڑے کے پاس بنا رکھا تھا۔ اس تھالے کے اندر اس نے ایک سفید جڑ گاڑ رکھی تھی جو چوب چینی سے ملتی جلتی تھی۔ اس جڑ کے ساتھ فقیر کی توجہ دیکھکر بعض آدمی کہتے بابا جی حکم ہو تو ہم بھی ایک گڑوہ گنگا جل کا بھر کر تھالے میں ڈالدیں مگر تلسی داس ان سے کہدیتا نہیں بابا یہ جڑ چھوئی موئی اور لجونتی سے بھی زیادہ شرمیلی ہے منش کے پرچھانوہ سے جل جاتی ہے۔ تم لوگ آیا کرو۔ تو اپنا مطلب کہہ سنکر اپنے گھر سدھارا کرو۔ دھرنا دیکر بیٹھنا اور کام میں دخل دینا مجھے پسند نہیں ہے۔ ایک دن اسی طرح کئی شخصوں کو فقیر لتاڑ چکا تھا جو ایک رنگین چھوٹی سی کشتی دریا کے کنارہ پر لگی جس میں دو عورتیں سوار تھیں۔ جہاں آکر کشتی ٹھیری تھی وہ جگہ ناہموار تھی۔ اس لئے دونوں عورتیں لپک کر اتریں اور پھرتی سے زمین پر آگئیں مگر دونوں ملاحوں نے کشتی میں کھڑے کھڑے ہی بابا جی کو ڈنڈوت کرلی۔ اور اپنا سوکھا ناریل پینے کے لئے ہو بیٹھے۔

ان میں سے ایک عورت بیوی اور ایک باندی معلوم ہوتی تھی۔ بیوی کی عمر کوئی اٹھارہ برس کی ہوگی جس کا گندمی رنگ کتابی چہرہ تھا بڑی بڑی آنکھیں کمان جیسی

بھویں ناک کسی قدر موٹی مگر چاند جیسے چہرہ پر بہت ہی موزوں تھی ۔ رخسارے گوشت سے بھرے ہوئے چھوٹا سا دہانہ اور اُس میں سچے موتیوں کو جھوٹا کر دینے والے آبدار دانت ۔ دانتوں کے بیچ میں مسی اور پان کی ریخ اور ہونٹوں پر مسی کی دھڑی ۔

ع دل بیمار پر تھی رات کڑی

بنارس کی ایک زریں ساڑھی آدھی اوڑھے آدھی باندھے سر سے پاؤں تک سونے کا گہنا پہنے ہوئے تھی ۔ بوٹی بوٹی میں ناز و ادا بھرے ہوئے تھے ۔ کشتی سے اُترتے وقت اس نازنین کی پازیب اور جھانجن چوڑیاں اس زور سے بجیں کہ شور قیامت برپا ہو گیا اور باباتلسی داس کے پاس بیٹھنے والے چونک کر اُدھر دیکھنے لگے ۔ کہ آہی ہو کھے میں یہ بے بادل بے گھٹا بجلی کیونکر گری ۔ فقیر کا خوف نہ ہوتا تو اس پری وش ماہ جبین کو وہ سب ٹکٹکی باندھکر دیکھتے ۔ کیونکہ اس کا نورانی بدن زریں ساڑھی میں اس طرح چمک رہا تھا جس طرح سنہری کرنوں کے اندر آفتاب بڑا دمکا کرتا ہے ۔

نازنین کو آتا ہوا دیکھکر باباتلسی داس نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا ۔ کہ آپ صاحب یہاں سے چنپت ہوں ۔ آپ کو بیٹھا دیکھکر عورتیں جھینپنگی اور اپنا دکھ درد کھلے ڈلے پن کے ساتھ نہ کہہ سکیں گی ۔ وہ لوگ اپنا اپنا کلیجہ پکڑ کر چلے گئے ۔ نازنین نے جھک کر باباجی کو سات سلام کئے اور پھر وہ اُن کے سامنے سجدہ میں گر پڑی اسی طرح اس کے ساتھ والی عورت بھی آداب بجا لائی جو عمر میں ادھیڑ تھی ۔ نازنین سجدہ سے فارغ ہوئی تو باباتلسی داس کے سامنے دوزانو ہو بیٹھی ۔

باباجی ۔ بیٹی تیرا کیا نام ہے ؟

نازنین ۔ مہاراج مجھ دکھیا کو سانوری سندر کہتے ہیں ۔

باباتلسی داس ۔ یہ روپ سروپ یہ سونا جیسا چہرہ یہ چہل پہل ہانے کو ساتھ ہے اور پھر بھی اپنے تئیں دکھیا کہتی ہے ۔ یہ ناشکری نہیں تو کیا ہے ۔ ایشور ایسی باتوں سے

سے ناخوش نہ ہو تو کیا خوش ہو سکتا ہے۔"

سانوری سندر:۔ مہاراج جب جی نے کل ہی نہ پائی تو سونا جھونا کس کام کا۔ بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ کچھ نہ پوچھیں ہو۔"

بابا تلسی داس:۔ ایسی کیا بپتا ہے بیٹی جس نے بے چین کیا ہے وہ چین بھی دینا جانتا ہے۔ کہو کیا دکھ ہے؟"

سانوری سندر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مگر باندی نے جس کا نام لچھمی تھا باباجی سے کہا "مہاراج یہ لڑکی لاج کی پتلی ہے۔ اپنا دکھ اپنے منہ سے نہ کہہ سکیگی۔ پرنتو مجھے حکم ہو تو میں اس کی بپتا آپ کے سامنے کہہ ڈالوں۔"

بابا تلسی داس۔ بولو بولو جلدی بولو۔"

لچھمی:۔ مہاراج یہ ہماری لال تھوکار (ساہوکار) کی بہو ہے۔ جن کی حویلی وال منڈی میں بنی ہوئی ہے۔ اس کے گھر والے کا نام موہن لال ہے گونا ہوئے دو برس ہو لئے مگر رام جی کی ایسی مہر ہے کہ بچہ ابتک نہیں ہوا۔ اس کی ساس نندیں کہتی ہیں کہ بہو بانجھ ہے ہم تو موہن کا اور بیاہ کرینگے۔ جب سے اس کے کان میں یہ بھنک پڑی ہے۔ اسے کھانا پینا بھی انگ نہیں لگتا ہے۔ دن رات روتی ہے اور اپنی جان کھوتی ہے۔ کیونکہ اس کو اپنے مالک سے بڑی محبت ہے۔ جانتی ہے کہ سوکن آگئی تو پھر میری بات بھی نہ پوچھے گا۔ کسی استری سے اس نے سن پایا کہ ایک باباجی دکن سے آئے ہیں اور گنگاجی کے کنارے دھونی رمائے بیٹھے ہیں جسے وہ آسیس دیتے ہیں وہ خوب پھلتا پھولتا ہے۔ اسی آس میں یہ دوڑی ہوئی آئی ہے۔ اس پر کرپا کر دیجے۔"

لچھمی کی ان باتوں نے سانوری سندر کے کلیجہ میں آگ لگادی وہ بیقرار ہو گئی۔ اور ہچکیاں سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ اس کی دونوں آنکھیں گنگا جمنا بن گئیں اور اس نے

نہایت عاجزی کیساتھ اپنی چاند جیسی پیشانی تلسی داس کے پاؤں پر رکھدی۔ اس گھبراہٹ میں اس کے سر پر سے ساڑھی سرک گئی۔ اور اُس کے سیاہ بالوں کا گھن دار جوڑا گوری گوری گدی پاس طرح دکھائی دینے لگا جس طرح آئینہ پر کوئی مشک نافہ رکھدیتا ہے۔

تلسی داس (اپنے قدموں پر سے سر اٹھاکر) "بچہ جی کو ٹھیرا جس کرتار نے سنسار کو رچ ڈالا کیا وہ تیری کوکھ سے ایک پُتر پیدا نہیں کرسکتا ہے۔ جب تک سانس ہے آس ہے۔ اس وقت تو تو چلی جا کل سورج ڈوبے لچھمی بائی کو ساتھ لیکر میرے پاس آجانا میں آج رات کو کیلاس پتی مہاراج دھراج ششنکر شیو بم بم بولا سے جو اس کاشی کے مالک ہیں تیرے معاملہ کو عرض کرونگا۔ اور جو کچھ مہادیو جی کی سرکار سے جواب ملیگا وہ تجھ سے کہدونگا۔"

بابا جی کی ان باتوں سے سالونی سندر کے دل کو تسکین ہوئی۔ اُس کے اوسان ٹھیک ہوئے۔ رومال سے آنسو پونچھے اور سونے کی جڑاؤ آرسی میں دیکھ دیکھ کر کاجل جو پھیلا یا جو رونے میں بہہ کر پھیل گیا تھا اور ناگن سے زیادہ لہرانی والی زلفوں کو جو جوڑہ سے نکل بھاگی تھیں دبوچ کر گردن کے پیچھے بل دیکر کس دیا۔ اور تین قدم ہٹکر اور سلام کرکے جلدی اور کشتی میں اس طرح جا بیٹھی جیسے آنکھ کے اندر پتلی جلوہ گر ہوتی ہے۔

سالونی سندر نے وہ رات اور دوسرا دن پہاڑ کی طرح کاٹا۔ اور شام سے پہلے بابا تلسی داس کے پاس چلنے کے لئے تیار ہوگئی اور لچھمی اس کے ساتھ ہوئی۔ آفتاب ابھی بالکل غروب نہ ہوا تھا۔ جو یہ دونوں گنگو گھاٹ پر آگئیں۔ ملاح کشتی لئے اُنکا انتظار کررہے تھے سالونی سندر اور لچھمی فوراً اس میں بیٹھ گئیں۔ آج دریا زور پر تھا۔ اور ناؤ چڑھاؤ پر جارہی تھی۔ اسلئے رکھیتے کھیتے ملاح تھکے جاتے تھے۔ اسمیں آفتاب غروب ہوگیا اور سہانی شام آگئی شوالوں کے گھنٹوں نے کاشی سر پر اٹھالی۔ اور نا قوس شہنا اور قسم قسم کے باجوں سے شام کلیاں اور اسمین بھوپالی کے سر مندروں میں گونجنے لگے۔ کیونکہ

ہندومت میں گانا عبادت کا ایک جزو ہے اور اس کا بغیر اس کے راضی نہیں ہوتے ہیں سینکڑوں کپوں اور چراغ جل گئے تھے۔ اور پنڈت ویدکی شرتیاں اور شاستر کے اشلوک دعا کے طور پر حاضرین کو سنا رہے تھے۔ ساوتری سندر کی کشتی بابا جی کی منڈھی کے پاس پہنچ گئی ایسے ویرانہ میں رات کے وقت ایک نازنین امیر زادی کا جانا مناسب تھا۔ مگر لگی بُری ہوتی ہے۔ ساوتری سندر تھرتھراتی لچھمی کے ہاتھ میں ہاتھ دئے ہوئے بابا جی کے چرنوں تک پہنچ گئی۔

تلسی داس "ساوتری سندر تم آگئیں"

ساوتری سندر "جی مہاراج آپ کی چیری حاضر ہے"

یہ کہکر ساوتری سندر نے ایک ڈبیہ تلسی داس کے سامنے رکھدی۔

تلسی داس "یہ کیا ہے؟"

ساوتری سندر "حضور اس میں اشرفیاں اور روپے موتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں میرے پتا کے گھر کی ہیں ان کو آپ قبول کر لیجئے"

تلسی داس "یہ چیزیں چاہے تمہارے میکے کی ہوں یا سسرال کی ہوں تمہیں مبارک ہمارے کسی کام کی نہیں۔ ڈبیہ اٹھا لے نہیں ہم گنگا جی میں پھینک دینگے۔ مورکھ کہیں پرمہنس پیسہ کے لوبھی ہوتے ہیں یاد رکھنا جو لوبھی ہوتا ہے وہ فقیر نہیں ہوتا۔ اور جو فقیر ہوتا ہے وہ لوبھی نہیں ہوتا ہے"

ساوتری سندر اور لچھمی سر سے پاؤں گئیں۔ بتھیرا چاہا کہ فقیر ڈبیہ لے لے۔ مگر تلسی داس آنی سے باتی نہ ہوا۔

بابا تلسی داس "ساوتری سندر جتنی دیر تو ڈبیہ کے اٹھانے میں کرے گی۔ اتنی ہی دیر تیرے کام میں ہوگی"

جب ان دونوں نے دیکھا کہ فقیر بگڑ چلا تو ساوتری سندر نے ڈبیہ اس کے سامنے سے اٹھا کر لچھمی کو دیدی اور تلسی داس کے منہ کو غور سے دیکھنے لگی کہ کیا کہتا ہے۔

تلسی داس: "ساوتری سُندر تیرے بھلے بھاگ ہیں مہاراج کی تجھ پر دیا ہو گئی۔ تو دودوں نہائے گی اور پوتوں پھلے گی۔ تو ایک بچہ کے کارن بلک رہی ہے اور ایشور نے چاہا تو تیرے ہاں چار برس میں چار لڑکے جنم لیں گے۔ اور پروان چڑھینگے۔ مگر تجھے کچھ دن ایک کسالا اٹھانا پڑے گا۔"

ساوتری سُندر۔ (ہاتھ جوڑ کر) مہاراج میں آپ کی لونڈی ہوں۔ جو حکم آپ کریں گے وہ میں بجا لاؤنگی مگر آپ کو میری لاج رہے۔"

بابا تلسی داس: "بس کسالا یہی ہے کہ صبح ایک پھیرا ہمارے پاس بلاناغہ کیا کر اور اس جڑ میں جو تھالے کے اندر گڑی ہوئی ہے گنگا جل ایک گڑوا بھر کر ڈال جایا کر۔ جب یہ جڑ ہری ہو کر پیڑ بن جائے گی تو تیری مراد کی کلی بھی کھلجائے گی۔"

ساوتری سُندر: "پھر یہ کام کب سے شروع کروں"

بابا تلسی داس: "کل سے۔"

ساوتری سُندر: "بہت اچھا۔ مگر اب رات بہت گئی ہے اسوقت میں زیادہ نہیں ٹھیر سکتی ہوں"

بابا تلسی داس: "ٹھیک ہے جاؤ۔"

ساوتری سُندر سلام کرکے چلی گئی۔ اور دوسرے دن صبح آنا اور جڑ میں گنگا جل ڈالنا معمول کر لیا۔ خدا کی رحمت کا دروازہ کیا ہندو کیا مسلمان کیا یہود کیا نصاریٰ سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق یعنی خدا تک پہنچنے کے اتنے ہی رستہ ہیں جتنے دنیا میں جاندار ہیں اور مخبر صادق صلعم کا فرمانا اعتقادکم ینفعکم یعنی تمہارے اعتقاد تمہیں نفع دیتے ہیں ساوتری سُندر کی محنت نے رنگ دکھایا اور جڑ میں پھوٹا و شروع ہوا اور ایک کونپل نکلنے لگی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساوتری سُندر نے اپنی طبیعت کو بدلا ہوا پایا۔

حمل کی علامتیں ظاہر ہوئیں اور اس طرح ظاہر ہوئیں کہ گھر میں دھوم مچ گئی۔ مبارک سلامت ہونے لگی۔ اور اب ساونری سندر کی ساس نندیں ہاتھوں چھاؤں کرنے لگیں۔ کوئی آکر اس کی بلائیں لیتی۔ کوئی کلیجہ سے لگاتی کوئی اس کا منہ چومتی۔ زچہ گیریاں گائی جانے لگیں۔ سات مہینے میں وہ جڑ کیوڑہ کے پیڑ کی صورت کا ایک درخت بن گئی۔ مگر کیوڑہ کے پتے سخت ہوتے ہیں اس کے پتے ریشم سے زیادہ نرم تھے۔ اس کے سراپا میں ایک دلربائی معشوقوں جیسی تھی جس کے دیکھنے سے دھڑکتے ہوئے دل ٹھیر جاتے تھے خفقان دور ہو جاتا تھا۔ بگڑی ہوئی طبیعتیں سنبھل جاتی تھیں۔
اب ساونری سندر کے حمل کا ساتواں مہینہ ختم ہونے آیا تھا پیٹ گر گیا تھا۔ چلنا پھرنا کیا اٹھنا بیٹھنا بھی ناگوار تھا۔ مگر اعتقاد کے مارے تلسی داس کے پاس اس حال میں بھی دوڑی آتی تھی اور پیڑ کی جڑیں پانی دے جاتی تھی۔ اس پیڑ کے اندر کیوڑہ کے غنچہ کی طرح ایک لمبی کلی سی نکل آئی جسے دیکھکر یقین ہوتا تھا کہ کسی دن پھول بنکر اپنی بہار دکھائے گی۔
ساونری سندر۔ "باباجی دو تین روز سے ایک کالا بھونرا پیڑ کی کلی پر آکر بیٹھتا ہے اگر کہو تو اُسے مار ڈالوں"

باباتلسی داس۔ "رام رام جیو ہتیا کرے گی۔ ایسا بھاری پاپ ابھی مراد کو پہنچی نہیں اور ستانے کلپانے کے لئے تیار ہے۔ ایشر سے ڈرا ایشر سے"
تلسی داس کی ان باتوں سے ساونری سندر کا کلیجہ تھرا گیا وہ ڈر گئی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔ میں نے تو باباجی اس مارے کہا تھا کہ کہیں یہ کیڑا آپ کے چاہتے پیڑ کو کچھ نقصان نہ پہنچائے اور آپ کا دل دکھے۔
باباتلسی داس۔ "نہیں بیٹی یہ کیڑا استاد نہیں ہے کرتار نے اس ننھی سی جان کو پریم سے بنایا ہے۔ نیہ اور چاہت کوٹ کوٹ کر اس کے ہردے میں بھر دی ہے۔ یہ اس پیڑ کا چاہنے والا ہے جہاں یہ پیڑ ہوتا ہے وہاں یہ آپہنچتا ہے اور جیتے جی

اسے نہیں چھیڑتا ہے۔"

ساتوری سندر: "میں تو یہ کرتی ہوں میں بھون کو کبھی نہ چھیڑوں گی وہ شوق سے بیٹھا رہے۔ مگر باباجی آپ نے آج تک اس پیڑ کا نام نہ بتایا۔"

باباتلسی داس: "بیٹی کسی کے سامنے ذکر نہ کرنا۔ اس کو اندرکینتکی کہتے ہیں۔ یہ اکاش باڑی میں ہوتی ہے۔ جب تک اس کا جی چاہے گا اس دھرتی پر رہے گی نہیں جہاں سے آئی ہے وہیں سدھار جائے گی۔"

ساتوری سندر: "اکاش باڑی کس دیس میں ہے اور آپ وہاں سے اسے کیونکر لائے۔"

باباتلسی داس: "بھولی بیٹی ان باتوں کو چھوڑ دے یہ بھید سوائے بیچاریوں کے کسی کے سینے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ خیر تو یہ سن کہ تیرا پاؤں بھاری ہے اور تجھے اٹھواں مہینہ لگنے والا ہے۔ اب تو گھر سے نکلنا اور یہاں کا آنا جانا کچھ دن کے لئے چھوڑ دے۔ جس وقت نارائن تیری گود بھر دیں اور تو نہلا ہوئے تو بچہ کو لیکر یہاں آنا۔ اور اندرکینتکی کو پانی دینا۔ جا تجھے ایشور کو سونپا۔"

ساتوری سندر فقیر کی بہت معتقد ہو گئی تھی۔ اس کو دو ڈھائی مہینے کی بندی کا بڑا خیال ہوا اور وہ رونے لگی۔

باباتلسی داس: "ساتوری سندر رو نہیں ایشور نے چاہا تو تو ہنسی خوشی یہاں پاؤں پھیرنے آئے گی۔"

ساتوری سندر چلنے لگی تو باباجی نے اسے اپنے پاس بلایا اور تین دفعہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ اے نرنکار میری پیاری بیٹی ساتوری سندر کو تو آنند رکھنا اسے سکھ دینا۔

ساتوری سندر چلی آئی اور باباجی کے کہنے کے موافق اس نے باہر کا آنا جانا بالکل چھوڑ دیا تو نو مہینے ساتوری سندر کی اچھوتی کوکھ سے پورا پاٹھا لڑکا پیدا ہوا

جس کا نام کنہیالال رکھا گیا۔ اس گھر میں جو کچھ بچے کے پیدا ہونے کی خوشی ہوئی وہ کیا بیان کی جائے۔ ساانوری سُندر دن گنتی تھی کہ کب چلہ ختم ہو اور میں بابا تلسی داس کے پاس جاؤں۔ اور اپنے کنہیا کو اس کے چرنوں میں ڈالوں۔ بارے خدا خدا کر کے سوڑ پوری ہوئی اور ساانوری سُندر گنگا جی میں اشنان کر کے اور کنہیا کو گود میں لیکر بابا جی کے استھان پر پہونچی۔ وہ اپنے جی میں سوچتی آتی تھی۔ کہ بابا جی مرگ چھالا پر آسن مارے بیٹھے ہوں گے سمرن ہاتھ میں ہو گی۔ میں اسطرح انھیں ڈنڈوت کروں گی وہ اس طرح اسیس دینگے۔ میں کنہیا کو اُن کے پاؤں میں ڈالدوں گی۔ وہ زمین سے اٹھا کر چھاتی سے لگالیں گے۔ مگر افسوس تصور کے خلاف اس نے معاملہ پایا جب وہ فقیر کی سند ھی پر پہونچی تو دیکھا نہ وہاں بابا جی ہیں نہ ان کا مرگ چھالا نہ جھونپڑی نہ وہ پوتی نہ انسان نہ حیوان البتہ اندر کیتکی اپنا جوبن دکھلا رہی تھی۔ اور اس کے پھول کی خوشبو سے اوجڑ جنگل دولہن کے جوڑہ کی طرح بس رہا تھا بھونرا بیچ پھول میں بیٹھا ہوا تھا۔ یا یہ سمجھئے کہ اپنے پیارے دلارام کے کلیجے سے لگا ہوا سکھ کر رہا تھا۔ ساانوری سندر کو بابا جی کے ساتھ دلی اُنس تھا۔ اور وہ ان کے ساتھ خاص عقیدت رکھتی تھی ان کو نہ پاکر اس کے کلیجہ میں ایک گھونسا لگا اور اس کے دل نے کہا یا تو باواجی مر گئے یا کہیں کالے کوسوں چلے گئے۔ اب ان سے ملنے کی امید نہیں ہے اور اس خیال کے آتے ہی وہ بیچین ہو گئی۔ وہ فقیر کو یاد کر کے دیر تک روتی رہی اور اس کی آنکھیں چاروں طرف جنگل میں ڈہونڈتی رہیں مگر سہ

وہ چمن ہی سٹ گیا جسمیں بہار آنیکو تھی

ساانوری سندر دیوانہ وار کیتکی کے پاس گئی اور اُس کے چکنے پتوں پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی بہن کیتکی سچ سچ بتاؤ باواجی کہاں گئے ہیں۔ مگر کیتکی اس کا کیا جواب دے سکتی تھی اسی بیچ و افسوس میں ساانوری سندر کو یہ خیال ہوا کہ یہ اوجڑ جنگل

اور سنسان مقام ہے ایسا نہ ہو کوئی چور اُچکا یہاں آمرے اور میرا گہنا پاتا اُتار لے یہ سوچکر
وہ چلدی اور ایک گڑوا گنگا جل کا بھرلائی اور کیتکی کے تھالے میں ڈالکر چلدی اسیطرح پندرہ
بیس دن میں سانوری سندر پھیرا کرتی اور کیتکی کو پانی دیجاتی۔ کچھ دنوں کیتکی کے وصال
کے بھونرہ نے خوب مزے لوٹے۔ کیونکہ

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

اُسے نہ باجی کا خوف تھا نہ سانوری سندر کا کھٹکا تھا۔ جب جی چاہتا میٹھا پھول
کی جس پنکھڑی کا چاہتا رس پیتا۔ مگر یہ عیش و سرور کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ اور نازک کیتکی
کو یک بیک ایسا روگ لگا کہ وہ سوکھنے لگی۔ اس کی ٹہنیوں اور پتوں میں جو تازگی تھی
وہ گھٹ چلی اور اس کے ہرے ہرے پتے زرد ہونے لگے۔ گویا چاند کو گہن لگا۔
بھونرا جو اس پر جی جان سے مرتا تھا کیتکی کی اس بیماری کو دیکھکر بہت رنجیدہ ہوا۔
اور چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ بار بار کہتا ہائے میری کیتکی تجھے کیا ہو گیا۔

اب سے کچھ دن پہلے بیجان چیزوں کے بولنے پر کوتاہ عقل حکیم اور فلاسفر ٹھٹھہ
اُڑاتے تھے۔ اور یُسَبِّحُ لِلّٰہ ما فی السموات ومافی الارض کی تفسیر پر ناک
بھوں چڑھاتے تھے۔ مگر ایڈیسن کے فونوگراف اور گریموفون کے سلنڈرس اور
رکارڈس نے اس مسئلہ کی فلاسفی کو گنواروں پر بھی کھول دیا۔ جب انسان کا
بنایا ہوا مصالحہ بول اٹھے تو خدا کی بنائی ہوئی جڑی بوٹیاں بولتی ہوں تو کیا تعجب
کا مقام ہے۔ الغرض بھونرہ کی داد بیداد اور شور و فریاد نے بیمار کیتکی کا دل
ہلا دیا اور اس نے ایک ناتوان آواز میں کہا۔ اچھے میرے چاہنے والے
مجھ سے دل لگانیوالے بھونرہ جتنا تو مجھے چاہتا ہے اس سے زیادہ میں
اپنے دل میں تیری محبت رکھتی ہوں مگر خدا کے کسی کا بس نہیں چلتا ہے ملب

اب ہمارے تمہارے بچھڑنے کا وقت آگیا ہے میں کچھ دن دنیا کی ہوا اور کھا تی ہوں۔ ایک دن سوکھ کر اور چڑمڑ ہوکر رہ جاونگی۔ میرے بعد تو صبر کرنا اور جب تک میرا سوکھا پیڑ باقی رہے اس پر بیٹھا رہنا کیتکی کی ان باتوں نے بدنصیب بھونرہ کو تڑپا دیا وہ زار زار رونے لگا بھونرہ کی یہ بیقراری دیکھکر کیتکی کا بھی جی بھر آیا اور وہ ایک دفعہ اپنے سیجے چاہنے والے بھونرہ سے بولی روتے کیوں ہو تمہارے رونے سے میرا دل دکھتا ہے نادان کہتے ہیں عاشق کی مصیبت کا اثر معشوق کے دل پر نہیں پڑتا۔ مگر وہ غور کریں تو انھیں معلوم ہو کہ شمع پروانہ کے ہی ماتم میں گھل گھل کر تمام ہو جاتی ہے گل کا دامن بلبل کے فراق سے ہی سینہ چاک رہتا ہے چاند چکور کے ہی سوز محبت کا کلیجہ پر داغ رکھتا ہے مگر یہ راز ہے کہ خدا محبوبوں کو حسن کیساتھ ایک تمکنت عطا فرماتا ہے۔ جس کے پردہ میں محبوبوں کی بیتابی پنہاں رہتی ہے۔ اور عاشقوں کے سینہ میں محبت کے ساتھ ایک اضطراب پیدا کرتا ہے۔ جو ذرا سے درد میں چلا دیتا ہے۔ اور عاشق شور و نالہ سے زمین آسمان ایک کر ڈالتے ہیں۔ سُن میرے پیارے بھونرے سُن امرت جل میں یہ گُن ہے کہ اُس کی ایک بوند رائی کی چوتھائی کے برابر مرے ہوئے سر پر یا جس سوکھے ہوئے پیڑ پر پڑ جائے وہ اسی وقت ہرا ہو جاتا ہے۔ اور جی اُٹھتا ہے۔ دیکھ جب میں سوکھ کر مرنڈہ ہو جاؤں۔ تو تو امرت جل لے آنا اور ایشور کا نام لیکر میرے اوپر چھڑکنا میں اسی وقت ہری ہو جاونگی اور پھر مجھے کبھی تجھ سے مارے موت بھی نہ آئے گی“

بھونرہ ”میں سر کے بل جاؤنگا مگر کچھ اتہ پتہ تو بتاؤ امرت جل کہاں ملیگا۔ کس دیس میں پیدا ہوتا ہے اس دہرتی کا کیا نام ہے“

کیتکی ”سات سمندر پار جاکر الوپ باڑی میں امرت کنڈ ہے اس میں امرت جل بھرا ہوا ہے۔ سات سمندر پار جانا اور الوپ باڑی کا پتہ لگانا لوگوں کے

نزدیک کٹھن ہے۔ مگر ہمت کے آگے پانی ہے۔"
کچھ دن بعد کیتکی سر سے پاؤں تک سوکھ گئی۔ اور اس کے زرد پتے دھوپ سے مرجھا کر سفید ہونے لگے۔ بھونرہ اپنی محبوبہ کو مردہ دیکھکر بہت رویا پیٹا چیخا چلایا مگر کیا ہوتا تھا۔

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

کیتکی کی موت نے اُسے دیوانہ کر دیا۔ اور وہ جوش وحشت میں امرت جل لانے کے لئے چلدیا۔ ماشہ بھر کی جان اور لاکھوں کوس کا سفر مگر اس کے جی کو لگی تھی۔ اس لئے وہ نکل کھڑا ہوا۔ ہم انسان اشرف المخلوقات کہلاتے ہیں۔ اس پر گورنمنٹ عالیہ کی مہربانی سے اسباب سفر ہر وقت مہیا رہتے ہیں ریلوے۔ موٹر کار۔ اسٹیمر۔ بیلون کیسے آرام کی برق رفتار سواریاں ہیں مگر گھر سے نہیں نکلتے یورپ کے علوم و فنون نہیں سیکھتے ترقی کا دہیان نہیں

بھونرہ کے چلے جانیکے بعد ساوتری سندر کیتکی کو پانی دینے آئی۔ مگر اُسے مرجھایا ہوا دیکھکر بہت کُڑہی کیونکہ وہ بابا تلسی داس کی ایک نشانی تھی مگر بس کیا تھا۔ کف افسوس ملتی ہوئی چلی گئی۔

بھونرہ کو اُڑتے اُڑتے تین دن گذر لئے تھے نہ کھایا تھا نہ پیا تھا اس کے پروں میں سکت نہ رہا تھا۔ اس لئے وہ ایک ہرا بھرا باغ دیکھکر اترا اور گُل عل کے پھول پر بیٹھکر رس پینے لگا۔ تاکہ اس کا جی ٹھہر جائے۔ اور دم لیکر آگے بڑھے ناگہاں ایک بھنبیری اُڑتی ہوئی آئی۔ اور وہ بھی اسی گل عل کے پیڑ پر بیٹھ گئی بھنبیری کو دیکھکر بھونرا اُچھل پڑا کیونکہ بھنبیری کاشی جی کے اسی ویرانہ میں ایک پیڑ پر بسیرا لیا کرتی تھی جہاں کیتکی تھی۔

بھونرا۔ "کہو بہن بھنبیری کاشی جی سے کب چلی تھیں؟"

بھنبیری:۔ آج صبح"

بھونرا:۔ ماشاء اللہ آپ بڑی تیز دوڑنے والی ہیں۔ جو رستہ میں نے تین دن میں طے کیا ہے وہ آپنے تین گھنٹہ میں کاٹا ہے۔ ہائے اگر تمہارے پروں کی طاقت میرے بازوؤں میں آجائے تو سات سمندر آن کی آن میں آتا جاتا اور امرت جل لاتا"

بھنبیری:۔ نادان بھونرے امرت جل اگر تو سچ مچ لے آتا تو کیا ہوتا جس کے واسطے تو یہ محنت اٹھا رہا ہے۔ اس کا اب دنیا میں نشان بھی باقی نہیں"

بھونرہ:۔ ہائے بھنبیری تو یہ کیا کہتی ہے۔ کیا میری پیاری کیتکی کے سوکھے پیڑ کو کوئی اکھیڑ کر لیگیا"

بھنبیری:۔ کوئی اکھیڑ کر تو نہیں لے گیا۔ اگر کوئی اکھیڑ لیجاتا تو بھلا ہوتا"

بھونرا:۔ اے بھنبیری تجھے اپنے پیدا کرنیوالے کی قسم تو مجھے زیادہ نہ تڑپا اور میری کیتکی پر جو کچھ بپتا پڑی ہے وہ جلدی کہدے"

بھنبیری:۔ تمہارا اٹھ کے آنا اور مریض غم کا مرجانا!!
میرا یہاں غرق ہوتا ہے سنبھلے نہیں سنبھالے ہیں

تیرے ادھر آنے کے بعد چند آدمی ایک ارتھی لیکر با بالکسی داس کے استھان کے پاس آئے۔ اور ستھری صاف جگہ دیکھکر چتا بنا لاش پھونک اور لاش کی راکھ اور ہڈیاں گنگا جی میں ڈالکر چلے گئے۔ اتفاقاً چتا میں سے ایک چنگاری اڑ کر کیتکی کے تھالے میں جا پڑی کیتکی جڑ سے پھننگ تک سوکھی تو تھی ہی سلگنے لگی اور پھر بھڑک اوٹھی اور دم بھر میں جلکر خاک ہوگئی ؎

اس آتش الفت نے یہ کیا آگ لگادی
ایسا مجھے پھونکا کہ میری جان جلادی"

یہ پردرد قصہ سنکر بھونرہ کا دل پاش پاش ہوگیا۔ ہائے کیتکی ہائے کیتکی کہتا ہوا

کاشی جی کو اُلٹا بھاگا غم نے کمر توڑ ڈالی تھی ۔ جی چھوٹ گیا تھا ۔ اُٹھتا دو بھر تھا گرتا پڑتا تیسرے دن بنارس پہنچگیا ۔ دیکھا تو واقعی آگ نے کیتکی کا کام تمام کر دیا تھا ۔ اور تھالے میں اس کی میدہ جیسی راکھ پڑی ہوئی زبان حال سے یہ کہہ رہی تھی ؎

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

کیتکی کو خاک فنا میں ملا ہوا دیکھکر بھونرہ کو تاب نہ ہوئی اور وہ کم نصیب اسکی راکھ پر گر کر لوٹنے لگا ۔ اس کا بس یہ تھا جو تڑپتے تڑپتے جان دیدیتا ؎

خیال زلف دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل تو لکیر پیٹا کر

جب تڑپنے کی اس میں طاقت نہ رہتی تو اُڑتا اور دریا میں جو پاس ہی تھا غوطہ مارتا کیتکی کی راکھ اُس کے بدن سے دُھل جاتی اور یہ پھر تھالے میں آکر کیتکی کی خاک میں لوٹ جاتا ۔ اسی حال میں ساوتری سندر بھی آگئی مگر اس کے ساتھ آج اُسکی سہیلی راوکا بھی تھی جو متھرا جی کی رہنے والی کیول رام پنڈت کی بیٹی تھی جس کو وید شاستر سب حفظ یاد تھے ۔ اور چونکہ برج میں پیدا ہوئی تھی اس لئے بھاشا کی شاعری کا مذاق بھی اُسے پورا تھا طبیعت موزوں تھی ۔ راوکا کی عمر پندرہ برس سے زیادہ نہ تھی اس کا رنگ دو دشہاب تھا ۔ اس کے سیاہ بال مشک کو شرمندہ کرتے تھے ۔ اس کا بدن سانچے میں ڈھلا ہوا تھا ۔ اس کی متوالی آنکھوں کی جلد جلد حرکت سے دل پسے جاتے تھے ۔ اس کی چال کبک کی رفتار سے زیادہ پیاری تھی جب وہ کھل کھلا کر ہنستی تو معلوم ہوتا تھا چاندنی میں سے چنبیلی کی کلیاں برس رہی ہیں ۔ ساوتری سندر کو جو کیتکی کے ساتھ خاص لگاؤ تھا اس لئے اس کا جل جانا اور اس کی راکھ میں بھونرہ کا بار بار لوٹنا وہ عبرت اور غور کے ساتھ دیکھنے لگی ۔

اس کے چہرہ پر کچھ افسوس کچھ غم کی علامتیں پیدا ہو گئیں۔ اس منظر کو دیکھکر راوکا کی موزوں طبیعت میں اُمنگ آئی اور نظم کے پیرایہ میں ساوتری سندر سے سوال کیا ؎

بن نہیں بیلا نہیں چترنا نہیں پاس   منگکر کنول پھیلائے کے بھسم رماوت انگ

یعنی اے بہن ساوتری سندر میں تو جانتی ہوں بھونرا عاشق مزاج ہوتا ہے۔ یہ بن اور بیلے کے معطر پھولوں پر فریفتہ ہوتا ہے۔ خوبصورت قدر دار عورت پر بھی یہ صدقہ داری ہوا کرتا ہے مگر یہاں تو ان تینوں چیزوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے پھر یہ کس کے لئے بیتاب ہو کر تڑپ رہا ہے۔

ساوتری سندر گو پنڈت کی بیٹی نہ تھی۔ مگر اس کی طبیعت بھی موزوں تھی اس لئے راوکا کے سوال کا جواب اس نے بھی نظم میں اس طرح دیا ؎

یاں تھی برواکیتکی سو جل گئی اس کے سات
جاکی کر یا یہ کریں بھسم رما دیں انگ

یعنی اے میری پیاری سہیلی راوکا جہاں تم بھونرہ کو تڑپتا لوٹتا دیکھتی ہو یہاں ایک کیتکی کا پودا تھا۔ اس پر بھونرا مرتا تھا۔ اور ہر دم اس کی چھاتی سے لگا رہتا تھا۔ اور اس کے جوبن کی بہار لوٹتا تھا۔ اس کی بدنصیبی سے وہ کیتکی سوکھ گئی اور پھر آگ نے اُسے جلا دیا۔ اب یہ بھونرا اس کی راکھ میں پڑا لوٹ رہا ہے۔ اور شاستر کے موافق اس کی کریا کرتا ہے۔

راوکا کو اس جواب سے تسلی نہ ہوئی۔ اور اس نے پھر یہ دوہرہ نظم کر کے سندر کو سنایا ؎

جب جلی تھی برواکیتکی تو جل کیوں نہیں گئے سات
جگ ہنسائی یہ کریں بھسم رماویں انگ

یعنی اے ساوتری سندر تیرا کہنا سچ ہے یہاں کیتکی بھی ہو گی اور اس پر بھونرہ عاشق بھی سہی۔ مگر افسوس ہے کہ اس شوراشوری پر یہ بے نمکی۔ وفادار تھا تو معشوق کے ساتھ کیوں جل نہ مرا۔ اور آج کیوں فراق کے صدمے سہہ رہا ہے۔ اور لوگوں

کو اپنے اوپر سہنچا رہا ہے۔

راو کا کی عمر کم تھی اس کا دل کسی پر نہ آیا تھا۔ وہ انداز محبوبی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس لئے اُسے عاشقوں کی دلسوزی اور وفاداری کی قدر نہ تھی۔ اسی وجہ سے اس کے سوال میں ایک قسم کی بے رحمی اور سفاکی بھری ہوئی تھی۔ مگر ساوتری بنہ اپنے شوہر پر فریفتہ تھی گو خود معشوق تھی مگر عاشق مزاج تھی۔ وہ اس درد کو پہچانتی تھی۔ اس لئے وہ بیزبان بھونرہ کی طرف سے وکیل بن گئی۔ اور عشاق کے اوپر سے بیوفائی کا دھبہ مٹانے کے لئے اس نے یہ جواب دیا ؎

جب جلی تھی بردا کیتکی تب متکر تھے کہیں انت
پھیلی پیت نباہ کے لے پہونچت ہیں گنگ

یعنی اے بہن راو کا عاشقوں کی طرف سے اس قدر بدگمان ہونا نہیں چاہئے۔ بھونرا کیتکی کا سچا چاہنے والا ہے۔ کیتکی جب جلی تھی اسوقت بھونرا موجود نہ تھا اگر ہوتا تو ضرور اس کے ساتھ جل مرتا۔ مگر وہ بعد میں پہونچا ہے اور پچھلی محبت کے پاس سے اتنا بڑا کام کر رہا ہے کہ محبوب کی راکھ کو اُس کی مکتی اور نجات کے واسطے گنگا میں پہنچا رہا ہے۔ اس سے زیادہ باوفا عاشق کون ہوگا جو اپنے مرے ہوئے محبوب کی عاقبت درست کر رہا ہے +

حکیم سید ناصر نذیر فراق دہلوی

انقلاب عظیم کا پیش خیمہ

چونکا دینے والے حالات - کیا چرند و پرند میں انسانوں کی سی قوت گفتار ہے؟

ولیم کٹوپر نے کبھی نطق یعنی گفتگو پر اظہار خیالات کرتے ہوئے یہ دلچسپ اور معنی خیز الفاظ کہے تھے :- "بعض فلاسفروں کا خیال ہے کہ پرندے اور حیوانات گو انسان کی سی طاقت گفتار سے فیضیاب نہیں ہیں تو بھی ایک دوسرے کے مطلب کو اس بے معنی سی "آواز" سے جو وہ نکالتے ہیں پورے طور پر سمجھ لیتے ہیں۔ اور اُن کے خیال میں کتے بلیوں کی بھی علیحدہ علیحدہ زبان ہے۔ جس طرح کہ ہر قوم اور ہر ملک کی زبان علیحدہ علیحدہ ہے۔" یہ الفاظ بہت عرصہ تک محض الفاظ ہی رہے انکے متعلق کوئی چھان بین نہیں کی گئی۔ مگر موجودہ زمانہ کے علم الحیوانات کے ماہرین اور مشہور سائنسداں اب ان الفاظ پر سچائی کی مہر لگانے کی فکر میں ہیں۔ اور نئے حالات اور نئے واقعات اس امر کا یقین دلاتے ہیں۔ کہ وہ وقت دور نہیں جب کہ حیوان بھی انسانوں کی طرح باتیں کرنے لگیں گے۔ عالم حیوانات میں یہ ایک عظیم انقلاب ہوگا۔ جو انسان کے لئے ترقی کا نیا باب کھولدیگا۔

کیا حیوان بول سکتے ہیں؟

اس سوال پر آجکل یورپ کے اخبارات و رسالجات میں حیرت انگیز اور زبردست مضامین نکل رہے ہیں۔ جن اصحاب کا یہ خیال ہے۔ کہ انسان کی مثل حیوان بھی بول سکتے ہیں۔ اُن کے دلائل درحقیقت نہایت زبردست اور ناقابل تردید ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر حیوان نہیں بول سکتے تو یہ ہمارا قصور ہے۔ کیونکہ جس طرح ہم اپنے بال بچوں کو باتیں کرنا سکھاتے ہیں اسی طرح ہم نے حیوانوں کو باتیں کرنا نہیں سکھایا۔ ورنہ وہ ضرور باتیں کر سکتے اور کرتے۔ یہ اصحاب یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ طوطا۔ مینا۔ اور لقال پرندہ ایسے جانور ہیں جو بخوبی باتیں کر سکتے ہیں۔ اور یہ اس امر کا بدیہی ثبوت ہے۔ کہ اگر اور جانوروں کے ساتھ بھی سر دردی کیجائے۔ تو وہ بھی ہمارے ساتھ ہماری مانند باتیں کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر فریسم بڑے زور سے دعوے کرتے ہیں کہ وہ بولنے والے جانور بہت جلد پبلک میں پیش کر دیں گے۔ ڈاکٹر ریمنٹ کہتے ہیں کہ میری رائے میں یہ خیال بالکل بیہودہ اور غلط ہے۔ کہ انسان کے علاوہ دوسرے چارپائے اور جانور باتیں نہیں کر سکتے۔ پروفیسر سیمپسن کی رائے ہے کہ نہیں ہو سکتا کہ ہم جانوروں کو بولنا سکھائیں اور وہ بول نہ سکیں۔ ڈاکٹر ہلمین نے ایک زبردست پمفلٹ بنام "بولنے والے حیوان" لکھکر اس خیال کے پرخچے اڑا دئے ہیں کہ وہ باتیں نہیں کر سکتے۔ مسٹر سیکمن کا خیال ہے کہ چونکہ اُن کو ایک مدت سے بولنا نہیں سکھایا گیا۔ اس لئے اُنکی طاقت ارتقا یعنی درجہ بدرجہ ترقی کرنے کے اصول کیمطابق ضائع ہو گئی ہے۔ ارتقا کا مسئلہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنا کوئی عضو استعمال نہ کریں۔ تو آہستہ آہستہ اس کی طاقت ضائع ہو جاتی ہے۔ اور دو چار پشتوں کے بعد وہ عضو مضمحل ہو کر سکڑ سکڑا کر چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اور آخر باقی نہیں رہتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوؤں میں بعض سنیاسی اپنے ایک ہاتھ کو اوپر کو سیدھا کھڑا رکھتے ہیں۔ اور بےحس و حرکت۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ سکڑ جاتا اور مرجھا جاتا ہے۔

باتیں کرنے والا پرندہ

یہ دعوے اور خیال صرف زبانی نہیں۔ بلکہ عمل بھی بہت حد تک ثابت ہو چکے ہیں۔

اور سور ہے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ایم کے پینیم حیوانوں کے مشہور واقف کار کہتے ہیں کہ میں طوطوں کا شروع سے شوقین ہوں۔ مجھے اس میں خدا کی قدرت پنہاں نظر آتی ہے۔ جب مجھے نقال پرندے کا پتہ لگا تو میں نے اسوقت تک آرام نہ کیا۔ جب تک کہ اُسے منگوا نہ لیا۔ ایک دن مجھے میرے دل میں خیال آیا کہ کیا اور جانور بھی باتیں نہیں کر سکتے۔ شروع میں یہ ایک خیال تھا۔ مگر بعد میں مجھے اس کا تجربہ کرنے کی دھن لگ گئی۔ آخر میں نے ایک دن ایک ننھے سٹشم کو جو کبوتر جیسا جانور ہے اپنے ایک ہاتھ پر بٹھایا۔ اور دوسرے پر نقال پرندے کو بٹھا کر پوچھا جیک کہاں ہے؟ نقال نے جواب دیا "آوٹ سائڈ" یعنی باہر۔ میں نے اس سے دو تین دفعہ یہی سوال کیا اور اچھی طرح سے اس کی حرکت زبان کا ملاحظہ کیا۔ پھر ایک چھوٹے سے اوزار سے ننھے سٹشم کی زبان کو ہلا کر نوکر سے کہا۔ کہ اس کا گلا آہستہ آہستہ دباؤ۔ اس ترکیب کو عمل میں لانے سے وہ غرانے لگا۔ اور "آوٹ سائڈ" کی جگہ "اوٹ سڈ" کہنے لگا۔ مگر اب اس کا تلفظ سابق کی نسبت زیادہ ٹھیک ہے۔ اب میں دوسرے جانوروں پر تجربات کرنے میں مشغول ہوں۔ اور اُمید ہے بڑھکر کامیابی ہورہی ہے۔ اور بھی کئی ڈاکٹر اس قسم کے تجربات کر رہے ہیں جن کے حالات اخبارات میں شایع ہو رہے ہیں۔ وہ بڑے دلچسپ اور حوصلہ افزا ہیں۔ جو صاحب زیادہ واقفیت حاصل کرنا چاہیں وہ "ٹاکنگ برڈ" یعنی "بولنے والے پرندے" نامی کتاب کا مطالعہ کریں۔

بندر جو لکھ پڑھ اور باتیں کر سکتے ہیں

ڈاکٹر پینیم یہ بھی لکھتے ہیں کہ چوپایوں میں بندر بڑا سمجھدار سمجھا جاتا ہے۔ اور اس پر یہی تجربے کئے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ولیم ہارڈ فرینس نے دو بندروں کو پال رکھا ہے۔ جن میں سے ایک کا نام ممی اور دوسرے کا بورنیو ہے۔ یہ دونو بندر غضب

کے سمجھ دار ہیں۔ یہ نہ صرف ڈاکٹر صاحب موصوف کی ہر ایک بات کو بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔ نہ صرف سرخ۔ سفید۔ زرد۔ سبز اور آسمانی رنگ میں تمیز کر سکتے ہیں۔ نہ صرف گھڑ اکموٹا سکہ پہچان سکتے ہیں۔ بلکہ انگریزی کے تمام حروف بھی پہچان لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے لکڑی کے حروف کٹوا کر رکھے ہوئے ہیں۔ اور جب وہ کہتے ہیں "ممی جاؤ۔ ایکس لے آؤ" تو ممی جا کر ایکس ہی ڈھونڈ کر لاتا ہے۔ پورٹیو سگرٹ بڑے مزے سے پیتا ہے۔ اور ممی پھٹے پرانے کپڑوں کے ٹکڑوں کی نکٹائی پہن کر اپنا مُنہ آئینہ کے اندر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ دونو بندر تین الفاظ بڑی صفائی سے بول سکتے ہیں۔ ماما۔ پاپا اور آیک۔ ماما کے معنی ماں پاپا کے باپ اور آیک کے بہت خوب کے ہیں حیرت کا مقام ہے کہ جب یہ بندر کبھی کوئی مشکل کام کر لیتے ہیں۔ تو بے اختیار آیک کہہ اُٹھتے ہیں ڈاکٹر صاحب موصوف کے ایک اور دوست بھی ہیں جن کا نام ابھی ظاہر نہیں کیا گیا۔ اور وہ اپنے بندروں کو لکھنا سکھا رہے ہیں۔ اے سے لیکر زیڈ تک یعنی "ا سے لیکر ے" تک وہ لکھ سکتے ہیں۔ اب ان کو الفاظ سکھائے جا رہے ہیں۔

ایک عجیب غریب کُتا

پروفیسر الگزینڈر گریہم بیل لکھتے ہیں کہ "جب میں تو عمر تھا۔ تو مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میرے والد اُن مریضوں کا علاج کیا کرتے تھے جو مرض لکنت میں مبتلا ہوتے تھے۔ میں اس زمانہ میں ایسے مریضوں کے جبڑوں کی وضع اور بناوٹ کو بڑے غور سے مطالعہ کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے سوچا کہ آیا کتا بھی ہماری طرح باتیں کر سکتا ہے یا نہیں۔ میرے پاس ایک غیر معمولی سمجھ دار کُتا تھا۔ میں نے اس کی تھوتنی پکڑ لی۔ اور جسوقت وہ زور سے غرا رہا تھا۔ اُسے متواتر کھولنا اور

بند کرنا شروع کیا۔ اس سے پہلے وہ صرف غراتا تھا۔ مگر اب "مار مار" کی آواز اس کے منہ سے نکلنے لگی۔ تھوڑی سی مشق کے بعد میں اس قابل ہوگیا کہ اس کے منہ سے " ما۔ ما" اس طریقے سے نکلواؤں کہ دباؤ جبڑے کے آخری حصہ پر رہے۔ اس کے بعد اپنی انگلی میں نے اس کے جبڑے کے نچلے حصے میں رکھی اور چند مرتبہ تھوتنی دبائی۔ اب ما کی جگہ "گا" نکلنے لگا۔ اسی اثنا میں مینے ایک دفعہ نیچے اور دوسری دفعہ اوپر انگلی رکھکر لفظ " گا۔ ما" نکلوالیا۔ متواتر کوشش کرنے سے وہ لفظ " گرینڈ ماما" کو ذرا بھدے سے طریقے سے ادا کرنے لگ گیا۔ غرض اس طرح مینے اس کی زبان سے کئی الفاظ نکلوائے۔ مثلاً آہ۔ ای۔ اُو وغیرہ مگر اس تعلیمی مشق کا نتیجہ اسوقت ظہور میں آیا جب کتا مکمل فقرہ کہنے لگ گیا۔ او۔ آہ۔ اُو گا ما۔ یعنی "ہاؤ آر یو گرینڈ ماما" اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ " دادی صاحبہ آپ کا مزاج کیسا ہے؟"

اس کے بعد ڈاکٹر الگزینڈر گرہیم بیل نے سوچا کہ اگر کتا اس فقرے کو بول سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ بندر جس کا منہ ہو بہو انسان سے مشابہ ہے باتیں نہ کرسکے۔ چنانچہ اب وہ بندروں کے تجربے کر رہے ہیں۔

ایک اور عجیب وغریب کتا

اس کتے سے زیادہ عجیب کتا جرمنی کے ڈاکٹر لورسل کے پاس ہے۔ اس کا نام ڈان ہے۔ اور وہ ایسی صفائی سے باتیں کرسکتا ہے۔ کہ انسان حیران رہجاتا ہے۔ پہلے پہل لورسل صاحب کو اس کتے کے بولنے کی طاقت کا پتہ نہ تھا۔ ایک دن وہ دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ کہ ڈان پچھلی دو ٹانگوں کے سہارے میز کے پاس آکھڑا ہوا۔ لورسل نے پوچھا " کچھ کھایا چاہتے ہو؟

اسوقت کتا پہلی ہی دفعہ بولا کہ "ہاں" یہ دیکھکر بورسل دنگ رہگئے اور اس دن سے ڈان کی قدر اور عزت بڑھ گئی ہے۔ ایک دفعہ ڈان بازار سے گذر رہا تھا۔ اور ایک عورت روٹیاں اٹھائے لئے جا رہی تھی۔ ڈان اسوقت بھوکا تھا۔ مگر چپ چاپ عورت کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ جب غیر آباد حصے سے گذرنے لگے۔ تو ڈان نے لجاجت سے کہا "ڈان ہنگر کہن باب لنچ" یعنی ڈان بھوکا ہے اُسے روٹی دو۔ عورت نے اُس کو بھوت سمجھکر روٹیاں پھینک دیں۔ اور ہوا ہوگئی۔ مسٹر ڈان نے مزے سے روٹیاں کھائیں اور سیر ہوکر گھر کو چلے گئے۔ جب یہ واقعہ بورسل صاحب نے سنا تو ہنستے ہنستے اُن کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

ڈان دن بدن ترقی کرتا گیا۔ آخر بورسل صاحب نے ایک لوکل اخبار میں ڈان کا مفصل حال چھپوایا۔ اس آرٹیکل کا نکلنا تھا کہ بورسل صاحب کے نام خط پر خط آنا شروع ہوگئے۔ کہ کتا بیچ دو۔ اور ساتھ ہی اس کے گھر پر لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ اس قدر زیادہ آمد و رفت شروع ہوئی کہ بورسل صاحب کو روٹی کھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ آخر بورسل صاحب نے متواتر پبلک جلسے منعقد کرکے لوگوں کو ڈان کے درشن کرائے۔ اور اس سے بات چیت کراکر لوگوں کو محو حیرت بنایا۔ اس کتے کی تصویریں کئی اخباروں میں نکل چکی ہے۔ اور آجکل تمام یورپ میں اس کا چرچا ہے۔

علمی دنیا میں زبردست ہلچل

حیوانات کی گفتار اور قوت گفتار کے متعلق سوال نے علمی دنیا میں ایک زبردست ہلچل بلکہ طوفان پیدا کردیا ہے۔ انسانی عقل لامحدود ہے۔ سمندر کی چھاتیاں اس نے چیریں۔ پہاڑوں کو اس نے کاٹا۔ آسمان سے بجلی کو اس نے نیچے اتارا۔ ہوا پر سواری

اِس نے کی۔ بیجان چیزوں سے اس نے حرکت کرائی ۔ مگر حیوانات کی قوت گفتار کی دریافت ایسی دریافت ہوگی جو تمام دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کردے گی۔ ایک فلاسفر نے کہا تھا کہ اگر تمام دنیا کی زبانیں بند ہو جاویں تو ترقی یکلخت رک جائے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اگر جانور اور چوپائے بھی باتیں کرنے لگ جائیں تو پھر ترقی دگنی ہو جائے

ایک پادری صاحب کا وہم

مذکورہ بالا واقعات اور حالات کو دیکھکر لوگوں نے اس سوال پر بحث شروع کر دی ہے۔ کہ اگر چرند و پرند باتیں کرنے لگ گئے۔ تو نتیجہ کیا ہوگا ؟ ہر ایک مضمون نگار اپنے نقطۂ خیال سے سوال کو حل کرتا ہے۔ مگر بعض اصحاب ایسا نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ پڑھنے والا بیساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک پادری صاحب نے لکھا ہے۔ کہ ہم نے عورتوں کو اٹھایا وہ ہمارے سر ہو گئیں۔ غلاموں کو آزادی دی وہ ہمارا مقابلہ کرنے لگ گئے اگر خدانخواستہ چرند و پرند بھی باتیں کرنے لگ گئے۔ تو ایک وقت آئیگا جب کہ وہ بھی حقوق حقوق کا شور مچا کر انسانی عقل کو تنگ کر دیں گے۔ اُسوقت اُنکی بنیان پر ٹھہر لگانا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہوگا۔ اس لئے جو اصحاب ایسی کوشش کر رہے ہیں۔ انکو اس ضر فعل سے باز آنا چاہیئے۔

ہم نہیں جانتے کہ اس پادری کو کیا جواب دیا گیا۔ مگر ہمارا یقین ہے کہ اگر اہل یورپ اس طرف متوجہ رہے تو ایک دن حیوان بھی انسان کی طرح بات چیت کرنے لگیں گے۔ اور انسان حیوان کے درمیان سے باہم گفتگو نہ کر سکنے کی سخت دیوار اُٹھ جائے گی۔ مگر وہ دن کب آئیگا ؟ اس سوال کا جواب "وقت" دے گا۔ کیونکہ یہ مسلّمہ ہے کہ "کل امر مرہون باوقاتہا"

بدری ناتھ شرما سدرشن

الموركھا

نمبر ۴

بقیہ باب ۴

ماہ منیر بکتی جھکتی رہی اور ایک ایک منہ میں ہزار ہزار کوسنے مورکھا کو سناتی رہی مگر مورکھا نے سنی ان سنی کر دی۔ اور خرجین میں سے دستر خوان نکال ماہ منیر کے سامنے بچھا دیا۔ اور دو کلچے اور چار شامی کباب ایک طشتری میں اس کے سامنے لگا دیئے۔ شکار بند میں سے چمڑے کی چھاگل کھول لایا۔ اور چاندی کے خوبصورت گلاس میں پانی بھر کر رکھدیا۔ اور آپ رومال لے مکھی جھلنے کھڑا ہو گیا۔ ماہ منیر نے چلنے کی ہول جول میں گھر بھی کچھ نہ کھایا تھا۔ اور اب بھی آدھا دن صاف گذر لیا تھا۔ اس لئے بھوک اُسے لگ رہی تھی۔ مگر غم و غصہ کھانے نہ دیتا تھا پھر بھی اس نے اُبکائیاں لے لیکر اور چگل چگل کر ایک کلچہ اور ایک شامی کباب حلق سے نیچے اتارا اور پر سے ڈگڈگا کر پانی پی لیا۔ اور دستر خوان مورکھا کی طرف سرکا کر کہا لو یہ تم زہر مار کرو۔

مورکھا دستر خوان لے اس درخت کے نیچے چلا گیا جہاں اس نے دونوں گھوڑے باندھ رکھے تھے۔ وہاں بیٹھ کر کھانا کھایا پانی پیا پھر گھوڑوں کو راتب کھلانے لگا جو کر کانج سے ساتھ لایا تھا۔ اور خرجی میں بندھا ہوا تھا جب گھوڑے راتب کھا چکے تو اس نے دونو کے پاؤں باندھکر اس سرسبز میدان میں چھوڑ دیا جہاں ہری دوب گز گز بھر لمبی اُگی ہوئی تھی گھوڑے گھاس کھا اور پانی پی گھنٹہ بھر میں تازہ دم ہو گئے۔ اور مورکھا نے سمجھ لیا کہ اب یہ پھر اس قابل ہیں کہ پچاس میل بے تکان چلے جائیں گے۔ اس عرصہ میں ایک مسافر اس رستہ سے گذرا اور مورکھا نے اس سے دوچار

ضروری باتیں کیں۔

مورکھا:۔ اے میاں مسافر۔ میاں مسافر تم کہاں سے آتے ہو اور کہاں جاؤ گے؟

مسافر:۔ میں جہاں آباد سے آتا ہوں اور وہ مُلّا کو جاتا ہوں۔

مورکھا:۔ جہاں آباد کسی شہر کا نام ہے؟

مسافر:۔ جی نہیں ایک گاؤں کا نام ہے جو یہاں سے ۱۱ میل ہے۔

مورکھا:۔ اور وہ مُلّا؟

مسافر:۔ وہ مُلّا بھی ایک گاؤں ہے جو یہاں سے کوئی ۶ میل ہوگا۔

مورکھا:۔ بھلا بھئی کرکانچ یہاں سے کتنی دور ہوگا؟

مسافر:۔ اچھی کہی بھلا کرکانچ یہاں کہاں دھرا ہے۔ وہ تو ملک خوارزم میں ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اسی میل ہوگا۔

مسافر تو یہ کہکر چلتا ہوا۔ اور مورکھا اپنے دل میں کہنے لگا۔ خدا کا شکر ہے ہم اسّی میل کرکانچ سے نکل آئے ہیں۔ اوہ اب تو ہم فرشتہ کے ہاتھ بھی نہیں آسکتے۔ اگر ہمارے گھوڑے فی گھنٹہ سات میل چلے۔ تو گیارہ گھنٹے ۷۷ میل آئے ہونگے۔ مسافر کا اسّی میل کہنا بیجا نہیں ہے۔

ادھر لی ماہ منیر اپنے دل سے کہہ رہی تھیں۔ الہٰی یہ کیا ہوا بیٹھے بٹھائے شامت آگئی۔ مورکھا نے میرے ساتھ بڑا چھل کھیلا اس موئے نے اپنے ہی لئے یہ چلتر کیا مگر نہیں اس کا کچھ قصور نہیں ہے کردنی خویش آمدنی پیش۔ جیسا میں نے کیا تھا ویسا میرے سامنے آیا۔ ماں باپ کی مرضی کے خلاف کرنا چاہا۔ غیر مرد وے کو بھائی بنایا یہ اسکی سزا مل رہی ہے۔ اللہ میری توبہ ہے۔ الہٰی میں توبہ کرتی ہوں۔ تو میری خطا کو معاف کر اللہ تو عالم الغیب ہے۔ میں بالکل پاک صاف ہوں میری صرف اتنی ہی تقصیر ہے کہ میں بیبا کی کے ساتھ ایک نامحرم کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی

ہلکر چلی آئی۔ اچھا اب مجھے کرنا کیا چاہیئے مگھر تو عمر بھر کو چھوٹا گھر کا تو اب مجھے نام بھی نہیں لینا چاہیئے۔ مگر اب یہاں ٹھہرنا بھی مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ جنگل کا موقع دوسرے کرکا بج بھی کچھ دور نہیں ہے اگر ڈھونڈنے والے ادھر آ نکلے تو پھر ان کے پنجہ سے بچنا دشوار۔ تن بہ تقدیر مورکھا کے ساتھ چلدینا چاہیئے۔ آگے جو کچھ خدا دکھائے سو تا چار دیکھنا اس میں مورکھا نے ماہ منیر کے پاس آکر کہا۔ بیگم صاحب قسمت کا لکھا امنٹ ہے جو ہونا تھا ہو لیا۔ ہاتھی کے دانت نکلکر اندر نہیں جاتے ہیں۔ اب کرکا بج کو تو آپ بھول جائیے۔ اور جان کی خیر چاہتی ہیں تو گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لے چلئے نہیں اس بیابان جنگل میں رات ہو گئی تو قزاق آکر لوٹ لیں گے۔ جان کے ساتھ آبرو بھی جائے گی۔ اور اگر قزاق نہ آئے تو شیر بھیڑیئے جیتا نہ چھوڑیں گے۔

ماہ منیر نے بھٹ سے منہ۔ لعنت خدا کی ابھی پٹ چکا ہے اور ابھی میں آنکھ ڈالکر بات کرتا ہے۔ صبر جو الا تیری جان کو۔ چلوں گی تو یہاں رہ کر کیا مجھے تیری قبر تھوڑی ہی کھودنی ہے۔ جا نامراد گھوڑا لے آ۔

مورکھا خوشی خوشی گھوڑا کس ماہ منیر کے سامنے لے آیا۔ ماہ منیر نے گھوڑے پر چڑھتے وقت پھر میاں مورکھا کے سر پر دو تین دھولیں لگائیں اور کہا اے موئے مورکھا میرے باپ کے غلام ہاتے تو ہو اور میں ہوں۔ جب ماہ منیر سوار ہو لی تو مورکھا اپنے گھوڑے پر چڑھ لیا اور دونوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو مغرب کی طرف تراٹ کر دیا۔ اب اندازاً دن کے دو بجے ہیں۔ آفتاب اپنے معمول کے موافق کسی قدر نیچا ہو کر پچھم کی جانب مائل ہو چلا ہے یا ماہ منیر کے جمال پر پروانہ بنکر اس کے دیکھنے کے ارمان میں سامنے آتا جاتا ہے۔ گھوڑے کبھی گیلپ کبھی تراٹ ہو جاتے ہیں اور زمین کو پیٹے ڈالتے ہیں۔ چلتے چلتے رات ہو گئی مگر مورکھا اور ماہ منیر نے اپنے گھوڑوں کی باگ نہ روکی تھکان حد سے بے حد ہو گئی۔ سر پھرنے لگا نیند کے مارے آنکھیں بند

ہوگئیں مگر انھوں نے کسی کو بھی نہ گردانا۔ اور ساری رات چلتے چلتے تیر کر دی۔

پانچواں باب

نام کا سیر نہ ہے جو کہ کسی کو نہ ملا
کام میں سیر ہے جو تنگ کر بیانہ رہا

صبح ہو چکی ہے اور درختوں کی پھنگوں پر سنہری دھوپ اپنی چمک دکھانے لگی ہے۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے پھول کھل رہے ہیں مگر جو رات بھر نہیں سوئے ہیں، اُن کے لئے یہ ٹھنڈی ہوا اور ہی سے زیادہ سُلانیوالی اور دماغ کو سکھ پہنچانیوالی ہے۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں اور خراٹے لینے لگتے ہیں۔ ماہ منیر اور مورکھا ساری رات چلے ہیں، اور اب بھی چلے ہی جاتے ہیں۔ مگر گھوڑوں کی طاقت نے جواب دیدیا ہے۔ اور اب مارے پیٹنے سے قدم اٹھاتے ہیں۔

ماہ منیر: "کیوں مورکھا ہم اپنے گھر سے کوئی سو میل تو نکل آئے ہونگے؟"

مورکھا: "جناب عالی بلکہ کچھ زیادہ عرب کے ماشاء اللہ گھوڑے اور دو رات ایک دن چلتے ہوئے گذر گیا اور وہ بھی دُڑکی اور پوئیہ میں تو جانتا ہوں کہ کالنج سے ہم ڈیڑھ سو میل دور آ گئے ہیں۔"

ماہ منیر: "مگر اب گھوڑوں میں دم باقی نہیں ہے۔ بلو میرا بدن تو سارا پکا پھوڑا ہوگیا ہے۔ اب کہیں ٹھیرنا چاہئے۔ درد کے مارے سر پھٹا جاتا ہے۔"

مورکھا: "اس میں کیا شک ہے۔ حضور کے دشمنوں نے بھلا ایسی مصیبت کاہے کو اُٹھائی تھی۔ بس اب گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی اور بات رہی ہے۔ دیکھئے یہ سڑک جس پر اس وقت ہم چل رہے ہیں اس کا قرینہ کہتا ہے کہ کوئی آبادی اس سے تھوڑے

ہی فاصلہ پر ہے۔ انشاءاللہ آبادی میں پہنچ کر ٹھیریں گے۔"
ماہ منیر:- دیکھنا یہ دہنے ہاتھ کو نیلے نیلے آسمان میں سفید سفید کیا چیز دکھائی دے رہی ہے؟"
سورکھا:- ماشاءاللہ آپ کی بڑی تیز نظر ہے میں تو آگے کو دیکھتا جاتا تھا۔ آئے حضور یہ تو مسجد کا گنبد ہے۔ اے لیجے وہ تو سارا شہر دکھائی دے رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے آئے اچھی جگہ یہاں ضرورت کی سب شے مل سکے گی۔"
اس فقرہ نے بی ماہ منیر کا دل بھی کسی قدر خوش کر دیا۔ اور اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ جہاں تک بن پڑے شہر میں جلد پہنچ جائیں اور پاؤں پھیلا کر سوئیں جب اس آبادی کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا شہر تو نہیں قصبہ ضرور ہے۔ اور جامع مسجد اور چھوٹے سے قلعہ اور کئی کئی باغ اور ایوان کی سربلندی اور چاروں طرف کی شہر پناہ سے (جو سنگ خارا کی بنی ہوئی ہے) سواد شہر جیسا معلوم ہوتا ہے۔
سورکھا (ایک راہگیر سے) کیوں میاں اس قصبہ کا کیا نام ہے؟"
راہ گیر:- حضرت اس کا نام حسن آباد ہے۔"
سورکھا:- واہ واہ کیا پیارا نام ہے حسن آباد۔"
تھوڑی دیر میں سورکھا اور ماہ منیر قصبہ کے اندر داخل ہو گئے۔
سورکھا (ایک شخص سے) جناب اس قصبہ میں کوئی سرا بھی ہے؟"
شخص:- کیوں نہیں یہاں ایک ایک چھوڑ چار چار سرائیں ہیں مگر آپ جیسے امیروں کے لائق یہاں بہروز کی سرا ہے آپ پوچھتے پوچھتے چلے جائیے۔ اور وہیں ٹھیرئیے۔ سرا کی عمارت دیکھ کر آپ کا دل خوش ہو جائے گا اور آپ آرام بھی بہت اٹھائیں گے۔"
اس شخص کا کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ بہروز کی سرا میں جب ماہ منیر اور سورکھا

پہنچے تو ان کو معلوم ہوا ہم کسی قلعہ کے اندر آ گئے۔ چاروں طرف بہت خوبصورت حجرے اور کمرے بنے ہوئے تھے۔ اور باہر کی رو کار بھی سفیدی اور رنگ سے دلہن بن رہی تھی سرا کا چوک بہت صاف اور ستھرا تھا۔ کوڑے یا کیچڑ کا نام بھی نہ تھا اور سرا کے سب مکانوں میں اکثر امیر اور شریف اُترے ہوئے تھے۔ ماہ منیر اور مورکھا کی امیرانہ صورتیں دیکھکر دو شخص دوڑے۔ اور انکی رکاب تھام کر کھڑے ہوگئے۔ اور بہت ادب سے کہنے لگے حضور اُتر پڑیئے:

مورکھا:۔ بھلا ان کمروں اور حجروں کے سوائے یہاں کوئی ایسا مکان بھی ہے۔ جو سب سے الگ تھلگ ہو اور کوئی اس جا آ۔ نہ سکے۔"

رکاب پکڑنیوالا آدمی "جی ہاں موجود ہے۔ دیکھئے اس کونہ میں جو آپکے ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا دکھائی دیتا ہے یہ اسی محل کا دروازہ ہے آپ چلکر دیکھ لیجئے: ناپسند ہو تو میرا ذمہ۔ کیا حضور آپ کے ساتھ زنانے ہیں؟"

مورکھا:۔ اسوقت تو زنانہ ساتھ نہیں ہے مگر دو ایک دن میں آجائیں گے۔"

رکاب پکڑنیوالا آدمی:۔ "مگر حضور کرایہ محل کا بہت ہے۔"

مورکھا:۔ "کچھ پرواہ نہیں۔"

یہ کہکر مورکھا گھوڑے پر سے اتر پڑا اور گھوڑے کی لگام اس آدمی کو جو ماہ منیر کے گھوڑے کی رکاب تھامے کھڑا تھا پکڑا کر اس شخص کے ساتھ محل دیکھنے چلا گیا۔ محل کے اندر گھسا تو اسے معلوم ہوا کہ ایک مختصر مگر دلکشا مکان ہے جس کے چاروں ضلع بنے ہوئے ہیں۔ اور صحن میں چوکوں کا فرش ہے۔ سامنے صدر دالان ہے اس میں چاندنی بچھی ہوئی ہے۔ اور ایک ایرانی قالیچہ اور گاؤتکیہ بھی موجود ہے۔ دہنے بائیں صدر دالان کے جو کمرہ ہیں ان میں جاجمیں بچھی ہوئی ہیں اور ہر کمرے میں دو دو نواری پلنگ کھڑے ہیں۔ تاکہ ضرورت کے وقت بچھائے جائیں۔ آبدار خانہ میں مٹکے بھلیاں۔ جھجریاں کھی

ہوئی ہیں فقط پانی بھرنے کی دیر ہے۔ غسلخانہ صحت خانہ بھی صاف ہے۔ مورکھا مکان دیکھ بھال کر اور مکان کو پسند کر کے باہر آیا اس میں سرا کا ٹھیکہ دار بھی آگیا اور سلام کر کے کہنے لگا۔ اگر آپ اس محل میں ٹھیریں گے تو پانچ روپیہ روز کرایہ کے دینے پڑیں گے۔

مورکھا "بہت اچھا پانچ روپیہ روز ہی دیئے جائیں گے ہمیں منظور ہے۔"

سب سے پہلے مورکھا نے ماہ منیر کو گھوڑے سے اتار محل کے اندر پہونچایا۔ اس کے بعد خرجیاں اور تمام اسباب آدمی سے اُٹھوا کر محل میں لیگیا۔ بچھونا نکال جھٹ پٹ پہلو کے کمرے میں بچھا دیا۔ اور ماہ منیر جا کر اس پر لیٹ رہیں۔ چار دن کی بیچاری تھکی ماندی پڑتے ہی اُسے تن بدن کی خبر نہ رہی۔ مورکھا نے جب خراٹوں کی آواز سنی تو اس نے کمرے کے کواڑ باہر سے ہاتھ بڑھا کر بھیڑ دیئے اور آپ محلسرا کے باہر آیا۔ دونوں آدمیوں نے گھوڑوں کو اچھی طرح ٹہلا لیا تھا۔ مورکھا نے ان کو بھی ایک موقع سے بندھوا کر اُن کے آگے گھاس ڈلوا دی اور اس آدمی سے جس نے پہلے پہل آکر مورکھا کی رکاب تھامی تھی کہا "جمشید یہ چار روپیہ لو اور بازار سے یہ راتب ہمارے گھوڑے کے لئے لے آؤ۔ مگر دیکھنا جانور بے زبان کا حق کا کھانا بُرا ہوتا ہے۔ راتب خریدنے میں کچھ دستوری وستوری نہ لینا ہم تمہیں دستوری سے زیادہ دیدیں گے۔ اور خوش کر کے جائیں گے۔"

پھر وہ باورچی کی دوکان پر گیا جو سرا کے دروازے کے باہر تھی اس سے کہا کہ قورمہ اور کباب۔ میٹھے چاول بریانی اور چپاتی دو تین آدمیوں کے لائق تیار کرو۔ اور شام کے لئے اور کھانا بتا دیا جائے گا۔ مگر سب کھانے بہت تحفہ پکانا۔ اگر ہمارے حضور کو تمہارے ہاتھ کا کھانا پسند آگیا۔ تو تمہیں انعام دے کر جائیں گے۔

باورچی "حضرت آپ کے حضور کون ہیں"
مورکھا "سمرقند کے امیرزادہ ہیں"
باورچی "اور آپ ان کے کون ہیں"
مورکھا "میں اُن کا غلام ہوں"
باورچی "بہت اچھا میں ایسا نفیس کھانا پکاؤں گا جو آپ اور وہ دونوں کھا کر خوش ہوں"

مورکھا پھر محل میں چلا آیا۔ اور دالان میں جو قالین بچھی ہوئی تھی اس پر لیٹ گیا۔ اور گاؤتکیہ سرہانے رکھ لیا یہ بھی تھکا ہارا تھا لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی اور اسے بھی اپنے سر پاؤں کی خبر نہ رہی۔ دن کے ایک بجے تک خوب ہی سویا وہ شاید شام تک بھی نہ اٹھتا۔ جو اُسے جمشید آکر نہ جگاتا۔

جمشید "حضرت آپ کو نورالدین باورچی بلا رہا ہے۔ کہتا ہے کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔ آکر لیجائیے۔ نہیں آپ مجھے دوش دیں گے کہ کھانا بُرا پکا تھا کھانا ٹھنڈا ہوئے پیچھے مٹی ہو جاتا ہے خاک بھی مزا نہیں رہتا"

مورکھا جاکر کھانا لے آیا۔ مگر کھلاتا کس کو جب جاکر دیکھا ماہ منیر کو سوتا پایا۔ اور جگانا مناسب نہ سمجھا یہانتک کہ رات کے آٹھ بج گئے۔ اور ماہ منیر پڑی سوتی رہیں۔ جمشید نے شمع کے دو ڈیکے مورکھا کے حوالہ کرکے کہا ایک یکہ سونے کے کمرے میں اور ایک صدر دالان میں رکھ کر جلا دیجئے۔ پھر جاکر ایک چراغ اور لاکر دیا اور کہا یہ غسلخانہ صحت خانہ کے آنے جانے کے کام آئیگا۔ ۹ بجے رات کے ماہ منیر بیدار ہوئیں تو دیکھا مورکھا کمرہ کے باہر چوکھٹ سے لگا بیٹھا ہوا ہے۔ ماہ منیر بستر پر سے اُٹھکر کمرے کے باہر آئیں اور بڑے ناز سے کہنے لگیں مورکھا آفتابہ کہاں ہے؟

مورکھا: "حضور صحت خانہ میں"
ماہ منیر: "آفتابہ بھی رکھدیا ہے یا روشنی بھی"
مورکھا: "نہیں حضور روشنی بھی رکھی ہے چراغ جل رہا ہے۔ میں حضور کا ہاتھ پکڑ کر پہنچا آؤں"
ماہ منیر: "تیری کچھ حاجت نہیں ہے میں آپ چلی جاؤنگی"
ماہ منیر صحت خانہ سے نکلیں تو دیکھا دالان میں زیرانداز بچھا ہوا ہے اس پر ایک لگن رکھا ہے اور ایک آفتابہ گرم پانی سے بھرا ہوا دہرا ہے۔
ماہ منیر: "ہیں یہ لگن اور دوسرا آفتابہ کہاں سے آیا"
مورکھا: "حضور میں سرائے والے سے مانگ لایا ہوں"
ماہ منیر: "تو نے بڑے سلیقہ کا کام کیا"
مورکھا: (سلام کرکے) "حضور کی قدر دانی"
ماہ منیر وضو کرکے عشا کی نماز ادا کرکے فارغ ہوگئیں تو مورکھا نے عرض کی۔ بیگم صاحب خاصہ تیار ہے کچھ ادوش فرماد یجے تو بہتر ہے۔
ماہ منیر: (آہ سرد بھر کر) کیسا خاصہ اور آبحیات اور کیسا اوش کرنا وہ بھی ایک خواب تھا جو تقدیر نے پندرہ برس تک دکھایا۔ آب حیات اور خاصہ گیا خوارزم کے ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ فقرہ کہکر ماہ منیر کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور وہ دیر تک زار وقطار رونے لگی۔ جب رونے سے اس کا دل کسی قدر ہلکا ہوگیا۔ تو اس نے کہا مورکھا تیری خوشی کھانا لے آ۔ جو کچھ کھایا جائے گا کھاؤں گی۔ مورکھا دسترخوان بچھانے لگا۔ تو ماہ منیر نے دیکھا مورکھا کی آنکھیں بھی رونے سے لال ہوگئی ہیں۔ اور اس کے رخساروں پر آنسو بہ رہے ہیں۔

ماہ منیر سندا کی شان آپ بھی روتے ہیں یہ نیا تماشا ہے قصائی بکری کے گلے پر چھری بھی پھیرتا جاتا ہے۔ اور روتا بھی جاتا ہے۔ یہ اچنبھے کی بات ہے ؟

ماہ منیر کھانے سے فارغ ہوتے ہی کمرہ میں جا کر اپنے پلنگ پر لیٹ رہی کیونکہ ابھی نیند کا خمار اور رستہ کی تھکان باقی تھی۔

مورکھا بہ حضور اگر تکلیف نہ ہو تو کمرہ کا کھٹکا اندر سے لگا لیجئے ؟

ماہ منیر۔ اچھا لگائے لیتی ہوں ؟

یہ کہہ کر ماہ منیر پلنگ سے اٹھی اور کھٹکا لگانے کے بہانہ سے کواڑوں کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اور دراڑوں میں سے جھانک کر دیکھنے لگی۔ کہ مورکھا کہاں سوتا ہے کیا کرتا ہے اس نے دیکھا کہ مورکھا کھانا کھا کر وہ قالین جو صدر دالان میں بچھی ہوئی تھی گھسیٹ کر کمرے کے دروازہ کے پاس لے آیا۔ اور تلوار میان سے نکال اپنے پہلو میں رکھکر قالین پر لیٹ گیا۔ اور اوپر سے اونی چادر اوڑھ لی۔ اور کمرہ کی چوکھٹ کا تکیہ بنا کر اس پر اپنا سر رکھ لیا۔ ماہ منیر کو مورکھا کی یہ مسکینی بہت پسند آئی اور اس نے اپنے دل میں کہا یہ کمرے کی چوکھٹ پر سر رکھکر میری حفاظت کے لئے سویا ہے۔ اور تلوار بھی اسی واسطے ننگی کر لی ہے۔ کہ اگر خدانخواستہ کچھ کھٹکا ہو تو فوراً مقابلہ کے لئے تیار ہو جائے۔ ماہ منیر نے رات بھر پریشان خواب دیکھے۔ اور اپنی عادت کے موافق کئی دفعہ انا اور دادا کو پکارا۔ کئی بار وہ سوئی اور جاگی۔ اور رنج و غم کی وجہ سے صبح ہی اسکی آنکھ کھل گئی اور جب اس کو مورکھا کی اس چالاکی اور دھوکہ بازی کا خیال آیا تو وہ مارے غصہ کے بچھونے پر پڑے پڑے تھر تھر کانپنے لگی۔ اور آخر وہ بولا کر کمرہ سے باہر نکل آئی اور مورکھا کو جا نماز پر تسبیح پڑھتے دیکھکر وہ آگ بھبھوکا ہو گئی اور اس بدنصیب کو صبح ہی صبح جوتیوں سے پیٹ ڈالا۔ جوتیاں مارتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی اسے موئے مورکھا میرے باپ کے غلام ملے تو ہو اور میں ہوں۔

مورکھا کے سر کے بال جب ماہ منیر نے چھوڑ دئے تو وہ اپنے تئیں جھاڑ پونچھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ اگر چلنے کا ارادہ ہو تو فرما دیجے۔ گھوڑے کس لئے جائیں۔

ماہ منیر:۔ دور ہو میرے سامنے سے شد خورے بدذات نابکار دغاباز۔ میری تکان ابھی نہیں اُتری ہے میں یہاں سے تین روز بھی جانے کا نام نہیں لینے کی۔ تیرا جی جانے کو چاہتا ہے تو۔ تو چلا جا کالا منہ کر جس کم جہاں پاک"۔ مورکھا نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور مکان کی صفائی اور درستی میں مشغول ہو گیا۔

حکیم سید ناصر نذیر فراق دہلوی

تصویریں:۔ آج کے مخزن میں جو دو تصاویر زیب سرورق ہیں۔ ان کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں محمد شاہ رنگیلے کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ آشنا ہے۔ یہ زمانہ ایک طرف تو سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال کا زمانہ تھا۔ دوسری طرف اُمرا کی عیش پرستی کا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان دنوں شعر و سخن کی قدر تھی اور اسی لئے اس طرف طبیعتوں کا رجحان تھا۔ مگر سچ پوچھو تو وہ شاعری جو جان سخن ہے مفقود تھی۔ مصنوعی رنگ آمیزیاں اور اوچھے جذبات کا اظہار البتہ بہت کچھ تھا۔

دوسری تصویر محمد شاہ بادشاہ کی چاہتی بیگم ملکۂ حسن "قمری حور پیکر" کی ہے جس کا پایۂ حسن بیگمات خاندان مغلیہ میں سے بجز ایک دو کے کسی ہی کو نصیب ہوا ہو گا۔ (ایڈیٹر)

صلائے عام

[یہ نظم ریختہ کلک جواہر سلک خواجہ دل محمد صاحب ایم۔اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کی طبع موزوں کا نتیجہ ہے۔ جو ان کی زبان گوہر فشان سے ہمیں سالانہ جلسہ انجمن ترقی تعلیم مسلمانان امرتسر کے موقعہ پر سننے کا شرف حاصل ہوا۔ چونکہ پبلک خود خواجہ صاحب کے علمی کمالات کو بخوبی جانتی ہے اسواسطے اُن کے تعارف کرانے میں زیادہ قلم فرسائی سعی لاحاصل ہے۔ ایڈیٹر]

اصول پیکار زندگی ہے قدم کو آگے بڑھاتے جاؤ
صعوبتوں کو اُٹھاتے جاؤ جہاں کو ہمت دکھاتے جاؤ

کسی نے پہلے شجر لگایا کہ جس کے بیٹھے ہو زیر سایہ
یونہی تم آئندگاں کی خاطر چمن میں پودا لگاتے جاؤ

وہ شوکت و منیہ کا جلوہ، وہی وہ علم و ہنر کا چرچا
وہ نقشہ بغداد قرطبہ کا پھر انڈیا کو دکھاتے جاؤ

زمین پنجاب میں بنا دو علوم اسلامیہ کا کوثر
اور اُس سے شہد و لبن کی نہریں جہاں جہاں بہاتے جاؤ

ہے ہند کا گھپ اندھیرا عالم کہ بتیاں سو گئی ہیں ہم
وہ شمع نور محمدی اس صنم کدہ میں جلاتے جاؤ

ہیں شورش امتیاز ملت نے ڈال رکھے بہت بکھیڑے
بنا کے اک قوم مسلموں کی تفرقے سب مٹاتے جاؤ

نہ ٹوٹے شیرازہ قومیت کا جو لیجے ہمت سے تھام اسکو
اگر ہوں اوراقِ گل پریشاں تو ہے فنا کا پیام اسکو

تو چشم عبرت سے دیکھ غافل کہ راز کیا روزگار میں ہے
کبھی تو گوش خیال سے سن جو ساز لیل و نہار میں ہے

گنوا رہا ہے جو تو گھڑی پل، یہ کل کریگی تجھی کو بیکل
بہت ہوئی دیر جاگ اُٹھ چل کہ مہر نصف النہار میں ہے

رہیگا خواب دراز کب تک، یہ آنکھیں کھینچیگا بار کب تک
یہ ناز بندہ نواز کب تک کہ اب تلک سر خمار میں ہے

ہے گلشن سی بہار ہستی ہے خون دل لالہ زار ہستی
وہ گرم ہے کارزار ہستی ہے جیت میں کوئی ہار میں ہے

ہو شمع روشن گداز ہو کر تو ناز ہو جا نیاز ہو کر
تو غزنوی بن ایاز ہو کر مزا اسی انکسار میں ہے

ترے ہی آبا نے کی بنائیں علوم و حکمت کی اس جہاں میں جہاں کو چھانے ہے جس کی خاطر قلم ترے کو کہیں پہ
کہاں وہ اب سطوت جلالی، کہاں وہ اب سایت بلا کی وہ ساری باتیں ہوئیں خیالی بہت طبیعت خفا ہے میری

وہی وہ اگلا سا پھر ترانہ ذرا اسی لے میں گاتے جاؤ
وہی وہ اسلاف کا نمونہ پھر اس جہاں کو دکھاتے جاؤ

سحر زبان درا تڑپ کے یہ کہہ رہی تھی سنا سنا کر کہ قافلے منزلوں پہ جا ہیں خواب راحت گنوا گنوا کر
ابھی ہیں تو میں بڑھی ہیں قومیت بام عزت پہ چڑھی ہیں قومیں خرد کے زینہ پہ چڑھ چڑھا کر کمند ہمت لگا لگا کر
بھرے تھے اک وقت اپنی مخزن جو لگئے غیر بھر کے دامن کچھ علم باقی رہا نہ اب فن خزانے اپنے لٹا لٹا کر
ہو لے نشو و نما اگر ہو۔ تو چاہئے مشق زخم خوردن نہال دیکھو کہ گلستاں میں ابھرتے ہیں سر کٹا کٹا کر
نمود نام نکو کی خاطر ہی ہونا ایثار کا ضروری کہ شمع کرتی ہے گھر کو روشن خود اپنے تن کو جلا جلا کر
جو صاحب نام ہیں جہاں میں وطیرہ انکا ہی سادگی کا نگین خاتم نے نام پایا سپر اپنا جھکا جھکا کر
یہ چھوڑ افکار رسم و فیشن یہ فکر پتلون و ذکر لندن بنا کے دکھلا دو ہم کو نیشن لباس ملت سجا سجا کر
رکھو نہ فکر معاش ہر دم یہ سیم و زر کی تلاش ہر دم کچھ اور ہی لطف زندگانی ملے جو ہستی مٹا مٹا کر
دل فسردہ کو حرف الفت نہیں ہے باد نسیم سے کم وطن کو اپنے چمن بنا دو دلوں کے غنچے کھلا کھلا کر

کرو تلاش کمال ملکہ ہیں گرچہ روز زوال پہلے
وہی تو بنتا ہے بدر کامل جو تھا ذرا سا ہلال پہلے

معجون مذاق

(۱)

مفلسی میں چھت ٹپکتی ہے بھری برسات میں آتی ہے باران رحمت اتے دن گھر پھاڑ کے
جو مقدر ہے وہ ٹل سکتا نہیں طالب کبھی تیری قسمت کا تجھے ملتا ہے چھپر پھاڑ کے

کوئی بیمار دم توڑے۔ کسی دکھیا کا جی نکلے — دوا بیکار ہی حکمت بری نکلے بھلی نکلے
پڑی ہی ڈاکٹر کو یہ کسی صورت سی فی نکلے — نکالے فی کوئی یا کچھ کہے پروا نہیں طالب

(۳)

لکچروں میں ہمارے یاروں کے — کچھ عجب آن بان ہوتی ہے
جھوٹ کے پاؤں تو نہیں ہوتے — ہاتھ بھر کی زبان ہوتی ہے

(۴)

آج کی دنیا میں یہی شغل ہے پانچ نہوں کیونکر — کیا جورو شوہر جی سر ڈرے کیا شوہر کے پوبارہ ہوں
بلّی وال پہلتے تھے تو تڑے لگا دیتی تھی دہیں — بوٹے اتاریں جب تک بیوی تب تک فی دو گیارہ ہوں

(۵)

میں بیوی کی آمد میں کیا خرچ اٹھائے بیٹھے ہیں — بل انگریزی سوداگر کے سر پہ چڑھائے بیٹھے ہیں
اکدن اپنی نکٹائی سی اپنا گلا ہم گھونٹیں گے — اسی لئے ہر وقت گلے میں پھانسی لگائے بیٹھے ہیں

(طالب بنارسی از بمبئی)

نظارۂ عالم

عجب روش۔ رنگ کچھ نرالا جہاں کے فانی چمن میں دیکھا
مدام پابند فکر صیاد۔ بلبل نغمہ زن میں دیکھا
جو پائی نرگس کی شکل حیراں تو زلف سنبل ملی پریشاں
نہ سبزے میں بوئے انس پائی نہ رنگ روئے سمن میں دیکھا
مزہ جو خلوت میں ہم کو آیا۔ وہ انجمن میں نہ ہم نے پایا
ملا نہ جو بن وہ بستیوں میں۔ جو لطف طالب نے بن میں دیکھا
جو شمع محفل میں ہے فروزاں۔ تو ٹپکے پڑتے ہیں اشک سوزاں

سرِ دس کو کل گیسے کٹاتے تمام شب انجمن میں دیکھا!
جنھیں صفائے دروں ہے حاصل۔ انھیں پہ برق بلا ہی نازل
فروغ عالم ہیں چاند سورج۔ انھیں کو اکثر گہن میں دیکھا
فریب و فن سے جو ننگ لائے۔ وہ سرخروئی جہاں میں پائے
جو صاف طینت فرشتہ سیرت ہیں انکو بند محن میں دیکھا!
جو ہے یہاں فیض بخش عالم۔ وہ ہے شب و روز بستۂ غم
کرے جو سیراب تشنہ لب کو۔ وہ ڈول ہم نے رسن میں دیکھا
جو نفس سرکش کی سرکشی میں نظر پڑا زور و آز ہم کو
نہ مکر وہ عورتوں میں پایا۔ نہ کید وہ اہرمن میں دیکھا
یقیں ہوا یہ کہ عشق صادق کبھی اثر سے نہیں ہے خالی
گنواتے شیریں کو جان شیریں جو ماتم کوہکن میں دیکھا
جفا کی رسمیں نرالی دیکھیں انوکھی بیداد پائی طالب
نئے چلن کا ستم ہمیشہ طریق چرخ کہن میں دیکھا!!

طالب بنارسی

رجز ترکی

کل مجھے قسمت سے اک ترک مسلماں ملگیا
خوش وضع خوش رنگ خوش رو خوش خیال و خوش قبا

میں نے پوچھا اے نگہبان نشان مصطفےٰ
قوم تو تیری ہے سو رنج و بلا میں مبتلا

کیا غضب ہے تو نظر آتا ہے یوں خوشدل مجھے
اے اخی تو نے نہیں حال وطن شاید سنا

گھر گئے دشمن کے نرغے میں سپہ داران روم
چار سو کفار نے غارت پہ ایکا کر لیا

بے خبر تو ہنس رہا ہے رونا آتا ہے مجھے
اے خدا رکھے تجھے ہر روز ہنستا کھیلتا

آجکل یہ چہچہے یہ خوشدلی زیبا نہیں — اے برادر وقت ہے یہ نالہ و فریاد کا
تجھکو اے غافل کبھی آتا ہے اس کا بھی خیال — کل تلک اسلام کیا تھا آج کیا ہو گیا
جا چکے مصر و مراکش ہاتھ سے اسلام کے — اب تو ہر ایران گیا اور اسطرف ٹرکی چلا
میری ان آنکھوں کے آگے تخت دل اسلام کے — دور ناہنجار سب ایک ایک کے لے گیا
شوکت اسلام مٹتے دیکھ لی پھوٹی یہ آنکھ — کیا یہی دن دیکھنے کو ہائے میں پیدا ہوا
میں کہ ہندی ہوں ہے میرا غم سے کلیجہ چاک — اور تجھکو ترک ہو کر بھی نہیں پروا ذرا

یہ خوشی یہ خوشدلی ہم کو نہیں درکار ہیں
سطوت اسلام کے ہم لوگ ماتم دار ہیں

آ تو سر پیٹیں کہ مجبوروں کی بس یاں تک ہے بار — آ تو دامن چاک کر لیں اور گریباں تار تار
آ تو سر پر خاک ڈالیں آ تو چلائیں کہیں — آگ سینے کی بجھاوے آبِ چشم سوگوار
آ تو ماتم کے لئے ہم محفل آرائی کریں — آ تو خالق سے کریں فریادِ جورِ روزگار
وقت پر پہچان ہوتی ہے رفیق و غیر میں — کون دیکھیں آج بنتا ہے ہمارا غمگسار
دیکھ خاکِ پاکِ ترکستان خون آلود ہے — وادیٔ فاراں میں ہے فریاد و شیون کی پکار
اے نشانِ عظمتِ دیرینۂ اسلام میں — تیری غربت پر فدا تیری مصیبت پر نثار
پھونک ڈالا ایک عالم تیرے سوزِ درد نے — کیا غضب ہے تو نہیں آشفتہ دل افسردہ کار

اے مکینِ خیمۂ آتش نشیں فریاد کر!
اب ترا غیر از خدا کوئی نہیں فریاد کر!

سن کے یہ حرفِ جنوں آمیز وہ فرخندہ خو — مسکرا کر یوں لگا کہنے کہ سچ کہتا ہے تو
جو کہا تو نے نہیں اس میں سرِ مو اختلاف — دیکھتا ہوں ہے یہی حالت ہماری ہو بہو
غم مگر کس چیز کا جب جان کی پروا نہیں — درد کیسا یہ گئے جب دل جگر ہو کر لہو
تیغ سے کیا ڈر کہ ہم تیغوں کے سائے میں پلے — جنگ سے کیا خوف ہم سو پشت سے ہیں جنگجو

وار خالی ہی نہ جائے گا کسی جانب کریں — اور خوبی ہے اگر اعدا ہوں اپنے چار سو
کوستا ہے کس لئے اس روز کو اس روز کی — ابتدائے آفرینش سے مجھے تھی جستجو
چار فرض اسلام کے ہر عہد نے پورے کئے — سب فرائض ہی ہمیں وہ ہیں کہ ہونگے سرخرو
سب سے آخر آئے ہیں ہم سب سے اول ہو گئے — دیکھ اللہ نے گنہگاروں کی رکھی آبرو
دہر میں پہلی سُنی اللہ اکبر کی صدا — آخری آواز بھی یہ ہو یہی ہے آرزو
عرصہ بیکار ہے دروازۂ خلدِ بریں — آب خنجر ہے ہمیں جامِ شرابِ مشکبو

قسمت نایاب جا کر آسماں سے لائے ہیں
عزت اسلام پر مٹ جانے کو ہم آئے ہیں

شکوہ و جواب شکوہ

دلِ بیتاب کہ تھا کثرت غم سے ناچار — اُس نے چاہا کہ کہے یار سے کچھ حالتِ زار
چشم ظاہر کے لئے پردہ کیا اک تیار — شکوہ کے رنگ میں تھی حسن طلب کی تکرار

غیر کو حکم ملا ہائے تسلی کے لئے
کیسی تسکین وہ اور اُلٹا گلہ لے بیٹھے

نام رکھا ہے متیں اس نے تو ہی تاب ضرور — ضبط کا وصف بھی لازم ہے اگر ہو وہ صبور
بات سنتا بھی ہے۔ کیا یاد نہیں قصۂ طور؟ — علم ہوتے بھی جتا ئیں یہ دعا کا دستور

ہم مسلماں نہ سہی دعوئے اسلام تو ہے
مومنوں کی صفتیں گو نہیں پر نام تو ہے

سچ ہی یاں ذکر صلوٰۃ اب ہے نہ ہی فکر صیام — نیکیوں کا بھی نہیں نامۂ اعمال میں نام
ہم ہیں اگلے سے نہیں شرع نبی کے خدام — بد نہیں اتنے مگر جتنے ہوئے ہیں بدنام

بندۂ دیں بھی ہیں پابند شریعت بھی ہیں
سیکڑوں راہرو کوئے طریقت بھی ہیں

فرط غم سے متغیر ہوئی صورت اپنی — چھین لی صحبت اغیار نے عادت اپنی
مفت رفتہ ہوئی جب غیر حکومت اپنی — پھر تو ہونی ہی تھی جو ہونے لگی گت اپنی
دستگیری جو مصیبت میں کرے یار وہ ہے
خاک ڈالے جو کسی عیب پہ ستار وہ ہے

کیجئے فرض کہ اسلام کو ہم بیٹھے کھو — بھولتا تو نہ مگر لیس لہٗ غیرہٗ کو
تیرے در سے جو عطا ہوتے ہیں دانے دو — گہر اشک نہ آنکھوں سے بہاتے رو رو
ناز ہم کرتے ہیں دنیا اُسے کہتی ہے گیت
کیا اسی دن کے لئے تو نے کہا لفظ رضیت

نام مومن ہے مگر کام سے اسلام کے ڈھیل — گر نہیں شکر موکل کی تو کیونکر ہے وکیل
شکوہ تمہید ہے اور عرض مطالب کی سبیل — بات بیکار نہیں حالتِ دل کی ہے دلیل
کام ہوتا ہے سدا سلسلہ جنبانی سے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں رہیں نادانی سے

شکوہ ظاہر میں تو ہے رنج و الم کا شکوہ — حالت زار کا اور کثرتِ غم کا شکوہ
حال دنیا کا غریبی کا ستم کا شکوہ — اصل میں غیروں کے ہے لطف و کرم کا شکوہ
کب یہ کہتا ہوں کہ تنبیہ کی تاکید نہ کر
ہاں مگر محفل اغیار میں تہدید نہ کر

یا خدا شکوۂ اقبال سے کچھ کام تو لے — بیکسی میں علم قوت اسلام تو لے
قسمتوں سے اثر گردش ایام تو لے — ید قدرت میں مئے عشق کا اک جام تو لے
پھر وہی راز و نیازِ جبل طور تو ہو

دل وزاکار جہاں کے لیے مسرور تو ہو

پھر وہی بات ہو پیدا ترے دیوانوں میں شان ہو پھر وہی اسلام کے دیوانوں میں
بھروسے پھر کوٹ کے دانائیاں نادانوں میں آج بھی وہ دل ہے ترے حسن کے پروانوں میں

یا رب ہو مذہب اسلام ہو اور نام ترا
کعبۂ دہر میں گونجے وہی پیغام ترا

(تصدیق)

بعد مدت بتِ طناز مرا رام ہوا

آج پُر بادۂ عشرت سے مرا جام ہوا بخت بیدار مرا داغ آلام ہوا
صبر کرنے کا محبت میں یہ انجام ہوا کامیابی سے مشرف دلِ ناکام ہوا
بعد مدت بتِ طناز مرا رام ہوا

اب کہاں سوزِ دروں سوز نہانی باقی اب کہاں چشم کی خونابہ فشانی باقی
اب کہاں درد و الم کی ہے کہانی باقی اب کہاں رنج و تعب کی ہے نشانی باقی
بعد مدت بتِ طناز مرا رام ہوا

اب کہاں ہے شبِ غم اور شبِ تار کا ذکر اب کہاں آہِ سحرگاہ شرربار کا ذکر
اب کہاں خاطرِ غمگین و دلِ زار کا ذکر اب کہاں لب پہ مرے چرخ ستمگار کا ذکر
بعد مدت بتِ طناز مرا رام ہوا

اب غم و رنج سے بس صورتِ تصویر نہیں پھر وہ گویائی ہے رکتی ہوئی تقریر نہیں
طبع موزوں ہے کوئی مانعِ تحریر نہیں خوش نصیبی یہ نہیں۔ یہ مری تقدیر نہیں؟
بعد مدت بتِ طناز مرا رام ہوا

اب کسے کام شبِ ہجر کی بیداری سے اب کسے ذوق ہے اس گنبدِ زنگاری سے

اب کسے موت ہے اس غم کی گزنا بھی ہے | اب کہاں درد جگر اپنی دل آزاری سے

بعد مدت بتِ طناز مرا رام ہوا

اب کسے ہجرِ صنم میں ہے خور و خواب حرام | اب کسے بادۂ گلفام ۔ مئے ناب حرام

اب کسے عیش و طرب جلسۂ احباب حرام | اب کسے منزلِ شادی کا ہر اک باب حرام

بعد مدت بتِ طناز مرا رام ہوا

اب کہاں یار کی وعدہ شکنی کا شکوہ | اب کہاں اس کی دل آزاری کا پھر وہ چرچا

اب کہاں فکرِ ستم تذکرہ جور و جفا | اب کہاں ہے وہ مرا آٹھ پہر کا رونا!

بعد مدت بتِ طناز مرا رام ہوا

خوش نصیبی یہ ہوں با بسط میں نہایت شاداں | ہو گئی فضلِ خدا سے مری مشکل آساں

داد دینے لگا الفت کی وہ شاہِ خوباں | اس کا پاتا ہوں میں اب ظاہر و باطن یکساں

بعد مدت بتِ طناز مرا رام ہوا

ہیں مسرت کے مرے واسطے کیا کیا ساماں | لیے گلگشتِ چمن جاتا ہوں فرحاں شاداں

ساتھ میں کون ہے اس وقت وہی جانِ جہاں | بیخودی میں ہے یہی مصرعہ مرے ورد زباں

بعد مدت بتِ طناز مرا رام ہوا

غزلیں

(از جناب الطاف الٰہی رنگین)

سنبھل اے رہروِ دل خواہاں ہو وحشت کے ساماں کا | تری گردن پہ ہوگا خوں مرے چاک گریباں کا

چلا ہے چھوڑ کر تشنہ مجھے خونِ جگر شاید | کہ ہے منت کشِ احساں ہر آنسو میرے مژگاں کا

غبارِ آہ پردہ پوش ہے آئینۂ دل کا | تصور پر عبث شکوہ ہے میری چشمِ حیراں کا

ادھیڑا چاک دامن رشتۂ سوزن بنانے کو | رفو کرنا نہیں آتا ہے مجھے چاک گریباں کا
سبق آموز نیرنگی گردوں ہے مرا طالع | بھرا ہے رنگ گردش میں مری تقدیرِ خنداں کا
بھلا ہو ضبط کا رک رک کے توڑا تارِ آنسو کو | ہے نقشہ سامنے آنکھوں میں انکے عہد و پیماں کا
بھرم رہ جائے چشموں میں یا رب میری چشموں کا | دمِ رخصت ہو نظارہ کسی کی چشمِ فتاں کا
درِ دولت پہ جا کر عرش والے پر بھی جلتے ہیں | کہ بڑھ کر عقلِ کل سے مرتبہ ہے انکے دربان کا

میں ہوں شوریدۂ بانگِ الست ایسا کہ اے رنگیں
ہے تارِ سازِ وحدت میرا ہر رشتہ رگِ جاں کا

(از جناب باسط بسوانی سیتاپور)

کھوتی ہے جان بلبلِ نالاں چمن سے دور | دشمن کو بھی کرے نہ مقدر وطن سے دور
نالاں بہت ہے بلبلِ شیدا چمن سے دور | غربت میں روئے جیسے مسافر وطن سے دور
وعدے کا کچھ بھی پاس کرے وہ ستم شعار | یہ بات ہے بہت مرے پیماں شکن سے دور
تڑپاتی ہے مجھے خلش نوکِ خارِ غم | گلگشت میں جو ہوں کسی غنچہ دہن سے دور
سیدھی نظر نہیں ہے تو ترچھی نظر سہی | کچھ بھی نہ ہو یہ آپ کے ہے بانکپن سے دور
وہ شعلہ رو جو لاش پہ آیا ہے بعدِ مرگ | شعلہ بھڑک رہا ہے ہمارے کفن سے دور
نکلا نہ خارِ حسرت و غم روزِ عید بھی | رکھا نصیب نے کسی گل پیرہن سے دور
کل رات کس طرح سے کٹی کیا بیاں کریں | خلوت میں رو رہے تھے تری انجمن سے دور
کہتا ہے وہ ستاؤں نہ باسط تو ہے بہت | شوخی سے میری دور ہے میرے بانکپن سے دور

(۲)

نہ ٹوٹا مر کے رشتہ مہر کا اولادِ آدم سے | کفن زیرِ زمیں بھی ساتھ ہے اسبابِ عالم سے
بندھا وہ سلسلہ مرگِ اسیرانِ محبت کا | پریشاں ہو کے ظالم نے اٹھایا ہاتھ ماتم سے
دکھا دیتا ہے دم بھر میں مجھے تو عالمِ بالا | ترے مے نوش کو کیا کام ساقی ساغرِ جم سے

پھری رہتی ہیں کیوں اے نرگس بیمار پیچ کتنا — بتا اے سلوئے جاناں کہ رہتا کیں خفا ہے

ترا طرز خود آرائی انکھا اکہاں سے ہے — ترا انداز خود بینی جدا ہے سارے عالم سے

ادا ایسی سبہلے چہرے کی پریشانی ہے بالوں کا — قیامت ہو گئی برپا ترے انداز ماتم سے

لب شیریں جو چومے بدمزہ ہوکر لگے کہنے — لگایا منہ تو یوں کرنے لگی گستاخیاں ہم سے

ادہر ہے محفل عشاق میری ذات سے قایم — ادہر بزم حسیناں کی ہی اب زینت ترے دم سے

درازی شب فرقت کہوں کیا اے دل مضطر — ملا ہے سلسلہ صبح قیامت کا شب غم سے

عجب عالم ہی اس مہ کے عرق آلودہ عارض کا — فروغ حسن گل ہوجا مدنی ہیں جیسے شبنم سے

تہو پیر مغاں کا فیض محشر تک نہ بہولے گا — چھڑایا جس نے مجھکو یک بیک افکار عالم سے

کہاں تک ضبط اے یاس کریں کچھ انتہا بھی ہے — پھنکا جاتا ہے اب سینہ ہمارا سوزش غم سے

(از جناب حکیم محمد الیاس صاحب یاس)

شوق دل چشم بنظارہ یارے دارد — وہ کہ در جلوہ گہش صبر و قرارے دارد

بزم را جلوہ تو کردہ طلسم حیرت — کہ ز حیرانی ما آئینہ دارے دارد

ایمکہ از سنگ حوادث بہنر جوید امن — سادہ لوحے ست کہ از شیشہ حصارے دارد

بسر خاک جگر سوختہ دامن بفشاں — کہ براہ تو ہمیں مشت غبارے دارد

سخن از خامۂ ما زندۂ جاوید آمد — طبع ما جیسئے اعجاز نگارے دارد

بوئے نافہ یکن ہمہ طرف مشک فشاں — چین زلف تو بہر عقدہ تتارے دارد

سر فرازند علم حسن تو تا چار جہت — بررخت مردن ما قعبیہ کارے دارد

غمزہ چشم تو حیف ست علی ما ببرد — شاہبازے کہ ہمیں صعوہ شکارے دارد

بر مکافات بود بہرہ غافل ز حیات — گوئی از خواب گراں سنگ مزارے دارد

پیش بلبل از ین شور و فغاں چند کنی — نالہ سوختگان تو شرارے دارد

جلوہ دوست بپیرا سر پاس خوش ست — مہر ہنگام سحر طرفہ بہارے دارد

مقاصد

(۱) اردو علم ادب کی زرخیزی ترقی۔ اعلیٰ درجہ کے علمی اخلاقی۔ ادبی مجلسی مضامین اور جدید و قدیم طرز کی بہترین شاعری کے ذریعہ سے (۲) اردو داں پبلک میں اعلیٰ درجے کے مضامین عمدہ اشعار اور نظمیں اور دلفریب افسانے لکھنے اور انکا مطالعہ کرنیکا شوق پیدا کرنا (۳) اردو کے قدیمی مصنفوں اور شعراء کے کارناموں کے متعلق تنقیدی مضامین شایع کرنا (۴) خاص مذہبی۔ نزاعی اور پولٹیکل مضامین کو مخزن میں جگہ نہ دیجائیگی (۵) اردو نظم و نثر میں مفید اصلاح کرنا (۶) نئے مفید خیالات اور جذبات کو اردو زبان میں داخل کرنا (۷) علوم جدیدہ کیطرف لوگوں کو توجہ دلانا (۸) دوسری زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کو نئے سلیقے میں ڈھالکر اردو میں لانا

قواعد وضوابط

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ کی آخری یا آیندہ ماہ کی اول تاریخ کو شایع ہوتا ہے۔

(۲) ہندوستان کے اندر جن اصحاب کو رسالہ تاریخ اشاعت سے پندرہ دن کے اندر موصول نہ ہو۔ انکی طرف سے ۲۰ دن کے اندر عدم موصولی کی شکایت دفتر میں آجانے سے رسالہ دوبارہ مفت روانہ ہوگا ورنہ بصیغہ وی۔ پی۔ جن خریداروں کو ہندوستان سے باہر مقامات میں رسالہ تاریخ اشاعت سے ایکماہ کے اندر وصول نہو انکی طرف سے ڈیڑھ ماہ کے اندر دفتر میں شکایت موصول ہونے پر رسالہ مفت ورنہ قیمتاً۔

(۳) نمونہ کے پرچہ کیلئے قسم اول کو ۱۲؎ اور قسم دوم کے لئے ۸؎ کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔

(۴) رسالہ وقت پر نہ پہنچنے کی بابت خریداروں کو اپنے یہاں کے ڈاکخانہ سے شکایت کرنی چاہئے کیونکہ اکثر رسالوں کی غلطی سے غیر محصولی چیزیں اکثر منزل مقصود پر نہیں پہنچتیں۔

(۵) خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور درج کیا جائے جو ہر خریدار کی پتہ کی چٹ پر درج ہوتا

عالمِ اسلام پر ایک نظر

نخلستان ہستی میں آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں کان جو کچھ سنتے ہیں دل جو کچھ برداشت کرتا ہے۔ وہ دو صورتوں پر منقسم ہیں۔ کبھی راحت اور اُمید کے پھولوں کی کیاریاں سینچی جاتی ہیں کبھی نو امیدی کے ہاتھوں اس کی بیخ کنی کی جاتی ہے۔ غرض یہ کہ انسان کی زندگی دو آبہ ہے جس میں کسی وقت اُتار ہوتا ہے کسی وقت چڑھاؤ۔ دل کے جس صفحہ کو الٹ کر دیکھئے اس کے بین السطور پر قدرت نے دو حاشیے کھینچ دیئے ہیں۔ اور دونوں رنگا رنگ پھولوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یاسمین کے پھولوں کی خوشبو سے اگر دماغ کو راحت ملتی ہے۔ تو خار دار حشیشوں سے چاک گریباں کے پرزے پرزے بھی ضرور ہوتے ہیں۔

قوت سامعہ فطرتاً ایک شے ہے۔ ایک جگہ سے ایک مطلب ایک ضرورت کے لئے قدرت نے اس کو سمع قبول تک پہنچایا ہے۔ مگر اس میں بھی دنیا کی دو رنگی کا نقشہ ہے۔ کہیں بلبل کے چہچے۔ دل خوش کن صدا

کے ارتقا کا مزا دیتے ہیں۔ کہیں غم نما اور اُجڑے ہوئے دردمندوں اور خزاں کے سنسان کا سناٹا ہے۔ یا تنک آوازیں سنا کر ڈراتا ہے۔ اسلام کی ابتدائی کہانیاں سنکر جتنا دل خوش ہوتا ہے اس سے زیادہ اس کے زمانہ حال اور استقبال پر رونا آتا ہے۔ اخباروں کی چیخ پکار۔ ہوا خواہان قوم کی دردمندی۔ پھر ان کی مستعدی پر بھی ناکامیابی یہ سب ایسی بیماریاں معلوم ہوتی ہیں جہاں مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہے۔ یا تو اس مرض کے طبیب ناکافی ہیں اور تشخیص مرض میں غلطی ہوتی ہے۔ یا مرض ہی لا دوا ہو چکا ہے۔ خواہ اطباء کی غلطی ہو خواہ مرض حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ عام اسلام پر ایک حسرتناک نظر ضرور پڑتی ہے

در بوم شورہ گاں گل ہستی نہ دیدنیست
آنہا کہ خود گم اند کرا رہبری کنند

اس خاکدان عناصرہ کی چار مختلف صورتوں سے مختلف الوضع ذی روح اجسام پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہر جسم پر حیوان اور حیوانیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ سب کا نشو و نما ان ہی عناصرہ غیر ذی روح مطلق سے ہوتا ہے۔ ترتیب میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔ مگر اس کے ایک خاص گروہ کو انسان کہتے ہیں۔ جو اشرف المخلوقات ہو کر اپنے دوسرے ہمجنسوں پر حکومت کرتا ہے۔ ان کو مجبور کر کے کام لیتا ہے۔ ان کی خبر گیری کا بار بھی اپنے ذمہ رکھتا ہے۔ انکی روزی کی قطع و برید کرتا ہے۔ ان کو سیاست تک سرسبز نہیں ہونے دیتا اور خود غرضی کو اس قدر کام میں لاتا ہے کہ ان کے کثیر التعداد منافع کو اپنی مصلحت کیشی میں صرف کر دیتا ہے۔ پھر اس شعار کو اتنا وسیع بنا لیتا ہے۔ کہ حکمت عملی کے مقابلہ میں اپنے اس جابرانہ برتاؤ کو حسن سمجھتا ہے۔

حقیقت میں اس کی جسمانی کامیابی اس کے ذاتی قوے ۔ اس کی جبلت

حقیقی کوئی بھی قابل پرستش نہیں نہ اس کا جبروت اس پایۂ اقتدار سے وسیع ہے جس پر اتنی حکومت زیبا ہو۔ البتہ اس کی ایک قوت سب قوتوں پر محیط ہے اور اس ہی قوت کا یہ سارا کرشمہ ہے جس پر یہ تھر کتا پھرتا ہے۔ اپنی چھوٹی سے چھوٹی قوت کو بڑا بناسکتا ہے۔ خیالی۔ تصوری۔ امکانی افعال میں رد وقدح کرتا ہے۔ کلیات وجزئیات پر مسلط ہوجاتا ہے۔ ہر تصور کو تصدیق اور تصدیق کو تصور کر دکھاتا ہے۔ جہاں خیال اور وہم وگمان رسا ہوتا ہے وہاں اس کا ضعیف البنیان جسم بھی کسی نہ کسی وقت پہنچ رہتا ہے۔ اس سرمایہ شرافت کو عقل سلیم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عقل ہی وہ سرمایہ ہے جو انسان کو کامیاب بناتی ہے۔ عقل ہی وہ قوت ہے جو سائر اجسام کی حکومت چاروں طرف سے گھسیٹ کر اس کی سپرد کر دیتی ہے۔ اور یہ بادشاہ عقل ہیژدہ ہزار عالم پر حکومت کرنیکا اہل ماناجاتا ہے عقل کی کنجی علم کے ہاتھ میں ہے۔ گویا کہ عقل ایک خزانہ مستترہ ہے جو علم کی روشنی میں کھولا جاتا ہے۔ عقل کی فطرت علم کے ہاتھ میں ہے جتنا چاہے وہ اس کو بڑھا لیجاتا ہے۔ جتنا چاہتا ہے اس کی دشواریوں کو حل کرتا ہے۔ ہر قوم ہرملت نے جتنا فروغ پایا ہے اس علم ہی کے فیضان نقشنیہ اور علم کے ہی بوقلمونی کا جادو ہے۔

گویا ہی علم کا پہلا آفتاب اسلام دنیا میں عرب کی ان سنگلاخ زمینوں سے چمکا تھا جہاں ریگستان اور خس وخاشاک کے سوا نہ تو گلزار علم کے پودے کہیں نظر آتے تھے نہ اس کی زمین ایسی ہونہار تھی۔ جہاں اس قدر افزایش کی امیدیں وابستہ ہوں۔ حقیقت میں یہ بھی علم الہی کا ایک کرشمہ تھا جس نے جہان کو سیراب کر دکھایا۔

علم

علم کی پہلی ہستی جہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس کو علم الافعال کہتے ہیں
بچہ پیدا ہونے کے بعد حرکات وسکنات کی معلومات سے عاری ہوتا ہے۔ سیکھتے
سیکھتے اس کا علم اب اجسام پر دسترس ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ علم کماہی مفرد یا
عالم کا ماہر ہوتا ہے۔ پھر اس میں سیاست۔ ملت۔ اقتدار حکومت کے علوم
کا ستون قایم ہوتا ہے۔

پھر عقل بسیط ان کو معلومات تصوری اور تصورات تصدیقی کا متقیاس
بناتی ہے۔ وہ فلسفی ہوتا ہے۔ فلسفہ اور اکیہ میں اس کا تصرف اجسامی ختم
ہونے کے بعد وہ فلسفہ روحانی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی
تکمیل پوری کرنے کے بعد نور کا مرقع صفاتی ہو جاتا ہے۔ تب انسانیت
کی تکمیل ہوتی ہے۔

گذر کن از بشریت فرشتہ باش ملا   فرشتگی چو نباشد بشر چہ سود کند

عرب کا مرکز انتہائی حبس میزان کو معرب بنائے ہوئے عالم کے
اندھیرے میں تالبستانی سنگ خارا پر گرا تھا وہ ازلی وابدی مسلم تھا۔
حاجت مشاطہ نیست روئے دلارام را۔ عقل اول کی تعلیم نے اس کی
عقل محیط میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ عالم نے اپنی عقل میں اس خزانہ راز سے
افزایش پیدا کی رفتہ رفتہ اس کی شعاعیں قیصر کسریٰ کے گنبدوں سے نمایاں
ہوتی ہوئی تاتار اور بلغار کے لہروں کی طرح چار دانگ عالم میں پھیلیں اور زمانہ نے
اس کو اسلام کے لقب سے یاد کیا۔ اس کے عنصر مسلمان قرار پائے۔
اور انھوں نے فلسفہ عالم فلسفہ الٰہی فلسفہ کماہی ہیں وہ ید طولےٰ کر دکھایا۔
کہ آج تواریخ کے صفحوں پر زریں قلم سے تحریریں دیکھ دیکھ کر بلا تکلف [illegible]

ناز کرتے ہیں۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان مسلمانوں میں چند افراد بھی ایسے ہیں جن کو اپنے علوم ذاتیہ اور افعال صفاتیہ پر پورا یقین حاصل ہو۔ جن کے سایہ میں آج اسلام پرورش پا رہا ہے اپنے گھر کی روشنی بجھا کر دوسرے کے گھر سے آگ لانے والے بھی جب لوٹتے ہیں تو چنگاری لیکر لوٹتے ہیں۔ پھر اپنی ذات پر یہ ناز ہوتا ہے کہ آتش پرستی ہمارا شیوہ ہے۔ علم کا سب سے پہلا نتیجہ اخلاق ہے اور وہ آتش پرستی کی حرارت سے سب سے پہلے خرمن اخلاق کو ہی پھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔ بجائے ملائکہ خصائل ہونیکے ان میں اجناء عشر اوّل کے خواص پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس سے نہ تو اخلاق عالم کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ نہ روحانیت کی صفات اقتداری میں کوئی حصہ ملتا ہے۔ کچھ تو سمندر کی شوردار موجیں اس چنگاری کی شورش کو سرد کر دیتی ہیں کچھ خود غرضی کے دجلہ نما سیلاب میں ان کی ضیاء نورانی ماند پڑ جاتی ہے۔

جوں جوں ہندوستان سے قریب ہوتے جاتے ہیں اور کوہ ہمالیہ کا فیضان ان کی روح کو تازہ کرتا جاتا ہے۔ اس کی لائٹ مدھم ہوتی جاتی ہے۔ وہاں گنگا و جمنا میں پہنچکر اس کے پر پرزے نکل آتے ہیں۔ اور فارس کی آتش مردہ کی طرح لائی ہوئی چنگاریاں میں صرف سیاہ کوئلوں کی رنگت رہ جاتی ہے۔ جو انکی عقل کو تاریک کرنے کو ہمیشہ کے لئے ماتھے کا ٹیکہ بن کر دل میں قائم رہتی ہے۔

یہی قوم کے لیڈر بنتے ہیں۔ انہی کے ہاتھ میں اسلام رکھا جاتا ہے [illegible] ہیں جن سے باغ اسلام میں بہار آنیکی امیدیں البتہ تھیں

پھر ان کے مضمون قوم کو جگانے میں جن مضامین کے ساتھ آویزاں ہوتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ مضمون نگار کسی پہلے زمانہ کا لکھنے والا ہے جس کے دل میں جوش اور درد بھرا ہوا ہے یہ ہندی ہے دہولا ہندی انکی چیخ پکار کا اثر بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا انکا اس نے تصدیق ہے۔ جو بات زبان سے نکلتی ہے وہ زبان پر ہی رہ جاتی ہے۔ جو دل سے نکلتی ہے وہ دل میں جگہ کر لیتی ہے۔

ہندوستانی مسلمان ترکوں کے اخلاق پر الزام لگاتے ہیں ترک مصریوں پر الزام لگاتے ہیں۔ مصری عربوں پر الزام لگاتے ہیں۔ عرب ایرانیوں پر الزام لگاتے ہیں۔ مگر کسی کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ ہم خود کیا کر رہے ہیں۔ اپنا منہ چاہے کالا ہو مگر سانولے رنگ والے پر قہقہہ لگانا ہمارا خاصہ ہو گیا ہے۔

شنید

روس اور چین ماورائے عرب میں نے ان کے جہانتک افسانے سنے ہیں۔ انکی ہستی و عدم ایک ہے۔ بحیثیت مجموعی دنیا کے مقہورین چوپایوں کی طرح وہ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں کچھ تو سلطنت کا دباؤ ان کے جوش کو روکے رہتا ہے کچھ جہالت کا سیلاب ان کو کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا۔

دید
قسطنطنیہ

قسطنطنیہ میں کالج بھی ہیں اسکول بھی معلم بھی متعلم بھی۔ تہذیب بھی ہے ویسے بھی۔ شریف بھی ہیں غیر معتبر بھی۔ میں نے شرفا کے بچوں کو یہاں پڑھتے دیکھا مگر کامیاب ہوتے ہوئے کم دیکھا ابتدا سے ان کے اخلاق میں

صفحے میں دیکھنے میں آتی ہیں جو اُن کو سُست اور بے بنیاد ہستی قایم کرا سکتی ہیں۔ان میں جو فارغ التحصیل بھی ہو جاتے ہیں وہ معیشت اور اخلاص سے دور ہو جاتے ہیں۔انانیت اور ریاست وحکومت کا خار ان کے دلوں میں اس قدر جاگزین ہو جاتا ہے۔کہ وہ ہونہار نسل قایم ہونیکی جگہ اپنے آپ کو ناکارہ بنا لیتے ہیں۔آپس میں اس قدر نزاع۔اتنے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔کہ کالج کے رہنے کی اخوت ومحبت بھی دل سے فراموش ہو جاتی ہے۔بخلاف اس کے دوسری قومیں ان ہی مدارس سے تعلیم پاتی ہیں۔اور اپنے اخلاق کو درست بناتے ہیں۔اور کامیابی کے بعد ان کا نظم بھی ان ہی غیر قوموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔سول کے جتنے محکمے ہیں سب عیسائیوں اور یہودیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔اور ان کے انتظامات کی باگ انہی عساکرہ کے ہاتھ میں ہے۔جن عدالتوں میں مسلمانوں کی کثرت ہے نہ وہاں کا نظم صحیح ہے نہ فتنہ وفساد سے وہ عدالت خالی رہتی ہے۔امارت پر ان کو اتنا گھمنڈ ہے کہ اپنی قوت سے ایک دوسرے کو ذرا سی خطا اور ذرا سے اختلاف پر نقصان پہنچا دیتا ہے۔

مصر

مصر میں بھی اسکول کالج اور نئی پرانی تعلیم کی درسگاہیں موجود ہیں۔ترقی کے زینہ عام ہیں اور چڑھنے والے اس کو طے کر رہے ہیں۔وہ چڑھتے بھی ہیں اور کامیابی کے بعد معیشت اور راحت کی زندگی بھی بسر کرتے ہیں۔مگر خمار حکومت اور نخوت ملکی سے اُن کا دماغ خالی نہیں ہے۔ان میں ایک اور بھی خرابی یہ ہے کہ وہ بے وقت معیشت اور غیر مراتب حاصل کئے عیش پرستی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ان افراد کو اگر چُن کر دیکھا جاوے تو ان کے

گھر بار کے بھی مختار ہی مالک ہیں۔ اور جب تک ان کے عناصر میں اور نیز سفید خون نہ ملایا جائے ان کا کاروبار نہیں چل سکتا۔

ہندوستان

ان حضرات کو نہ ریاست سے سروکار ہے۔ نہ معیشت کے گھر میں پلے ہیں پھر بھی آزاد ہیں ایک جودت پسند اور علم دوست سلطنت سے ان کا تعلق بھی ہے۔ مگر یہ لنگوٹے میں پھاگ کھیلتے ہیں جھونپڑوں میں رہتے ہیں اور محلوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ ان میں چند ٹوٹے پھوٹے ذی علم اگر ہو جاتے ہیں۔ تو ان کو سلطنت کی نخوت کا بدلہ ان کا خیراتی علم ہو جاتا ہے۔ اتفاق و اتحاد میں یہ اور وہ ایک دوسرے سے متنفر ہیں۔ قوم کو غافل سست اور پست ہمتی میں مانتے ہیں۔ الفاظ کے ذریعہ سے جگانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ خبر نہیں کہ ہم بھی قوم میں داخل ہیں۔ اور یونہی فرد فرد قوم کے ملکر قوم پیدا ہوتی ہے ہمکو بھی اپنا اخلاق درست کرنا چاہیے آپس کی لڑائیاں دن رات رہتی ہیں ہر شخص ہر شخص کی عیب جوئی کو تیار رہے۔ اور اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا رہتا ہے مفلسی اور ناداری کی یہ حالت ہے کہ ہر شخص کے گھر میں فاقہ مستی کا زور ہے۔ ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک کسی کو پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی گدائی کا کاسہ ہاتھ میں لئے پھرتے ہیں یا بھیک مانگتے ہیں یا خدمتگاری کرتے ہیں۔

ایک شخص اتفاق سے اگر کچھ ہاتھ پاؤں پیٹ کر کما لیتا ہے تو سو اس کی جان کے عذاب اس کا منہ تکتے ہیں۔ اور میرے خیال میں جس خاندان میں ایک پیٹ بھر کر کھالے اور دس بھوکے ہوں۔ اس فرد کو بھی فاقہ مست قوم کا آدمی سمجھنا چاہیئے مصر اور قسطنطنیہ میں ابھی اس قدر

حکمت نہیں ہے یہ اس کے اخلاق کی پختگی نہ شمار کی جائے بلکہ سلطنت کا فیضان ہے جس کی پامالی پر وہ آجکل تل رہے ہیں اور وہ دفا وابولیا اپنے نالائق بچوں کو سونڈ دودھ پلائے جاتی ہے۔

ایران

ایران کا عالم ان سب جہانوں سے علیحدہ ہے۔ علم وفضل کی جگہ تو وہاں صفر ہے۔ خانہ جنگیوں کی وہ گرم بازاری ہے۔ کہ ہر شخص نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا رکھی ہے۔ گندم نما جو فروشی اور ملت کی تلوار کا موونٹ انداز ان کی شمشیر بر بادی بنا ہوا ہے۔ غیروں سے تاب مقاومت تو اس کو ہو جس کے پاس کچھ جتھا بھی ہو۔ وہاں تو کچھ ٹولیاں ہیں جو ایک محلہ کے فساد کو بھی کافی نہیں ہو سکتیں۔ مکہ کی بت پرستی یاد آتی ہے۔ کہ کسی کا خدا نائلہ اور کسی کا عزا بنا ہوا تھا۔ یہاں مجتہد صفالی اور مجتہد انصاری کے مناقشہ کا فروسیند ارسے کچھ کم نہیں۔ ابو صالح کی مسجد میں رضائی کی نماز نہیں ہوتی۔ اور رضائی کی مسجد میں ابو صالح کی عبادت نہیں ہوتی۔ دنیا مختلف الاقوام سے بھری ہوئی ہے۔ عیسائیوں میں مسلمانوں سے زیادہ فرقے ہیں مرقس کے ماننے والے متی کو نہیں مانتے اور متی کے ماننے والے مرقس پر بھروسہ نہیں کرتے۔ وحدت کے مسئلہ افرادی کو تین افسراد پر تقسیم کرتے ہیں۔ باپ بیٹا۔ روح القدس۔ بعض دو افراد پر ہی اکتفا کرتے ہیں باپ اور بیٹا۔ خدایانے مختار میں افادہ کی تقسیم کو بعض بارہ پر کرتے ہیں بعض اٹھارہ پر۔ ان میں سے ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو خدایا سے بالکل انکار کرتا ہے پھر میں ایک سو فرقے پر انقسام کردئے گئے ہیں اور پھر ہر فریق کے ایک ایک فرقے کے دو دو حصے ہو گئے ہیں تشریعی اور تشبیہی مسائل میں بھی عیسائی

تفرقہ ہے جس کے بے تعداد مسلک ہو گئے ہیں۔ اگر وہ سب ملکر لڑنا چاہیں تو مسلمانوں سے زیادہ جنگ و جدل کر سکتے ہیں۔

ہندوستان میں اہل ہنود کے بہت سے فرقہ ہیں اور ان کی کثرت اتنی بے اندازہ ہے جس کی وہ خود تعداد نہیں معلوم کر سکتے۔ مگر ان میں یہ خانہ جنگیاں کہیں نہیں دیکھنے میں آتیں جو ہم مسلمانوں کی قوم میں جن کا اختلاف بھی بالکل ہی جزوی ہے دیکھتے ہیں۔ اختلاف میں جب ہم اور قوموں کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہمارے یہاں اختلاف کی روش اتنی بے اختیاری نہیں ہے جو اصل مذہب کو نقصان دے۔ مگر خانہ جنگیاں مقابلتاً اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ مجموعہ اسلام کے اجزا اجزا کر دینے کا کافی ذریعہ ہو گئی ہیں۔ اب آپ اپنے حقیقی خیال سے اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اسلام کی کس قدر جزوی قوم ہے جو واقعی کسی سلطنت کا تو کیا معمولی ریاست کا بھی ساری دنیا کے مسلمان ملکر مقابلہ نہیں کر سکتے۔

سُنّی۔ شیعہ۔ خارجی یہ تو تینوں پٹینٹ دشمن ہیں نہ اِن کے خدا سے اُن کو تعلق نہ اُن کے خدا سے اِن کو۔ سُنّی اور یہودیوں میں ملت ہونا مباح ہے۔ مگر سُنّی شیعہ میں الفت و اتفاق ہونا خلاف قانون فطرت ہے۔ پھر سنیوں میں مرزائی۔ مقلد و غیر مقلد۔ حنفی شافعی وغیرہ وغیرہ۔ پھر خوش عقیدہ مسلمانوں میں چشتی صابری۔ نظامی۔ سہروردی قادری وغیرہ وغیرہ سب کے خیالات الگ سب کے عقائد علیحدہ۔ سب میں باہمی نقیض اور ایسا نقیض جیسے دشمن کے ساتھ دشمن کو ہونا چاہیئے۔

ہارون الرشید کے زمانہ میں حسن ابن فاران نے منبد لبست اور مردم شماری کی تو روئے زمین کے مسلمانوں کی تعداد سات لاکھ تھی۔ اور وہ سات لاکھ زمانہ

پر بھاری تھے۔ ہر جگہ ان کا پرچم لہراتا تھا۔ ہر قلعہ پر لاالہ الا اللہ کا جھنڈا نصب تھا۔ عالم ان کے رعب سے تھراتا تھا۔ تحقیق ان میں تھی مسائل کا اختلاف آج سے زیادہ دیکھا جاتا تھا۔ مگر ان میں شر نہ تھا۔ وہ جو کچھ کرتے تھے اسلام کی بھلائی کے لئے کرتے تھے۔ ان کے پاس دل تو یہی تھا جس میں حرص و ہوا سب کچھ تھی۔ مگر وہ بے ایمان نہ تھے۔ اسلام کے نام پر مٹ جانے والے اور اپنے اقتدار کے لئے نیست و نابود ہو جانے والے تھے۔ وہ صاحب شرم و حیا تھے۔ ان کا سینہ بے کینہ تھا۔ وہ اخوت میں بھائی بھائی تھے۔

آج کم و بیش نوے کروڑ مسلمان ہیں۔ مگر سب اس قسم کے ہیں جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ کاش ان کی اتنی ہی مقدار ہوتی جتنی ہاروں کے زمانہ میں تھی اور یہ کثرت دنیا کے میدان کو گندہ کرنے کے لئے نہ رہتے تو اچھا تھا۔

باقی دارد

حکیم سید سلیم وارثی

سند یافتہ حمیدیہ کالج قسطنطنیہ

پریکٹیکل ٹرانسلیشن سیریز دو حصص۔ مولفہ مولانا محمد رضی صاحب بی۔ اے علیگ سب رجسٹرار سراتھو ضلع الہ آباد۔ یہ دونوں کتابیں بغیر استاد کے گھر بیٹھے انگریزی زبان کی معلم ہیں۔ مصنف نے بڑی عرق ریزی اور جامعیت سے لکھی ہیں۔ جن کے پڑھنے اور یاد کرنے کے بعد انگریزی کی معمولی ضروریات کو بخوبی رفع کر سکتے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۸/ حصہ دوم ۸/ مصنف سے مندرجہ بالا پتہ پر درخواست کرنے سے مل سکتی ہیں۔

شاخ نبات

این ہمہ قند و شکر کز سخنم مے ریزد
اجر صبر یست کزاں شاخ نباتم دادند

اللہ اللہ عشق وہ چیز ہے جس کی شان و شوکت اور جذب واثر حیوان کو انسان اور انسان کو فرشتہ اور فرشتہ کو انسان بنا دیتا ہے۔ اگر آپ کو یاد نہو تو ہاروت اور ماروت کے قصہ کو قرآن میں پڑھیئے۔ یہ زہرہ جان کے سوائے عشق کا ہی کرشمہ ہے۔ جو یہ دونوں فرشتہ ملکوتی صورت کو چھوڑکر انسانی ہیئت میں آکر چاہ بابل میں ڈوب مرے۔ حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کی زلف تابدار نے کیا کیا کنوئیں جھکائے۔ بی زلیخا کو حضرت یوسفؑ کے ہی جوش محبت نے برسوں دیوانہ بنا کر دربدر خاک بسر پھرایا۔ محل شاہی سے لیکر مصر کی ادنی عورت کی زبان پر بی زلیخا کی بیباکی کا قصہ چڑھ گیا تھا۔ اور طعن سے کہتی تھیں قد شغفہا حبا یعنی زلیخا کا دل یوسف کی محبت میں پاگل ہوگیا۔ الغرض عشق وہ بلائے بد ہے۔ جس نے کسی نبی کسی امام کسی ولی کو بے ستائے نہ چھوڑا۔ یہ شعر جو ہم نے اپنے اس مضمون کے ہیڈنگ پر تحریر کیا ہے حافظ شیرازی رحمت اللہ علیہ کے افسانہ کا ڈھلا ہے جس کو انہوں نے حرفوں کے کیمرہ میں تیار کر کے اور اپنے دیوان کے آئینہ میں سجا کر عالم کے سامنے پیش کیا ہے۔ مگر افسوس زمانہ دور نکل گیا اور زمانہ نے ایسا پلٹا کھایا کہ آجکل سچی باتیں جھوٹی گنی جانے لگیں نئی روشنی نے پکار کر کہدیا کہ جو ہماری سائنس کے خلاف خواہ قرآن ہو یا حدیث تاریخ ہو یا تذکرہ ہم اس کو تسلیم کرنے والے نہیں ہیں ۔

گرچہ بدنامیست نزد عاقلاں ما نمیخواہیم ننگ و نام را

چنانچہ حافظ صاحب اور شاخ نبات کے باہمی تعشق کے افسانے کو بھی اس دور کے تذکرہ نویسوں نے لغو سمجھکر نظر انداز کر دیا۔ اگر کسی نے خواجہ حافظ کی روح پر عنایت کی تو صرف یہ لکھدیا کہ "خواجہ حافظ صاحب ایک بازاری عورت پر فریفتہ ہو گئے تھے" جس کا اثر برائی کے ساتھ اردو خواں پبلک پر پڑا۔ اور وہ خواجہ صاحب کو بداعتقادی کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ شاخ نبات اور خواجہ صاحب کے واقعات عبرت انگیز پر روشنی ڈالیں۔ اور ایک مختصر پیرایہ میں اس کو تحریر کر کے لوگوں کے دلوں سے اس بدگمانی کو دھو ڈالیں۔ و ہو ہذا

خواجہ حافظ صاحب کی اصل سرکان سے ہے جو نہاوند کے قریب ایک مشہور قصبہ ہے۔ ان کے جدامجد سرکان سے آکر شیراز میں بسے اور ان کا لایق پوتا خمخانہ وحدت کا پیرمغان شمس الدین محمد جنوری سنہ ۱۳۰۰ مسیحی میں عالم لاہوت سے پردہ ناسوت میں آکر جلوہ فرما ہوا بعض بزرگ کہتے ہیں کہ ان کے باپ دادا قاضی تھے۔ اور اسی اعتبار سے انھوں نے بھی عربی علوم و فنون اور قرآن مجید کے حفظ کرنے میں جان لڑانی شروع کی اور ابھی شباب کا آغاز تھا جو تحصیل علمی کے مدارج کو اختتام پر پہنچا دیا۔ ہونہار بیٹے کی فضیلت کی خوشی میں ان کے باپ نے بڑی مسرت ظاہر کی۔ اور ان سے کہا کہ تم تھوڑے دن آرام اور راحت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرو تاکہ برسوں کی محنت سے جو تمہارے دل و دماغ کو تکان پہنچا ہے وہ رفع ہو جائے۔ اور تم کسی علمی کام کے لئے پھر کمر باندھ سکو۔ باپ کے اس کہنے سے خواجہ صاحب کے دل کا کنول کھل گیا اور آپ صبح و شام قسم قسم کے سیر تماشہ

کے لئے کوچہ و بازار اور گلی وگلزار میں چلنے پھرنے لگے۔ ایک دن حضرت کا گذر ایک ایسے بازار میں ہوا جہاں شاہدان عشوہ فروش اور معشوقانِ خدا فراموش اپنے اپنے حسن و ناز کی دوکانیں سجائے بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر ان سب میں شاخ نبات کے رنگ کی صباحت اور جمال کی شیرینی اپنے اندر عجب دلکش اور روح افزا چاشنی رکھتی تھی۔ کوٹھے کے نیچے چلنے والے مور و مگس سے زیادہ فراہم ہو رہے تھے۔ خواجہ صاحب کا دل بھی اس کے رخسار پر اس طرح چپک کر رہگیا جس طرح ایک مکھی شہد میں پھنس کر اپنی جان دیدیتی ہے آپ نے ضبط کیا اور گھر چلے آئے مگر ؎

عشق ازیں بسیار کردست و کند سبحہ را زنار کردست و کند

خواجہ صاحب کو سوائے شاخ نبات کی صورت کے قرآن کی ایک سورت بھی یاد نہ رہی۔ اور آپ کا دل کلام اللہ کے پاروں کی طرح پارہ پارہ ہوگیا اُٹھتے بیٹھتے شاخ نبات شاخ نبات وردِ زباں ہوتا اور یار کے کوچہ میں دن میں دو چار بار ضرور ہو آتے تھے۔ شاخ نبات کو بھی معلوم ہوگیا۔ کہ مجھے دیکھکر حافظ صاحب کی رال ٹپک پڑتی ہے۔ اور جب اُدہر سے نکلتے تو منہ پھیر کر ہو بیٹھتی۔ اور معشوقانہ نفرت جتاتی۔ خواجہ حافظ صاحب نے ایک دن اپنی خاندانی عزت و حرمت کو بالائے طاق رکھکر رندوں کا شیوہ لیا۔ اور بیدھڑک شاخ نبات کے پاس جا کر اپنے عشق کا اظہار کر دیا۔

شاخ نبات:۔ "میاں ستو بازار کی مٹھائی ہیں جو پیسہ ڈالیگا وہ فرو پائیگا"

حافظ صاحب:۔ "پھر آپکی قیمت کیا ہے"

شاخ نبات:۔ "دیکھئے میرے دروازے کے سامنے جو بڑھی ساری

چار فرلانگ کے ہیر پھیر میں ڈگی ہے اس کو اشرفیوں سے پاٹ دیجئے بس پھر میں آپ کی لونڈی ہوں۔ اور جو آپ سے میری یہ فرمایش نہ بن پڑے تو میرا نام بھی کبھی نہ لیجیگا۔ ہماری قوم پیسہ کی طالب ہے ہمارے نزدیک پاک و ناپاک ہندو مسلمان یہود و نصاریٰ جو ہم کو حسب خواہش نیں دے وہ ہی ہمارا پیارا ہے۔ ہم تو اس شعر پر عمل کرتے ہیں ؎

خوک باش و خرس و باش یا سگ مردار باش
ہر چہ باشی باش لیکن اندکے زردار باش

حافظ صاحب :- بہت اچھا آپ تو ڈگی کو سونے سے بھروانا چاہتی ہیں۔ اگر آپ فرماتیں تو میں آپ کی ڈگی کو موتیوں سے بھر دیتا۔"

یہ کہکر خواجہ صاحب اُٹھے اور حضرت ابراہیم ادہم کی طرح جو سمندر خشک کرکے مرغ آبی کے انڈے کی برابر گوہر آبدار نکا لنے چلے تھے اشرفیوں کی فکر میں پڑ گئے۔ وحشت دل۔ سودائے زلف نے یہی مشورہ دیا کہ شیراز کے بازاروں میں بھیک مانگو۔ اور شام تک جو کچھ پیسہ کوڑی ملے۔ اس کو ڈگی میں لاکر ڈالدو۔ جب ڈگی پیسہ کوڑی سے بھر جاوے تو پھر پیسہ کوڑیوں کے روپیہ بنالیں گے۔ اور روپیہ سے اشرفیاں۔ بس اسی طرح اس کمی کو پورا کرتے کرتے ڈگی کو سونے سے بھر دینگے چنانچہ آپ نے ایساہی کیا۔ اور عرصہ تک دریوزہ گری کرتے رہے۔ اس حرکت سے آپ کے معزز خاندان کی بڑی بدنامی ہوئی اور شیراز بھر میں دہوم مچگئی کہ ایک اعلیٰ خاندان کا ہونہار نوجوان ایک رنڈی کے ناپاک رنگ در وغن پر دیوانہ ہوگیا۔ اور مستانہ بازاروں میں کوڑی دو کان مانگتا پھرتا ہے۔ کوئی کہتا

ہائے ایسا عقیل و فرزانہ اے تری شان یوں ہو دیوانہ

اور اگر کوئی آپ کو سمجھاتا تو آپ جواب دیتے ؂
ملامت شحنۂ بازار عشق است ملامت صیقل زنگار عشق است
اگر کوئی عزیز کہتا میاں کیوں سڑی ہوئے ہو۔ اور گلی کوچوں میں کس لئے
خاک اڑاتے پھرتے ہو۔ تو آپ مسکراتے اور فرماتے ؂
نہ من بیہودہ در ہر کوچہ و بازار میگردم مذاق عاشقی دارم پئے دیدار میگردم
جب شام کے وقت کوڑی پیسہ لا کر ڈالتے۔ تو بی شاخ نبات اپنے امیر
آشناؤں سے جو اس کے پہلو میں بیٹھے ہوتے تنک کر کہتیں۔ دیکھو یہ حافظ معزز
گھرانے کا نوجوان ہماری ایک ادا میں پاگل ہو گیا ہے۔ اور تنکے چنتا پھرتا
ہے۔ لوگ کہتے آپ درست فرماتی ہیں ؂
ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز
اس کو بھی ایک زمانہ گذر گیا۔ اور خواجہ حافظ صاحب کو معشوق کے درد
فراق نے قیس عامری کی طرح لاغر و ناتوان کر دیا۔ آپ کی صورت بھی نہ پہچانی جاتی۔
اور جو کوئی پہچان بھی لیتا تو پہچان کر رو دیتا۔ اور روتا ہوا چلا جاتا۔ ایک
شب آپ دگی پر اپنی گدڑی اوڑھے پڑے تھے اور سامنے شاخ نبات کے
کوٹھے پر سے شاخ نبات کی سریلی تانیں اور تانوں کے ساتھ سارنگی کی دلکش
دلکش صدائیں اور ان صداؤں کے ساتھ طبلہ کی پھرن بجلی کی طرح چمک رہے
تھے۔ اور خواجہ صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ لگا تار برس رہا تھا۔
قریب تھا کہ آپ کا سینہ شق ہو جائے یا کلیجہ پھٹ کر منہ کو آجائے جو یکایک
اس اندھیری رات میں اپنے سرہانے ایک شخص کو کھڑا دیکھا۔ اس کو دیکھ کر
آپ گھبرا گئے اور گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ غور سے معلوم ہوا کہ سرہانے
کھڑے ہونے والے ایک بزرگ ہیں جن کا لباس جن کی صورت جن کی

وضع قطع صاحب لوں جیسی ہے۔ آپ نے بے اختیار ہو کر بزرگ کو سلام کیا اور قدم بوسی کے واسطے جھکے۔

بزرگ :- حافظ تو دیوانہ ہو گیا ہے تیری عقل کوّے لے گئے ہیں جو تونے یہ سودا پکایا ہے کہ اس ڈگی کو سونے سے بھر دوں گا۔ تو کیا۔ اگر ایران کے سو بادشاہ سو سال تک اس ڈگی کے اندر سونے کا برادہ ڈالیں گے تو یہ نہ بھرے گی کیونکہ اس کا پردہ پھٹا ہوا ہے۔ اس کی گہرائی کی کوئی تھاہ نہیں ہے۔"

حافظ صاحب :- حضور کا ارشاد بجا ہے مگر یار کے کہنے کو نیچا ڈالنا عاشقوں کا کام نہیں ہے۔"

بزرگ :- اچھا اگر بے اس شرط کے شاخ نبات تمہاری ہو جائے تو کیا ہو؟"

حافظ صاحب :- ہو کیا۔ وہ میری لونڈی ہو جائے اور میں آپکا غلام ہو جاؤں گا

بزرگ :- اچھا تم باباکوہی کے ٹیلہ پر جو شہر سے چار میل پر واقع ہے جا کر اکتالیس روز بلا ناغہ رات کو گھی کے چراغ جلاؤ۔"

حافظ صاحب :- بہت اچھا۔"

دوسرے دن حافظ صاحب نے چراغ بتی کا اہتمام کیا۔ اور شام ہوتے ہی مقام مقصود پر جا پہنچے چراغ روشن کر دیا۔ اور ٹیلہ کے نیچے آبیٹھے اس محنت اور جانفشانی میں خواجہ صاحب نے جان لڑا دی۔ اور دن رات باباکوہی میں بسر کرنے لگے۔ حتیٰ کہ چالیس راتیں گذر گئیں۔ اکتالیسویں روز آفتاب ابھی دریچہ مشرق سے نہ نکلا تھا۔ باد نسیم چل رہی تھی۔ کہ شاخ نبات گھبرائی ہوئی باباکوہی پر آ پہنچیں۔ اور اپنا سر حافظ صاحب کے قدموں پر رکھکر

کہنے لگیں "خدا کے لئے میرا قصور معاف کر دیں میں نے آپ کو ناحق ستایا اور فضول تکلیف دی۔ میں آپ کی لونڈی ہوں۔ غریب خانہ پر تشریف لیچلئے ۔"

حافظ صاحب ؎

وہ آئیں گھر پہ ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس سے زیادہ اور کیا خوشی ہو سکتی تھی۔ خدا جانے آپ شادی مرگ کیوں نہ ہو گئے۔ معشوق، اور چلبلا معشوق اپنا گورا گورا ماتھا عاشق کے قدموں پر رکھدے یہ سوائے اولیا اللہ کی کرامت کے اور کون کر سکتا ہے۔ سچ کہا ہے ؎

مردانِ خدا خدا نہ باشند لیکن ز خدا جدا نہ باشند

شاخ نبات "میرے آقا۔ میرے سرتاج اب آپ یہاں سے جلد تشریف لے چلئے مجھے تاب نہیں ۔"

یہ کہکر اس نے اپنے مہندی سلے ہاتھوں سے خواجہ صاحب کے دونوں بازو پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اور اپنی سواری پر بٹھا کر گھر لے پہنچی۔ حجام کو بلایا۔ آپ کی اصلاح بنوائی حمام کروایا۔ نئے کپڑے پہنائے۔ عطر لگایا اور دولہ بنا کر اپنے خلوت خانہ میں لیگئی رات تو نہ تھی مگر شاخ نبات کے شوق نے دن کو رات بنا دیا۔ کمرے کے پردے چھوٹ گئے دروازہ بند ہو گئے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا بی شاخ نبات بھی بن سنور کر پرکالہ آتش بنکر آراستہ چھپر کھٹ پر آگئیں۔ اور اسوقت یہ سماں ہو گیا ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

دونوں طرف شوق و اشتیاق مگر شرم و حیا نے ابھی کسی طرف جنبش کی اجازت نہ دی تھی۔ جو یکایک خواجہ صاحب نے دیکھا کہ سامنے کی دیوار شق

ہو گئی۔ اور وہی بزرگ جو ڈگی کے کنارے پر رات کے وقت ملے تھے۔ اور چراغ جلانے کا چٹکلا بتا گئے تھے کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"حافظ ہمارا یہ کہنا بھول گیا۔ اکتالیس رات کی بجائے چالیس راتیں ہی یاد رہیں اور رنڈی کے ساتھ بے عمل کو ختم کئے چلا آیا۔ یاد رکھنا اگر تو نے شاخ نبات کو ہات لگایا تو محبت نفرت سے فوراً بدل جاوے گی اور تمام عمر تیرا منہ نہ دیکھے گی۔ تیری بہتری اسی میں ہے کہ آج کی رات جو اکتالیسویں رات ہوگی گھی کا چراغ جلا کر عمل پورا کرے اور پھر ہمیشہ ہمیشہ چین منائے"

بزرگ کا فرمانا گویا تازیانہ تھا۔ جو حافظ صاحبؒ کے دل پر پڑا۔ گھبرا کر چھپر کھٹ سے نیچے آئے اور ایسے بیتاب ہوئے کہ زینہ سے اترنا دوبھر ہو گیا۔ اور کوٹھے سے جست کر کے بازار کی طرف سڑک پر کود پڑے۔ آپ کی جگہ کوئی اور بدنصیب ہوتا تو ہڈی پسلی ٹوٹ کر کچومر نکل جاتا۔ مگر دو منزلہ پر سے گر کر آپ کے بدن میں ایک خراش بھی نہ آئی۔ تو آپ اٹھ کر باباکوہی کو چلدئے مغرب کا وقت ہوتے ہی اکتالیسواں چراغ جلا دیا اور ٹیلے کے نیچے لیٹے ہوئے سے آ بیٹھے۔ آدھی رات گذری۔ تو آپ نے پڑے پڑے دیکھا کہ آسمان کا دروازہ کھلا اور اس میں سے جواہر نگار تخت اور تختوں پر چند حضرات مقدس صورت بیٹھے ہوئے پردۂ زمین پر تشریف لائے۔ اور غیبی کارفرما لوگوں نے اس ٹیلہ کو فرش فروش تخت کرسی اور جملہ آرائش سے غیرت بہشت بریں بنا دیا۔ اور بیچ میں ایک تخت جو شہنشاہ کے واسطے زیبا ہوتا ہے۔ خالی بچھا دیا۔ اس میں ایک سواری آسمان سے زمین پر نازل ہوئی اور اس میں سے حضور پر نور خواجہ عالم و عالمیاں سلطان انبیا **احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ** صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم برآمد ہو کر آفتاب جہاں آرا کی طرح

اس تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور آپ نے فرمایا "وہ صاحب مزار کہاں ہیں؟" یہ فرماتے ہی وہ بزرگ جن کے مزار پر خواجہ حافظ صاحب نے چراغ جلایا تھا ایک گوشہ سے نکلکر حضور والا کے قدمبوس ہوئے۔ حضور والا نے فرمایا "وہ تمہارا مہمان کہاں ہے جس نے تمہارے مزار پر چلہ کیا ہے؟"

بزرگ "حضور وہ ٹیلے کے نیچے حاضر ہے"

حضور "اس کو بلا کر ہماری خدمت میں پیش کرو"

بزرگ "بہت خوب" کہکر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹے اور ٹیلہ کے نیچے اُترکر خواجہ صاحب کا ہاتھ پکڑکر دربار میں لے گئے۔ حضور نے نوازش فرمائی اور اپنے تخت کے سامنے بلاکر اپنے جمال جہاں آرا سے مشرف فرمایا۔ اور ارشاد کیا "حافظ مبارکباد"۔ حافظ صاحب اپنی اس دیوانگی اور وحشت مزاج سے حضرت کی مبارکباد کو اسی کام کی مبارکباد سمجھے جس میں وہ ڈوبے ہوئے تھے۔ مگر ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ مبارکباد معرفت الہٰی کی مبارکباد ہے۔ یہ زندہ جاوید ہونیکی مبارک باد ہے۔ خیر اسی خیر و برکت میں رات تمام ہوئی۔ اور آپ کا عمل بھی اکتالیس راتوں کے ساتھ اختتام کو پہنچا ؎

چہ خوش باشد کہ بعد از انتظارے　　بہ امیدے رسد امیدوارے

خواجہ صاحب نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ بی شاخ نبات آپ کے پہلو میں بیٹھی ہوئی صبح صادق کی طرح مسکرا رہی ہیں۔ اب خواجہ صاحب کو کہاں تاب تھی بے اختیار ہوکر شاخ نبات کے گلے میں بانہیں ڈالدیں اُدھر شاخ نبات نے بھی اپنے ہاتھ آپ کے گلے میں ڈالدیے۔ مگر خدا جانے اس ہم آغوشی میں کیا اثر تھا کہ آن واحد میں شاخ نبات اور خواجہ حافظ صاحب کے حواس ٹھکانے نہ رہے۔ بالکل دیوانہ اور سڑی ہوگئے اپنا نام تک دونوں

گویا دنہ رہا ۔اور وصل وصال کا تصور تک جانبین کے دل سے مٹ گیا ۔ مگر ایک شراب پینے کا ذوق و شوق حد سے بڑھ گیا ۔ اسی عالم میں دونوں گلے میں باہیں ڈالے شہر کو آئے اور مےفروش کی دوکان پر جا بیٹھے اور بادہ کشی شروع کردی ۔ اسی طرح اس دوکان سے دوسری دوکان ۔ اور دوسری سے تیسرے شرابخانہ اور تیسرے شرابخانہ سے چوتھے میخانہ میں پہنچے ۔ اور پے در پے جام اڑانے لگے ۔ یہ میخواری کچھ اس روز پر موقوف نہ تھی ۔ بلکہ اسی دھن میں دونوں کو مہینوں اور برسوں گذر گئے ۔ شیراز میں شراب کی کوئی بھٹی اور شرابخانہ باقی نہ رہا جہاں شاخ نبات اور خواجہ صاحب نے جاکر بادہ گساری نہ کی ہو ۔ یہ ذلت اور رسوائی پہلی ذلت و رسوائی سے بدرجہا بڑھ گئی ۔ اور ان دونوں کو دیکھکر شیراز کا ہر چھوٹا بڑا لعنت ملامت کرتا اور لاحول پڑھتا تھا ۔ اسی حال میں آپ ایک دن کسی مرغزار میں بیٹھے بی شاخ نبات کے ساتھ صبوحی اڑا رہے تھے ۔ جو سامنے سے ایک بزرگ تشریف لائے ۔ جن کی نظر میں خدا معلوم کیا اثر تھا جس کے دیکھنے کی خواجہ کو تاب نہ ہوئی ۔ اور آپ بیقرار ہوکر کھڑے ہو گئے ۔ اور جب اُن سالک بزرگ کو دیکھا کہ وہ ان ہی کی طرف بڑھے چلے آتے ہیں ۔ تو انھوں نے بھی ان کا استقبال کیا ۔ قریب پہنچکر انھوں نے چاہا کہ وہ ان کے قدم چومیں ۔ مگر بزرگ نے خواجہ صاحب کو اپنے آغوش میں لے لیا ۔ اور جب یہ معانقہ سے فارغ ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان بزرگ کا وصال ہو گیا تھا ۔ ان کی رحلت کے بعد ہی خواجہ صاحب کا اس آن واحد میں جذب سلب ہو گیا ۔ اور سلوک کے ٹھنڈے دائرہ میں آ گئے ۔ ہوش و حواس عقل و خرد سب درست ہو گئے ادھر بی شاخ نبات کے بھی اوسان ٹھکانے ہو گئے اور اپنے پچھلے دوڑ

کو سنبھالنے لگیں۔ خواجہ صاحب نے مرحوم بزرگ کو اوّل منزل پہونچایا اور مسجد کے حجرہ میں بیٹھکر یادالٰہی میں مشغول ہونا چاہا۔ بی بی شاخ نبات نے آپ کا دامن پکڑ لیا۔ اور عرض کیا۔

جان زتن بردی و درجانی ہنوز دردہا دادی و درمانی ہنوز

اب میں آپ کے قدموں کو چھوڑکر کہاں جاسکتی ہوں۔ مجھے آپ نے نفسانی خواہشوں سے پاک کر دیا میرے دل میں کوئی آرزو عیش و نشاط کی باقی نہیں رہی ہے پس اب میری یہی آرزو ہے کہ جب تک جیؤ آپ کی خدمت بجالاؤں۔ آپ نے فرمایا " اچھا تمہاری خوشی " چنانچہ جبتک بی بی شاخ نبات زندہ رہیں خواجہ صاحب کی خدمت پرستاروں کی طرح بجالائیں۔

جسدن خواجہ حافظ صاحب کی طبیعت سکون کیطرف آئی آپکو شعر گوئی کا شوق پیدا ہوگیا۔ اور وہ روحانی خیالات معرفت الٰہی کے زنگار رنگ جلوہ جو آپ کے دماغ میں چکر کھاتے تھے غزل کی صورت میں الفاظ اور استعارہ اور تشبیہ کے ساتھ ادا کرکے اپنے دل کی سوزش کو بجھالیا کرتے تھے چنانچہ آپکے کلام میں اب تک یہ اثر باقی ہے کہ آپ کے دیوان کے زیادہ مزاولت کرنے والے ضرور سلوک سے جذب کیطرف مائل ہوجاتے ہیں۔ اور بھولی بھولی باتیں کرنے لگتے ہیں ؎

آنکھوں کو لا تیری قدرت کا تماشا دیکھے دیدہ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

وہ غزل جو آپ نے بی بی شاخ نبات کے ملنے کے موقع کی یادگار میں رقم فرمائی ہے جس کا شعر ہمنے اس مضمون کے ہیڈنگ پر رقم کیا ہے جس میں بی بی شاخ نبات کا نام لو اُس چلہ کا تذکرہ کیا ہے جو آپ نے باباکوہی کے

ٹیلہ پر ۱۴ دن تک کیا تھا یہ ہے

غزل

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند | وندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

بیخود از شعشعۂ پرتوِ ذاتم کردند | بادہ از جامِ تجلّیٔ صفاتم دادند

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے | آن شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند

چون من از عشقِ رخش بیخود و حیراں گشتم | خبر از واقعہ لات و مناتم دادند

من اگر کام روا گشتم و خوشدل چہ عجب | مستحق بودم و اینہا بزکاتم دادند

بعد ازیں روئے من و آئینۂ حسنِ نگار | کہ در آنجا خبر از جلوۂ ذاتم دادند

ہاتف آن روز بمن مژدہ ایں دولت داد | کہ بیازار غمت صبر و ثباتم دادند

ایں ہمہ قند و شکر کز سخنم میریزد | اجرِ صبریست کزاں شاخ نباتم دادند

کیمیائیست عجب بندگیٔ پیرِ مغاں | خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

بحیاتِ ابد آں روز رسانید مرا | خطِ آزادگی از حسنِ ثباتم دادند

عاشق آں دم کہ بدامِ سرِ زلفِ تو فتاد | گفت کز بندِ غم و غصہ نجاتم دادند

شکرِ شکر بشکرانہ بیفشاں اے دل | کہ نگارِ خوشِ شیریں حرکاتم دادند

ہمت حافظ و انفاسِ سحرخیزاں بود
کہ ببندِ غمِ ایام نجاتم دادند

محمد قاسم علیخان قمر
تلمیذ حضرت فراق۔ دہلوی

پیاز کا پتہ

ہر دو عالم قیمت خود گفتئی
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

گلابی باغ میں سنبھل کا ایک لمبا سا پیڑ تھا۔ جو کسی پر جمال نازنین کے قد کی طرح سیدھا چلا گیا تھا۔ اور اوپر جا کر ٹہنیوں اور پتوں کی ایک گھنی سی ٹنگی ہی تھی۔ لوگ جب باغ کی سیر کو آتے تھے تو اس پیڑ کی اونچائی اور دلربائی کو پگڑی تھام کر دیکھا کرتے تھے جس طرح یہ درخت انسانوں کو پسند تھا۔ اسی طرح گلشن کے پرند اور چڑیاں بھی اس پر جی جان سے فدا تھیں اور ایک بئے نے اپنے رہنے کے لئے خوش نما گھونسلا بنا یا تھا جس کے باریک ریشہ اور تنکوں کے گٹھ گنڈ باؤ کو دیکھکر یہ گمان ہوتا تھا کہ لیلی کی زلف پیچاں کے بال ہیں جو باد صبا کی بیباکی سے الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اوس کی مخروطی شکل کو دیکھکر یہ سمجھا جاتا تھا کہ ملاء اعلی کی دعوت کے لئے بادہ ناب کا ایک لبریز شیشہ پیڑ پر رکھا ہے۔ تاکہ آسمانی مہمان اتر کر شغل کریں یا کسی صوفی کا دل ہے جو سینہ میں ہر وقت خدا کی یاد کے ساتھ لرزتا رہتا ہے۔ اسی باسلیقہ جانور نے اپنے آشیانہ میں کیچڑ کی مٹی اور جگنو (بیٹ بیجنہ) کے نگینے جڑ رکھے تھے۔ جو رات کو لیمپ کا کام دیتے تھے۔

چتر دار درخت کو دیکھکر ایک جگادری بندر بھی اس پیڑ پر بسیرا لینے لگا۔ بیا ملنسار اور ہنس مکھ تھا۔ اس لئے اس نے بندر کا اپنے پڑوس میں رہنا غنیمت سمجھا کہ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ وہ بندر کی ہر دم

چاپلوسی کرتا اور محبت جتاتا۔ بندر جیسے بدخو جانور کو مروّت اور ملاپ سے کیا سروکار تھا۔ مگر بیے کی شرا حضوری اُسے بھی الفت ظاہر کرنی پڑتی۔ اور اس کی دلجوئی کا شکریہ ادا کرتا۔ اسی رہنے سہنے میں موسم نے پلٹا کھایا۔ برکھا رت آن پہنچی پُروا ہوا نے بادہ نوشوں کے کان میں جھک کر کہا ؎

برق چشمک زن ز طرف کہساراں میرسد ساقیا سامان ساغر کن کہ باراں میرسد

ادہر موروں نے چلا چلا کر کہنا شروع کیا ؎

تند و سرشار و مست زکہسار آمد میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

بیا اپنے گھونسلے کے اونچے جھولے میں پڑا جھولا کرتا۔ سورج کے طلوع غروب کی بہار شفق کی رنگنیاں بادلوں کی اٹھکیلیاں دیکھا کرتا۔ جب مینہ آتا تو اپنے گھونسلے میں ہو بیٹھتا۔ شام کو ان کے ہمدم میاں بندر بھی لوٹ کھسوٹ کر کھاپی کر مارے دہاڑے آتے رات کو پیڑ پر بسیرا لیتے اور صبح ہی پھر چل دیتے۔ برسنے کو تو جولائی اور اگست میں بھی زور کے مینہ برسے مگر ستمبر آتے ہی جھڑ لگ گیا۔ دن رات پڑا برستا تھا اور چھاجوں برستا تھا۔ بندر دن تو چل پھر کر جوں توں کر کاٹ دیتا تھا۔ مگر جس وقت رات کو آکر بیے کے پاس پیڑ پر بسیرا لیتا اور اوپر سے موسلا دہار مینہ برستا تو مصیبت کا سامنا ہوتا تھا ؎

کاو کاو سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کبھی اس ٹہنی پر کبھی اس ڈالی پر کود کر جاتا پتوں میں منہ چھپاتا۔ مگر پانی سے کہیں پناہ نہ ملتی۔ پُروا ہوا تاڑ کے برابر لنبے پیڑ پر رہنا مارے سردی کے دانت سے دانت بجتا۔ رات کی اندھیری بجلی کی چمک بادل کی کڑک سے بے اختیار بولا اٹھتا اور کہتا صبح ہو تو چھپر چھاؤں، صبح ہو تو چھپر چھاؤں، مگر جب دن

ہوتا ابھی پھٹ جاتا مینہ تھم جاتا گرمی سے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ پاؤں کھل جاتے تو رات کی ساری مصیبت بھول جاتا۔ اور ہنس کر کہتا۔ اب تو لگی دُھپڑی بلا چھپائے جھنپڑی" یعنی اب تو دھوپ نے رات کی ساری تکان اور سردی دور کردی ہے۔ میری بلا گھر بناتی ہے۔ اور چھپر چھاتی ہے۔ جب رات آتی تو پھر بندر کی جان پر بارش اور ہوا کا قہر ٹوٹتا اور پھر وہی کہتا صبح ہو تو چھپر چھاؤں، صبح ہو تو چھپر چھاؤں۔ ایک رات سب راتوں سے کڑی آئی۔ مینہ کے ساتھ اولے بھی تھے جنھوں نے بندر کی چندیا گنجی کردی۔ سارا بدن گھائل کر دیا۔ وہ گھبرا کر چیخ اٹھا۔ بیا جو اس کا سچا ہمدرد تھا اس کی آہ وزاری سنکر ساری رات نہ سویا۔ اور یار کی مصیبت پر بے چین رہا۔ خدا خدا کرکے دن نکلا۔ مینہ تھما بیا اپنے گھونسلے سے باہر آکر ایک ٹہنی پر بیٹھ گیا۔ اور دلسوزی اور ہمدردی کے لئے اپنے دوست بندر کو اس طرح سمجھانے لگا ؎

ہاتھ مانس کے پاؤں مانس کے مانس کی سی دیہہ رے

چھپر کیوں نہ چھاؤ بندرا او پر برسے مینہ رے

یعنی اے میرے مخلص دوست بندر خدا نے تجھے انسان جیسی بہترین مخلوق سے ملتا جلتا پیدا کیا ہے۔ تیرے ہاتھ پاؤں اور بدن اشرف المخلوقات جیسا ہے پھر اس ڈیل ڈول اور ہاتھ پاؤں پر تو گھر کیوں نہیں بناتا ہے۔ اور مینہ آندھی کی تکلیفیں کیوں اٹھاتا ہے۔ بندر مینہ کی بوچھاڑ اور اولوں کی مار کھا کر کھسیانہ تو ہو ہی رہا تھا بیے کی نصیحت سنکر آگ ہی تو ہو گیا۔ کم بخت نابکار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ہاتھ بڑھا بیے کا پیارا اور خوشنما گھونسلا نوچ کھسوٹ دانتوں سے چیر چار پھینک دیا۔ بیا پھر سے اڑ کر سامنے شمشاد کے درخت پر جا بیٹھا نہیں وہ بیوفا اس کا بھی نوالہ کر جاتا۔ بندر کی اس ستمگاری اور اپنی دلداری پر بیا افسوس کرکے کہنے لگا

۵ سکھ دیجے واکو جاکو سکھ سہائے   سکھ نہ دیجے باندرا جو بیے کا گھر جائے

یعنی مشورہ اور نصیحت اسی کو کرنی چاہیئے جسے مشورہ اور نصیحت اچھی معلوم ہو نااہل کو مشورہ اور نصیحت ناگوار گذرتی ہے۔ اور وہ بندر کی طرح مُنہ نوچنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ بھی ناسمجھی میں بندر سے کم نہیں ہیں صلاح مشورہ ہمیں زہر لگتا ہے نصیحت پر بُرا مانتے ہیں جب ہم سے کوئی کہتا ہے کہ یورپ کے علوم وفنون سیکھو۔ انگریزوں کے دل میں جگہ پیدا کرو۔ کیونکہ خداوند تعالےٰ نے انکو ہمارا مُربی بنادیا ہے اور بے مربی کے مُربی نہیں کہلایا جاتا ہے۔ تو جامہ سے باہر ہو جاتے ہیں ناصح کی نسبت ارشاد ہوگا یہ چھپے ہوئے کرسٹان ہیں جبھی تو دن رات عیسائیوں کی تعریف کرتے ہیں یا سی۔ ای۔ ڈی میں نوکر ہیں۔ ہمارے تمہارے دلوں کی ٹوہ لینے کے لئے یہ چھیڑیں نکالا کرتے ہیں۔ تفکر اور تدبر ہم میں باقی نہیں رہا۔ ولایت پر ولایت ملک پر ملک ہمارے ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے۔ زمانہ اپنی چکی میں دھر کر رائی سے کائی کئے ڈالتا ہے۔ مگر ہماری شیخی اور جہالت اب تک وہی چلی جاتی ہے۔ خزاں میں چمن اُجڑ جاتے ہیں۔ مگر مشاطہ بہار جب مارچ میں قوت نامیہ کی کنگھی ہاتھ میں لیکر آتی ہے تو وہی سنبل کی دھواں دھار مشک افشاں چوٹی ہوتی ہے۔ وہی گلاب کے رنگین رخسار ہوتے ہیں۔ وہی نرگس شہلا کی دلفریب آنکھیں ہوتی ہیں بلبلوں کی نغمہ سرائی وہی قمری کی صدا کی دلربائی ہوتی ہے۔ اپریل میں ندی نالے سوکھ جاتے ہیں۔ اور دریا پایاب ہو جاتے ہیں۔ مگر اگست ستمبر کی بارشیں جل تھل بھر دیتی ہیں۔ ندی نالے دریا بنجاتے ہیں۔ دریا سمندر ہو جاتے ہیں۔ پانی کی سطح پر اگلے برس کی طرح اسٹیم کشتیاں لنچ بوٹ دوڑتے پھرتے ہیں۔ لوگ بجروں میں سوار ہوتے ہیں اور سیر سے دل بہلاتے ہیں

اندھیرے کے بعد اُجالا پھیل جاتا ہے غرض ہر تنزل کے بعد ترقی دکھائی دیتی ہے۔ ہر پستی کے بعد بلندی نظر آتی ہے۔ مگر مسلمانوں کا ادبار گھٹتا ہی نہیں۔ انکی تقدیر پلٹا کھاتی ہی نہیں۔ یہ خواب غفلت سے آنکھ کھولتے نہیں۔ چونکتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کسی کام میں پوری ڈالتے ہی نہیں۔ باپ کا خیال اَور بیٹے کی رائے اَور قوم کچھ کہتی ہے قبیلہ کچھ کہتا ہے۔ بیوی کچھ راگ گاتی ہیں میاں کچھ الاپتے ہیں۔ دور کیوں جائیے دلّی کے آباد کو ہی دیکھ لیجیے۔ ۴۵ میل مربع میں اس کے کھنڈر نظر آئیں گے۔ اس کا سبب صرف مسلمانوں کی تلوّن مزاجی اور سیماب وشی ہے۔ غلام بادشاہوں کو پتھورہ کی دلّی خلجیوں کو غلاموں کی دلّی تغلق کو خلجیوں کی دلّی سیدوں کو لودیوں کی دلّی مغلوں کو لودیوں کی دلّی پسند نہ آئی۔ اس لئے دلّی بلّی کی طرح بھاگی بھاگی پھری اور ہر بار اس کا نام بھی بدلا گیا۔ کبھی تغلق آباد کبھی فیروز آباد کبھی شاہجہاں آباد وغیاث پور وغیرہ متعدد ناموں سے موسوم ہوئی ؎

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت رفت منزل بدیگرے پرداخت

اسی ہول جول اور بیجا اضطراب میں شوکت الاسلام نا تمام رہگئی۔ شوکت الاسلام اس مسجد کا نام ہے جسے قطب الدین نے بنانا شروع کیا تھا۔ اس کے منارہ کو لوگ قطب صاحب کی لاٹھ کہتے ہیں۔ اور یورپ و امریکہ افریقہ کے سیاح اس کے دیکھنے کے لئے سفر کی مصیبتیں جھیلکر ہندوستان آتے ہیں اگر یہ مسجد پوری ہو جاتی تو دنیا میں کوئی کلیسا کوئی گرجا کوئی مندر کوئی مسجد اس شان و شوکت کی نہ نکلتی۔ مگر پوری کیوں ہونے لگی تھی

آٹھ سو برس میں جتنے مسلمان بادشاہ ہوئے اپنے سے پہلے بادشاہوں کو نادان سمجھتے رہے اور اس کی یادگار اور اس کے کارناموں کو عبث خیال کرتے تھے۔ اور ایک اس مسجد پر کیا موقوف ہے یہ اپنے سب کام ادھورے اور نکمے چھوڑا کرتے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے۔ جو محمڈن یونیورسٹی کے لئے انھوں نے کیا چیخم دہاڑ مچائی تھی۔ مگر ٹائیں ٹائیں فش۔ ڈھاک کے تین پات۔ چندہ کی مقدار معینہ ان سے پوری نہ ہوئی ؎

اب زباں پر کبھی آتا نہیں لغت کا نام لگے مکتوبوں میں کچھ رسم کتابت ہو تو ہو

آجکل تو کوئی محمڈن یونیورسٹی کا خواب بھی نہیں دیکھتا۔ مسلمانوں کی اُمنگ باسی کڑھی کا اُبال ہے۔ کہیں تولہ کہیں ماشہ ؎

اللہ رے تلون ابھی کیا تھے ابھی کیا ہو شوخی ہو تو شوخی ہو حیا ہو تو حیا ہو

جب کبھی ہمارے دل زندہ تھے اور علم کا ذوق شوق رکھتے تھے۔ تو اہل علم کے لئے ایک پیاز کا پتہ لاکھ لاکھ روپیہ کو مول لے لیتے تھے۔ یہ دعوےٰ بلا دلیل نہیں یہ بات بلا تصدیق نہیں تاریخ شاہد ہے۔ کہ حضرت ابو حفص کبیر جو حنفی فقہ کے امام گذرے ہیں بیس برس کی عمر میں تحصیل تمام کر چکے۔ تو ان کے علمی کمالات اپنی جھلک دکھانے لگے بغداد کے مسلمانوں نے انکی خدمت میں آکر عرض کی خدا رکھے اب آپ ہمارے پیشوا اور ہادی بن گئے وعظ شروع کیجیے۔ اور پیاسوں کو سیراب فرمائیے۔ آپ نے فرمایا ؎ او خویشتن گم ست کرا رہبری کند، مجھ سے ایسا گناہ صادر ہوا ہے جس کے لئے توبہ بھی بیکار ہے میں ہر دم اسی کی فکر و انفعال میں مبتلا رہتا ہوں۔ وعظ کون کہے۔

مسلمان: یہ حضرت وہ کیا گناہ ہے جو توبہ سے بھی معاف نہیں ہو سکتا؟

حضرت ابوحفص "وہ حق العباد ہے بندہ کا گناہ کیا ہے"
مسلمان "جس کا حق حضور کے دشمنوں نے تلف کیا وہ مر گیا"
حضرت ابوحفص "نہیں وہ جیتا ہے"
مسلمان "پھر آپ اس کا حق ادا کر دیجے یا اس سے معاف کروا لیجے"
حضرت ابوحفص "نہ وہ اپنا حق لیتا ہے نہ معاف کرتا ہے"
مسلمان "اگر کچھ حرج نہ ہو تو اس شخص کا پتہ بھی بتائیے اور اس کے حق سے بھی ہم کو آگاہ فرمائیے۔ شاید ہم سب ملکر کچھ اس کا تدارک کر سکیں"
حضرت ابوحفص "دونوں باتوں کے بیان کر دینے میں مجھے کچھ تامل نہیں ہے۔ سنئے جب میں لڑکپن میں درس لینے کے لئے مدرسہ آجایا کرتا تھا۔ تو رستہ میں ایک یہودی کا باغیچہ پڑتا تھا۔ آتے جاتے اُسے شوق نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی چمن بندی بہت ہی فرحت بخش تھی۔ ایک دن مجھے اس کی سیر کا شوق ہوا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا تو تھا ہی نہیں۔ میں بیدھڑک اس میں چلا گیا۔ اور روشوں پر ٹہل کر اپنا جی خوش کرنے لگا۔ پھرتے پھرتے ایک پٹڑی پر پہنچا جس کے پاس ایک کیاری میں پیاز اُگ رہی تھی۔ اور اس کے لمبے لمبے پتے ہوا سے لہرا رہے تھے۔ میں نے کھیل کے طور پر ایک پیاز کا پتہ کوئی چار انگل بھر توڑ لیا۔ اور چٹکی سے مسل کر پھینکدیا اور گھر چلا آیا۔ برسوں کچھ اس کا خیال نہ آیا۔ مگر میں جب سن تمیز کو پہنچا تو سمجھا مجھ سے یہ خطا ہوئی ہے۔ اس کو معاف کروانا چاہئے۔ دھیان آتے ہی باغیچہ کے مالک کے پاس گیا اور یہ حال اس سے کہا۔ متعصب یہودی نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ اور ہنسکر کہا ایک بنی اسرائیل سے مسلمان کو ہرگز بھلائی کی اُمید نہ رکھنی چاہئے۔ جاؤ اپنا رستہ لو۔ میں مایوس

ہوکر چلا آیا۔ اور دن رات اسی سوچ میں گھلا کرتا ہوں۔ وعظ کہنے کے لئے کس کا حوصلہ لاؤں"

مسلمان "حضور یہ تو بہت ہی ہلکی بات ہے ہم ابھی جا کر اُسے راضی کر کے معافی نامہ لکھوائے لاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو چار پیسہ اس کا معاوضہ یا قیمت لے لیگا"

حضرت ابو حفص "اگر وہ معافی نامہ لکھدے گا۔ تو مجھے وعظ کہنے میں بھی کچھ عذر نہ ہوگا"

مسلمانوں کا یہ ڈیپوٹیشن یہودی کے پاس پہنچا۔ اور سب نے یکزبان ہوکر کہا افسوس ہے تم نے ہمارے پیشوا کے کہنے کو نیچے ڈالا اور ان کی خوشنودی کے لئے تم سے یہ نہ کیا گیا کہ میں نے پیاز کا پتہ معاف کیا۔ پیاز کے پتہ کی اوقات ہی کیا تھی۔ کھانے پینے کی چیز نہیں کوڑا ہے۔ رُل کھلکر گھوکروں ہیں چلا جاتا"

یہودی "تمہارے پیشوا کی میں کیوں خوشنودی چاہنے لگا تھا۔ مجھے اُن سے اور تم سے واسطہ کیا۔ اور بقول تمہارے اگر سچ مچ پیاز کا پتہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا ہے۔ تو تمہارے پیشوا صاحب اس کی معافی مانگنے کے لئے پیٹ پکڑے کیوں آئے تھے۔ اور اب آپ سب کے سب میرے اوپر کیوں چڑھکر آئے ہیں"

مسلمان (یہودی کا سخت جواب سُنکر) خیر آپکے کہنے کے موافق پیاز کے پتہ کی کچھ حقیقت ہے تو اس کی قیمت لیلو۔ زیادہ سے زیادہ دو کوڑی کا ہوگا۔ ادھی نہ سہی دمڑی سہی تم ایک پیسہ لیلو"

یہودی "میرے نزدیک جو پتہ حضرت ابو حفص کبیر نے توڑا ہے اس کی قیمت بہت ہے"

مسلمان (بہت ہی گرم ہو کر) منہ سے کچھ پھوٹو تو سہی جو تم کہو گے وہی دینگے"

یہودی (دیر تک سوچکر) ایک لاکھ روپیہ نقد لونگا"

یہودی نے لاکھ روپیہ کا نام لیا تو مسلمان بگڑے حجت ہوئی۔ جھنجھٹ ہوئی۔ مگر پیچھا بیرحم یہودی کہنے لگا۔ میرا پیاز کا پتہ تو لاکھ روپیہ کا تھا دس ہزار بیس ہزار پچاس ہزار پر بھی راضی نہ ہوا۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ کرتا رہا جب وہ کسی طرح نہ پسیجا۔ تو مسلمانوں کو غیرت آئی۔ انھوں نے کہا۔ اچھا لاکھ ہی روپیہ دیں گے۔ مگر اب تو شام ہو گئی ہے۔ اسوقت بندوبست نہیں ہو سکتا ہے۔ انشاءاللہ تعالے صبح تیرا کہنا کر دینگے مگر رسید لکھدینی ہو گی۔ یہودی نے کہا رسید میں آنکھوں سے لکھدونگا۔ مگر لونگا لاکھ ہی روپیہ۔

مسلمان جوش و خروش کے ساتھ پلٹے اور مغرب کی نماز جامع مسجد میں انھوں نے پڑھی نماز سے پہلے پہلے اعلان کر دیا گیا تھا۔ اس لئے نماز کے بعد سب مسلمان مسجد میں ٹھہر گئے۔ ایک شخص نے پیاز کے پتہ کا قصہ دہرایا۔ اور کہا بھائیو اگر ہم میں تم میں اسلامی حمیت اور خون میں کچھ مذہبی حرارت باقی ہے تو رات ہی رات میں لاکھ روپیہ کا چندہ ہو جائے۔ اس آواز نے مسلمانوں کو بیچین کر دیا وہ غیرت میں ڈوب گئے۔ چندہ شروع ہوا اور عشاء کی نماز سے پہلے پہلے لاکھ روپیہ سے اوپر اوپر اکٹھا ہو گیا۔ مسلمانوں کو رات کاٹنی دشوار ہو گئی کہ کب صبح ہو اور ہم کب یہودی کو روپیہ دیکر اور رسید لیکر حضرت ابو حفص کی جناب میں جائیں اور آپ کا وعظ سنیں۔ ادہر مسلمانوں سے زیادہ یہودی خوش تھا کیونکہ وہ مسلمانوں کی عالی ہمتی سے خوب آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کے نزدیک لاکھ روپیہ چندہ کر لینا کچھ بات نہیں ہے۔ ہنستا کھل کھلاتا گھر پہنچا۔ اور بیوی کے کان میں کہا آج شراب پیونگا۔ تم بالاخانہ پر جلدی سے آجاؤ۔ مگر دیکھنا گھر میں کانوں

کان کسی کو خبر نہ ہو۔ شرب الیہود کی مثل اسی باعث سے بنی ہے کہ یہودی چھپ کر شراب پیا کرتے ہیں۔ اور کسی پر کھلنے نہیں دیتے ہیں۔ اسی کی نسبت حضرت ذوق اشارہ کرتے ہیں ؎

پوشیدہ ان نگاہوں میں سرخوش ہیں ہم مدام شرب الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

یہودن پریوش تھی۔ پچیس برس کا سن شعلہ رخسار بالکل بھبوکا۔ تیکھی بھویں اور بڑی بڑی آنکھیں جن کی پتلیاں کعبہ کے غلاف سے زیادہ سیاہ تھیں۔ سر کے بال مشک اور سنبل سے کالے سیاہ لباس کے اندر اس کا سراپا کالی گھٹا میں بجلی کی طرح چمک رہا تھا۔ یہودی نے شراب کا گلاس پکڑ زور سے قہقہہ مارا۔

یہودن "اے واہ آج سچ مچ ایک چلو میں ہی چھک گئے۔ ترنگ کی لینے لگے"

یہودی "خدا جانتا ہے وہ بات نہیں ہے جو تم سمجھی ہو"

یہودن "پھر کیا بات ہے"

یہودی "آج میرا جی اندر سے خوش ہے بے اختیار ہنسی چلی آتی ہے۔ اے خداوند کے اکلوتے بیٹے عزیز یہ تیرا ہی سارا کرم ہے نہیں میرا منہ کہاں تھا"

یہودن "خدا کے لئے کھول کر کہو کیا بات ہے۔ میرا تو اس نگوڑے بے سر پاؤں کے قصے سے جی الجھتا ہے"۔

یہودی "بڑی خوشی کی بات ہے سنتے ہی تم بھی ہنس دو گی"

یہودن (ٹھنک کر) "پھر کہتے کیوں نہیں ناحق ستانے سے کیا فائدہ"

یہودی "کل سچ مجھے سے منت بے منت ٹھکرا ہی بیٹھے گھر بیٹھے

لجائیگا۔ خدا چھپر پھاڑ کر دیگا"

یہودن"۔ وہ کیونکر" یہودی نے حضرت ابوحفص کبیر کا پیاز کا پتہ توڑنیکا قصہ اور مسلمانوں کی حمیت کا حال کہا۔ یہودن نہایت عاقلہ اور سمجھدار تھی۔ وہ اس قصہ کو سنکر چپ ہو گئی اور اپنے دل میں کچھ سوچنے لگی۔ یہودی کی رات عیش و نشاط میں بسر ہوئی۔ اور مشرق افق سے صبح نے اپنی نورانی جھلک دکھائی نسیم کے ٹھنڈے جھونکوں سے دجلہ کے آبدار پانی میں لہروں کا جال پڑنے لگا۔ اور مچھلیاں پانی میں سے منہ نکال کر اس سہانے وقت کو شوق کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ شاہی برج پر سے عباسی توپ چلی جس کی آواز نے چرند پرند انسان حیوان سب کو ایک دم سے چونکا دیا۔ اور بغداد کی مسجدوں سے اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوئیں۔ حضرت ابوحفص کے سچے معتقد لاکھ روپیہ لے یہودی کے دروازہ پر آموجود ہوئے۔ اور اس سے کہا روپیہ لیلو رسید دیدو۔ یہودی دوات قلم لینے کی غرض سے اپنی محلسرا میں گیا۔ اور بیوی کو یہ مژدہ سنایا۔ یہودن نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور نہ وہ اس قصہ کو سنکر خوش ہوئی۔ وہ تیس منٹ تک پیکر تصویر کی طرح چپ بیٹھی رہی۔

یہودی"۔ تم چپ کیوں ہو گئیں ہنسو بولو۔ خدا کا شکر کرو"

یہودن"۔ خدا نے جسے رتی بھر عقل دی ہے وہ تو یہ حال سنکر خوش ہونے سے رہا"

یہودی"۔ یہ کس طرح"

یہودن"۔ یوں کہ یہ موقع مسرت کا نہیں عبرت کا ہے سمجھنے کی بات ہے۔ کہ جو قوم ایک پیاز کے پتہ کے کارن لاکھ روپیہ بھردے۔ وہ اپنے مذہب پر کس قدر مائل ہے۔ اور اسی میلان کا نام ایمانداری ہے۔

اور وہ مذہب کس قدر سچا ہے جس میں پیاز کے پتے کو بھی مالک کی بے اجازت چھونا گناہ اور ہم لوگ کس قدر بیباک اور ناپاک ہیں جو ایسے ایمانداروں کو ناحق ستاتے ہیں اور ستاکر خوشیاں مناتے ہیں۔"

بیوی کی ان باتوں سے یہودی کا دل پکڑا گیا۔ وہ کچھ خدا سے ڈرا۔ کچھ جھپا۔ بیوی سے کہنے لگا۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

یہودن "میری مانو تو کہوں"

یہودی "ضرور مانونگا کہو کیا کہتی ہو"

یہودن "ہم تم اپنے قبیلہ سمیت حضرت ابوحفص کی خدمت میں حاضر ہوکر پہلے اس گستاخی کو معاف کرائیں پھر مسلمان ہوجائیں۔ اور یہ لاکھ روپیہ ان کی نذر کردیں۔ کیونکہ اس سے زیادہ اسلام کی صداقت کی بارے لئے اور کوئی دلیل کیا ہوگی"

یہودی کے جی میں بیوی کی بات بیٹھ گئی۔ اور جو اس نے صلاح دی تھی وہ کر گذرا۔

اسی طرح قردح جو اموی لشکر کا سپہ سالار تھا۔ جب لام پر جانے لگا۔ تو اپنی حاملہ بیوی کو تیس ہزار اشرفیاں دیکر کہا ان کو احتیاط سے رکھنا۔ اور بیجا صرف نکرنا کبھی اڑی بھیڑی میں کام آئیں گے۔ تمہارے کھانے پینے کے لئے خدا رکھے گھر میں بہت ہے۔ اور میں نوکری پر سے ہمیشہ روپیہ بھیجتا رہونگا سپہ سالار کے جانیکے بعد اس کے گھر میں ایک بابرکت با اقبال لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ابو ربیعہ رکھا گیا جب قردح ۲۷ برس بعد پلٹ کر گھر آئے تو فرزند کو جوان دیکھکر شاد ہوگئے۔ گلے لگایا۔ ماتھے پر بوسہ دیا محل میں پہنچے۔ تو رات ہو گئی تھی خلوت ہوئی تو بیوی سے کہا وہ اشرفیاں کہاں ہیں۔

بیوی: "ان ہی ستائیس برس تک اشرفیاں دہری رہیں۔ میں نے تو دہڑی
دہڑی کر کے خرچ کر ڈالیں مگر اپنی جان کو ان میں سے آدھی بھی نہیں لگائی سب
تمہارے اکلوتے بیٹے کے نیک لگی ہیں"

فرخ: "کیا چھٹی دھوم دھام سے کی تھی"

بیوی: "دشمن میرے باولے تو ہو نہیں گئے تھے جو مفت خدا میں موئی
کی راہ اشرفیاں بہا دیتی"

فرخ: "پھر کس طرح صرف کیں"

بیوی: "خدا رکھے ابو ربیعہ کے پڑھانے کے لئے لائق لائق استاد رکھے
ان کو بھاری بھاری تنخواہیں دیں اس کے لئے کتب خانہ بنوایا۔ نایاب کتابیں مول
لے کر دیں۔ حف نظر میں اپنی ایڑی دیکھوں اب ماشاء اللہ میرا لال مسلمانوں کا
امام گنا جاتا ہے اس وقت تو تم تھکے ہارے منزلیں مارے چلے آ رہے
ہو یہ بات تمہاری سمجھ میں نہ آئیگی۔ صبح اٹھکر بیٹے کا امتحان لے لینا اس وقت
اگر تم کہو کہ بیوی تو نے میرا مال فضول خرچ کیا تو میں نے جانا۔ بارہ گنی لکھتی ہوں"

صبح کی نماز کے بعد فرخ نے جا کر دیکھا۔ لائق بیٹا کمال کی مسند پر بیٹھا
ہے۔ خواجہ حسن بصری امام مالک اور ان جیسے ہزاروں کامل اور فاضل شاگرد
اس کے قدم چوم رہے ہیں۔ ہزاروں آدمی زیارت کے لئے چلا آتا ہے۔
یہ معلوم ہوتا ہے کہ حوض کوثر پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ لخت جگر کی یہ شان یہ رتبہ دیکھکر
باپ شادی مرگ ہو جاتے تو تھوڑا تھا خوشی میں رونا آ جاتا ہے یعنی ڈاڑھی
پر آنسو بہاتے ہوئے محل میں آئے اور بیوی سے کہا۔ تم نے میرے ساتھ بڑا
احسان کیا جو تیس ہزار اشرفیاں خرچ کر کے میرے بیٹے کو سپوت بنا دیا۔ اسی
طرح جب امام بخاری حدیث کی تحصیل کے لئے گھر سے چلنے لگے۔ تو ان

کی ماں کے پاس جو کچھ نقدی تھی دیکر کہا بیٹا بطور امانت تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں ۔ میری جان علم بڑی دولت ہے ۔ شوق سے پڑھنا اور روپیہ بیدریغ خرچ کرنا ۔ ماں کے ان فقروں کو سنکر امام صاحب کی بہن کو بھی جوش آیا ۔ دوڑی دوڑی گئیں اور اپنے کمرہ میں سے ایک صندوقچہ اٹھا لائیں ۔ کئی ہزار کا زیور اس میں سے نکالکر بھائی کے سامنے رکھدیا اور انکی بلائیں چٹ چٹ لیکر کہا ۔ میرے چاند میرے چھوٹے بھائی بہن تجھپر واری گئی مجھ غریب کے پاس اسوقت نقد روپیہ نہیں ہے ۔ اس گہنے کو اپنی خرجین میں رکھ لے ۔ اس کی کتابیں خرید لینا ۔ لے اللہ بیلی ۔ اب تو سدہار رسول کے اچھوتے شہر کا سفر تجھے مبارک ہو ۔ حدیث کا علم نصیب ہو ۔ جس طرح پیٹھ دکھا کر جاتا ہے اسی طرح خوشی خوشی اپنا منہ دکھانا ۔ کاش اُن مردانہ وار عورتوں کی غیرت ہم مردوں میں آجائے اور ہم سب جھگڑے خرخشے مٹا کر محمدن یونیورسٹی کی تکمیل کر ڈالیں ۔ فقط

حکیم سید ناصر نذیر فراق دہلوی

حضرتِ دل کی تعریف

دل مٹھیوں میں۔ دل چٹکیوں میں۔ دل عاشق۔ دل معشوق۔ دل بادشاہ دل نازوں بھرا۔ دل نیازمند۔ دل بیوفا۔ دل باوفا۔ دل دلدار۔ دل دلسوز کہیں دل کی اس قدر تعریف ہے کہ اس کو سفیع المنزل مانا جاتا ہے کہیں دل اگر پست ہے۔ تو اتنا کہ ٹھوکروں میں ٹھکرایا جاتا ہے۔ ایک دل ہے اور اس ہی ایک میں لاکھوں تو نہیں لاکھوں شگوفہ ہزاروں رنگ ہزاروں خوشبوئیں جوڑ جوڑ میں دل رونگٹے رونگٹے میں دل عضو عضو میں دل جہاں نشتر چبھو دل موجود ہے۔ جہاں زخم آئے سینہ سپر ہے۔ آہ کرو تو دل سے اُٹھے۔ زاری کرو تو دل رووے۔ پیار کرے تو دل کرے بیزار ہو تو دل ہو۔ دل سب سے مانوس دل سے سب مانوس۔ دل سب کچھ جانتا ہے۔ دل کو ہر شخص مانتا ہے۔ مگر آجتک کسی کو یہ نہیں معلوم کہ دل کی حقیقت کیا ہے۔ دل رہتا کہاں ہے۔ دل پیدا ہوا تو کیونکر۔ اور ہمیں ملا تو کہاں سے؟

دل نے سینکڑوں گھر آباد کئے۔ ہزاروں خانہ ویران ہوئے۔ دل کے ہاتھوں رسوائیاں ہوئیں۔ دل نے سینکڑوں شادیاں دیکھیں۔ دل سے دل نے بگاڑ کرائے۔ پھر بھی دل سے دل کو آگاہی آجتک محال ہے دردِ دل کی کہانیاں سنتے سنتے جی پک گیا۔ مگر دل کی داستان آجتک کسی نے نہ لکھی۔ اشراقین اور فلسفئین کی فکر پر بھی ویسی ہی حیرت کے پردے ہیں جیسے ہماری فکریں چار قدم چلکر تھک جاتی ہیں انھوں

نے دل کو انسان کا نگہبان مان لیا ہے۔ اور ایک قوت لازمی کہکر اپنے خیال کا پیچھا چھڑا بیٹھے ہیں۔ مشائین بہت دیدہ دلیر مانے جاتے تھے۔ آسمان کی سیر زمین کی سیر۔ ملکوت کی سیر لاہوت کی سیر۔ یہاں کی سیر وہاں کی سیر کرتے رہے مگر اس وبال جان کی سیر انکی قسمت میں بھی بدی ہوئی نہیں تھی۔ وہ دل کو اسرار کہہ کر منہ چھپا گئے۔ اطباء کو کیا کہئے ان کے قیاسی گھوڑے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ پھر کمہار کا کام ستار سے نکلے تو کیسے نکلے۔ ان کی تحقیقات کا دائرہ صرف حفاظت جسمانی پر ختم ہو جاتا ہے۔ چونکہ دل کو جسم سے تعلق ہے انھوں نے اس کو تمام قوتوں سے افضل مانکر جسم کے اس حصہ کا نام دل رکھدیا جہاں سے جسم کی ضرورتیں رفع ہوں جس کا عمل سارے جسم پر پہنچتا ہو۔ جسم کے حصہ تقسیمی میں بائیں جانب صنوبری شکل کا ایک ٹکڑا ہے۔ خون کی گردش کا مقیاس اس پر موقوف ہے۔ تشخیص اجسام میں دیکھا گیا ہے کہ ہر عضو رئیس پر صدمات ہوتے ہیں اور وہ ان کی برداشت کی قوت بھی کم و بیش رکھتا ہے یا اُس پر اگر کوئی صدمہ پہنچے تو وہ اس کی چارہ جوئی کا موقع دیتا ہے۔ دل کی حفاظت کرنیوالی قدرت نے اس کی حفاظت کے لئے رفیع الشان محل بھی بنایا ہے۔ اس کے محل میں آبشاریں ہیں۔ اس کے سر پر ایک پنکھا بھی ہے اس کو ہروقت آرام بھی دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ڈیننگ روم بھی ہر وقت طیار رہتا ہے۔ پھر چاہے کسی عضو کو کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو اس خزانہ خاص میں سے تصرف بھی نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ حضرت ذرا سی تکلیف نہیں برداشت نہیں کرتے تھوڑے سے صدمے میں برافروختہ ہو جاتے ہیں۔ چونکہ تشریحی اعیان میں یہ سب چشم دید واقعہ ہیں۔ اور متقدمین اس مسکن گاہ کے مقیم کا نام دل رکھ چکے ہیں۔ اطباء ان کے مقلد میں یہ بھی کہدیتے ہیں کہ دل اس حصہ جسم کا

نام ہے جو بائیں جانب واقع ہوا ہے۔ ورنہ حقیقت میں ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ وہ کیا ہے۔

شاعروں میں جذبات زیادہ ہوتے ہیں انھوں نے ہر فعل کے فاعل کو ایک شے واحد قرار دے لیا ہے۔ اور وہ دل کو ایسے مکارم سے منسوب کرتے ہیں کہ رہی سہی عقل ہی فنا ہو جاتی ہے ؎

مرغ دل راسوز جمعیت بدام افتادہ بود   زلف بکشادی و باز از دست شد نخچیر ما

یہاں دل کو پرند بتایا ہے۔ گویا کہ اس میں پرواز تو تھی۔ مگر جمعیت کے دام میں وہ پھنس گیا۔ پھر اس قدر نازک دماغ بھی تھا۔ کہ زلف کی کشود یا زلف کی خوشبو اس کے لئے روح رواں بن گئی۔ اور اس کے پنکھوں میں اتنی قوت آگئی کہ اڑ گیا ؎

نہ جاتے اسکی محفل میں نہ جاتے   نہ سمجھے تھے وہاں بہجائیگا دل

دل اپنے راز کا کسی پر افشا بھی نہیں کرتا تاکہ روکنے کا موقعہ ملے۔ اور آزادی اتنی بھری ہوئی ہے کہ جہاں چاہتا ہے رہ جاتا ہے۔ اس کو ہمارے ساتھ اتنی رفاقت بھی نہیں رہتی کہ کہنے سننے سے واپس چلا آئے

امیر اس ناز سے ظالم نے دیکھا   نگاہیں بول اٹھیں وہ لیلیا دل

آپ چھن بھی جلتے ہیں۔ ذرا ناز سے کوئی دیکھیے اور ان کو جہاں چاہے لیجائے۔ اس بیوفائی کو خیال فرمائیے۔ کہ تمام عمر تو ہمارے ساتھ رہے اور ہم خون جگر پلا پلا کر پالا کئے۔ اور ایک عشوہ گر فیلسوف کی ایک نگاہ اڑائے گئی اور آپ چلتے ہوئے ؎

نالان فراق دل میں ہی ماتم سرائے دل   سینہ سے آرہی ہے صدا ہائے ہائے دل

اس بیمروت مہمان کے ساتھ وابستگی تو دیکھیے۔ ذرا یہ ہوا ہو کہ سب پریشان

بھکر واویلا مچانے لگتے ہیں ؎
اے دل شباب رفت و نچیدی گلے ز عمر ۔ پیرانہ سر مکن ہوس ننگ و نام را
آپ کیساتھ امیدیں بھی وابستہ ہیں۔ آپ خزائن امید و عطف کے
خوشہ چیں بھی ہیں پھر اس پر آپ کی طبیعت جوان شاہد پرست بھی واقع ہوئی ہے
جس کی طرف دوسرے مصرع میں طعنہ کے ساتھ آپ کو خبردار کیا جاتا ہے۔
پیرانہ سر مکن غیرت دار بھی ہیں اور مخاطبت اس کی گواہ ہے۔
کل آیا تھا جہاں سے ہوکے بیزار ۔ وہیں پھر آج مجھکو لیچلا دل
حضرت کو شرم و حیا طعنہ و تشنیع میں بھی کچھ عذر نہیں۔ کوئی منہ لگائے
نہ لگائے جدھر مخاطب ہوتے ہیں بے شرمی اور بے غیرتی سے گھستے چلے
جاتے ہیں۔
اچھا نہیں ہے فاش ہو گر ماجرائے دل ۔ اے کاش دل ہی دل میں رہے مدعائے دل
کچھ بھید کی باتیں بھی ان کے پاس پوشیدہ ہیں۔ اور شاعر کو سخت بدگمانی
ہے کہ وہ فاش نہ کردے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کم ظرفی کا عیب
بھی ہے۔
ہوتا نہیں ہے کوئی برے وقتمیں شریک ۔ گر کچھ بٹائے درد تو شاید بٹائے دل
آڑے وقت کی دستگیری کے آپ داتا بھی ہیں۔ دوسروں کی چوٹ بھی اٹھالیتے
ہیں جب تو شاعر کو اتنا بھروسہ ہے کہ برے وقتمیں صرف آپ کو ہی
اس کا اہل سمجھکر یاد کرتا ہے۔
کیوں نہ نکیوں میں ہو گرم نالہ ہائے زار دل ۔ سو رہے ہیں سینکڑوں دل زیر زمیں بیدار دل
نالہ و شیون کے بھی آپ واقف کار ہیں۔ پھر یہ تو ملاحظہ فرمائیے دل
زیر زمین بھی رہتا ہے۔ حکیموں کا دل اطباء کا گوشت کا لوتھڑا تو خاک ہوجاتا ہے

مگر شاعروں کا دل یہاں بھی آرام میں نہیں ہے۔ بلکہ زیر زمیں بھی اس کو کوفت موجود ہے۔

ہجر میں گھیرے ہوئے رہتی ہیں اندوہ والم حلقۂ پرکار میں ہے نقطۂ پرکار دل

اے سبحان اللہ کند ہمجنس باہمجنس پرواز اندوہ والم دونوں قوتیں غیر مادہ ہیں ہجران کے حلقہ میں حضرت دل گھیرے گئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ آپ کو بھی مادہ سے کچھ تعلق نہیں۔ آپ اس قدر مختصر بھی ہیں کہ آپ کو نقطۂ پرکار سے تشبیہ دیجاتی ہے۔

نشان عہد وفا نیست در تبسم گل بنال بلبل بیدل کہ جائے فریاد ست

ان کو وفا پر اعتبار بھی نہیں آتا۔ اور خوش قسمتی سے اس قدر بلند خیال ہیں کہ عقوبت کے غم میں اگر کوئی وقت خوشی کا ملتا ہے۔ تو رونا ہی حصہ قسمت ہوتا ہے اس نزاکت کو غور سے دیکھئے کہ یہاں دل کو بلبل بنایا ہے پھر بلبل کے کلیجہ میں دل کو بٹھایا ہے۔ گویا کہ دل کے بھی دل ہوتا ہے۔ اور اسوقت یعنی عہد وفا کے موقعہ پر اس کو بیدل کر رہا ہے جو غایت افسوس کا فقرہ ہے۔

شغل شب فراق یہی ہے کہ رات بھر کہتا ہوں دل کے سامنے میں ہائے ہائے دل

طبیعت کی مجبوری اور ان کی حکومت کس قدر قابل افسوس ہے کہ شاعر ان کو روک نہیں سکتا۔ صرف سمجھاتا ہے۔ اور مجبور بھی نہیں کرتا بلکہ ان کا ہم خیال ہو کر دل بہلاتا ہے۔ اور ان کو کوچہ بکوچہ پھراتا پھرتا ہے۔

رکھا تھا تھام تھام اتنک تو دل کو کسی صورت نہیں اب مانتا دل

یعنی اس قدر بے اختیاری بھی ان کو کسی وقت ہو جاتی ہے۔ بگڑ بیٹھتے ہیں اور کسی کی بات ہی نہیں مانتے۔

خواہش دولت اگر ہے ہو در دل پر مکیں فی الحقیقت ہے بڑی ڈیوڑھی بڑی سرکار دل

وہ شانیں تو آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں جو پہلے گذریں۔ اب آپکی دولتمندی ملاحظہ ہو۔
اب کے تو یا خدا کسی ایسے پہ آئے دل جو شوق سے سنا ہی کرے ماجرا دل
کیا نفیس تمنا ہے۔ اور کس قدر ستا دل ہے۔ نہ کسی کی تمنا ہے۔ نہ کسی کے حاصل
کرنیکا شوق ہے۔ صرف اس قدر خواہش کیساتھ دل نذر کیا جاتا ہے کہ دل کا قصہ سن لیا جایا کرے
پیدا ہوئے ہیں درد و الم اپنے واسطے غم آشنائے جاں ہے بلا آشنائے دل
ان کی صحبت بھی قابل دید ہے۔ یہ ہماری جان و مال کے مالک بھی ہیں
اور ہمارے انیس بھی ہیں۔ لیکن غم و بلا سے ان کی آشنائی بھی ہے۔
چاہا بروپیر ترے اے بت کردن بال ابھی ایک کے بدلے جو دے اللہ مجھکو چار دل
آپ کی وقعت اب ذرا دیکھنے کے قابل ہو کر چند بالوں کے بدلے آپ قربان کئے
جاتے ہیں۔
دم نکل جاتا ہے انکی روش قہر کے ساتھ دل ٹھہر جاتا ہے زلفوں کا اشارہ ہو کر
پہلے تو بزدلی ملاحظہ ہو پھر سہارا دیکھنے کے قابل ہے۔ گویا کہ آپ بالکل لجالو کی
خاصیت رکھتے ہیں۔
وہ دل کی تاک میں جو شوق سے بن ٹھن کے بیٹھے ہیں تو سو غمزوں سے دلبر تیر اُس چتون کے بیٹھے ہیں۔
غرض یہ کہ یہ ہر وقت سینہ سپر کئے رہتے ہیں اور تیر برچھی بھالے انکے جھکتے رہتے ہیں۔
قبلہ و محراب من ابروئے دلدار ست و بس ایں دل شوریدہ را با ایں چہ با آنچہ کار
ان کو نہ دین سے غرض ہے نہ ایمان سے صرف شاہد پرستی انکا شعار ہے
اور اسی تگ و دو میں یہ تمام ہو جاتے ہیں۔
کہیں کیا دل کے ارماں اپنے اب کیونکر نکلتے ہیں ترے گھر کی طرف سے وہ بہم ہو کر نکلتے ہیں
صرف کسی کے گھر کی طرف سے نکلنا دل کے ارمان نکلنے کا اساس بنا ہوا ہے
اور شاعر نے انتہائی صبر کے ساتھ جذبات کو روک کر دکھایا ہے۔

وہ زود رنج ہی اور کس قدر ہے کیا کہئے اور اپنا حال دل اک دردسری کیا کہئے

معلوم ہوا کہ دل کا حال ایسا وسیع اور پر ملال قصہ ہے جس کو شاعر بیان کرنے سے عاری ہے۔ حال دل کو دردسر اس لئے کہہ رہا ہے کہ محاورہ میں دردسر اسی حال کو کہتے ہیں جو بہت طول ہو۔ یعنی سنتے سنتے سر میں درد ہونے لگے۔ حکماء اور اطباء کی تعریف کو توہم ناکافی سمجھکر چپ ہو گئے تھے۔ مگر شاعر کے اس رگ ملال نے ایسا خلجان پیدا کر دیا ہے کہ دل کے حقیقی نقشہ یقین سے ہمارا قیاس کوسوں دور ہو گیا۔ اللہ بچائے عاشقوں کے دل سے یہ دل کا ہے کو ہے۔ بلکہ ایک عذاب ناگہانی ہے جس کا جواب شاید جہنم میں بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسمیں عجب عجب اجتماع ضدین ہیں۔ جن کو منطقی اور فلسفی تو کیا سارا زمانہ ملکر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہم یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ یہ شعراء کی بھول گییں ہیں۔ مانا کہ کسی غلط شاعر کی طرف ایسا سوءظن بھی کر لیا جائے۔ مگر شعرائے ربانی کا حال بھی اسی مبالغہ میں ایسا ہی پتلا نظر آتا ہے۔ اور وہ اس کو کچھ اور زیادہ کہہ گذرتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ انہی کے مبالغوں کو متفرق خیالوں نے اپنے اپنے دل میں جگہ دے لی ہے۔ اور شاعری کی ضمیر ایک جسم ہو گئی ہے۔ جو عناصر کے جسم سے علیحدہ ہے۔ اس کا جسم خیالی ہے اور وہ عالم کے خیال میں اس طرح گھس گئی ہے جیسے آفتاب کی شعاع ہر جسم میں داخل ہو جاتی ہے پھر وہ حرارت ہو کر نکلتی ہے۔ گویا کہ متقدمین شعرائے ربانی کے کلام میں جو شگوفے کھل چکے تھے آج شعراء اس کو اپنے خیال سے آراستہ کر کے دوسرے ملبوس سے پیراستہ کرتے ہیں۔ اور چاہے خود ان کو اس مفہوم تک رسائی ہو یا نہ ہو۔ مگر آمد ہوتی ہے اور کہہ دیتے ہیں۔

شعرائے ربانی پر کذب کا الزام لگانا صاحب عقل کا کام نہیں۔ ان اصلاحی

معنوں سے اگر مفہوم استفہامی مجازی شکلیں ہوتی ہیں۔ تو یہ شاعری عذاب جان ہوجاتی ہے اور دل کی حقیقت کوسوں دور رہ جاتی ہے۔ اور اگر ان اصلاحوں سے وہ مضمون مدنظر ہوتا ہے جیسا شعراء ربانی کی آمد و آورد کا مفہوم ان کے ذہن میں ہوتا تھا۔ تو دل کی حقیقت سے واقفیت ہوتی جاتی ہے۔ حکماء متقدین کو چونکہ الام اجسام و بساطت عالم سے عمر بھر کام رہا وہ حقیقت دل سے کورے رہے اور کورے گئے۔ اہل دل اس کی حالت سے واقف ہیں اور وہ دل کی حالت کا انکشاف کرتے ہیں۔ دل ایک روشن چراغ ہے جس کے عناصر میں صرف ایک ہی شے ہے جس کو روح کہتے ہیں۔

دلِ من پیر تعلیم است و من طفل زباں دانش سر تسلیم و سر عزد دبستان حسن ابتانش

میرا دل میرا پیر تعلیم ہے۔ اور میں اس کا شاگرد تعلیمی ہوں۔ سر تسلیم میری بسم اللہ میرے مکتب میں بیٹھنے کا پہلا دن ہے۔ اور اس کی ہو میں میرا کمال ہے۔

دل روح کی ملکوتی قوت پر حکومت کرنیوالا حاکم ہے۔ روح جس شب چراغ کی روشنی میں اس تنگ و تاریک جسم کی کوٹھری سے اُجالا پاتی ہے وہ دل کے آفتاب کا ہی فیضان ہے۔ دل روح میں ہے اور روح دل میں ہے۔ جن اسباب و علامات سے روح کی پیدائش ہے اس کے ہی نچوڑے ہوئے عطر سے دل کی پیدائش ہوتی ہے۔

حلقہ بگوش بن کے درِ دل پہ بیٹھئے اِس در سے بڑھ کے اور کوئی آستاں نہیں

اس کی اس قدر وحشت اور پریشانی۔ اتنی بلند خیالی۔ اور اس قدر پستی اعتراض کے قابل نہیں ہے۔ اس لئے کہ جس دام میں مبتلا ہے وہ اس سے مجنونانہ حرکتیں سرزد ہونیکا کافی ذریعہ ہے۔ جسم اور شبابت جسم کی وجہ سے اس میں کوئی خاص صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ جیسے اس کی ذات فنا و بقا کی

ری ہے۔ ویسے ہی اس کا عارضہ بھی قدیم ہے۔ جیسے اس کا عدم ناممکن
الوقوع ہے اسی طرح اس کا عارضہ جانا بھی محال ہے۔ اس کے جسم کی طیاری
نوئے اس بقعہ سے ہوئی ہے جو کسی وقت ذات وصفات کے جھگڑوں سے
بری تھا۔ کز نیستان تا مرا ببریدہ اند۔ یہ جب اپنی ہستی کو یاد کرتا ہے اس کو
رونا آجاتا ہے ؎

یار من باکمال رعنائی خود تماشا و خود تماشائی

جب اس کو اپنی شان کے انتشار میں اپنا عروج دکھائی دیتا ہے خوش
ہوجاتا ہے۔ کوئی وقت اس پر تنزل کا بھی آجاتا ہے۔ جس وقت وہ جسم کے سینکڑوں
حجابوں میں گھر کر غیریت کے خار اشگاف تیروں کا شکار ہوتا ہے۔ اور گھبرا کر
اپنی حقیقت کو ڈھونڈتا ہے۔ پھر جس طرف منہ اٹھاتا ہے اپنی ہی حقیقت
دیکھتا ہے جس طرف خیال دوڑاتا ہے وجہ اُمید کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔
مگر ہر ہر روش پر ہزاروں بندشیں ہیں۔ ہر ہر مکان پر سینکڑوں پہرہ دار۔ چاہتا ہے
کہ ان سب میں جا ملوں۔ مگر پردہ شرم وحیا جو اسرار کی صورتیں قائم کئے ہوئے
سدراہ ہے اس کو روک دیتا ہے۔ کہیں بیتاب ہو کر بے تحاشا گرنیکا اراد کرلیتا
ہے۔ اور تیکھی نظریں اس کو جھڑک کے ہٹا دیتی ہیں۔ غیریت سے بدگمان ہوجاتا۔
اس کی جان پر بجلی گرا دیتا ہے۔ اور جو جو اس کی زبان پر آتا ہے اس بحران میں
بکتا چلا جاتا ہے۔ جس کا نام لوگوں نے شاعری رکھ لیا ہے۔ اس کی بنیاد
عالم ارواح سے بہت اونچی ہے۔ میں غلطی سے اس کو نور لکھ گیا ہوں۔
ورنہ ظلمت و نور کے وجود کی کسی کو خبر بھی نہ تھی جس وقت یہ تندیلی عالم کا مرکز
بنایا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقت ربانی کا پہلا عکس جو کہیں پڑا ہے
اس کا حصہ لم یزال حقیقت کے نور و ظلمات سے بری کرلیا گیا تھا۔ اول اس عناصر

کا پتلا ہے۔ ارباب ازل کی بنیاد کا قوام اس ہی کے خمیر سے رکھا گیا۔ پھر اس کو محبت کے پانی میں گوندا گیا۔ اور عشق کے رنگ سے رنگ کر افراد عالم پر تقسیم کر دیا گیا۔ جس کا ظہور متفرق صورتوں میں آج دیکھا جاتا ہے۔ وصل و فراق کی داستانیں گوشہ گوشہ سے اس دیوانہ کی شہادتیں دیتی ہیں۔ اور شکایتوں سے لبریز ہر سر کوچہ و بازار میں نالاں و غزلخواں پھرتا ہے۔ یہ سوتوں کو جگاتا ہے۔ جاگتوں کو ہوشیار بناتا ہے۔ اور سکھاتا ہے کہ غافل تو جس کام کے لئے یہاں آیا ہے اس کو ڈھونڈ نکال جن آلام میں مبتلا ہے وہ تیرا مقصوم نہیں ہونا چاہیئے۔ میٹھی نیند کے سونیوالے جب ہوشیار نہیں ہوتے۔ تو یہ کلیجہ میں چٹکیاں لیتا ہے گدگداتا ہے۔ طرح طرح کے فریب دیکر اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ جو چست و چالاک اس کے قدم بقدم چل نکلتے ہیں اُن کو کامیابی کا رتبہ ہاتھ آجاتا ہے۔ جو کھڑے ہو کر سنبھلکر پھر خمار میں کھڑے سے گر پڑتے ہیں ان کے حال زار پر روتا ہے۔ اور پھر دوبارہ کوشش کرتا ہے کہ شاید ان میں جان آجائے کچھ سست قدم آگے بڑھکر بیہوش ہوجاتے ہیں ان کو سرِراہ جھڑکتا ہے پٹکتا ہے اور منزل بمنزل تباہ و برباد کرکے کارواں سرائے کے دروازہ تک پہنچا دیتا ہے۔ غرض یہ کہ اس کی بارگاہ بہت عالی ہے اور خدا اس ہی بارگاہ پر سب پہلے شاعروں کا پھر عشاق کا خاتمہ کرے۔ آمین۔

(ایڈیٹر)

عالم سے یہ کوہ و پست میں بالا ہوں — یہ پھول ہیں شب چراغ میں لالا ہوں
لیکن مری شامت ہے یہ ہیں سرسبز — میں غفلت و نادانی سے کالا کالا ہوں
گل جنبش پرکار کا شیدائی ہے — سبزہ نے مہر حسن کی یوں پائی ہے
نا امیدی میں اس کی بو آتی ہے — کیا جنبش ترچھی لب ہرجائی ہے

دو رستے

نوروز کی رات تھی۔ ایک معمر شخص کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی حسرت بھری آنکھیں گہرے نیلگوں آسمان کی طرف اٹھائیں جس میں ستارے سفید کنول کے پھولوں کی طرح چمک رہے تھے جو کسی صاف۔ ساکن جھیل کی سطح پر تیر رہے ہوں۔

پھر اس نے اپنی نگاہ زمین پر ڈالی جہاں مرد اور عورتیں (آہ! ان میں سے تو کوئی بھی ایسا نا امید اور بدنصیب معلوم نہیں ہوتا تھا جیسا کہ وہ) اپنے یقینی انجام قبر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ اس انجام کو لیجانیوالی شاہراہ کی بہت سی منزلیں طے کرچکا تھا۔ اور افسوس! اس سفر سے اسے سوائے غلطیوں اور دست حسرت ملنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس کی صحت خراب ہوچکی تھی۔ اس کا دماغ پراگندہ تھا۔ اس کا دل غم و اندوہ سے بھرا تھا۔ اور اس کا بڑھاپا آرام سے عاری تھا۔

جوانی کے دن عالم خواب کے واقعات کیطرح اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور اس نے وہ مقدس وقت یاد کیا جب اس کے باپ نے اسے زندگی کے دوراہے پر کھڑا کیا تھا۔ ایک راستہ با امن۔ روشنی والی سرزمین کو جاتا تھا جو زرخیز فصلوں سے دھنی اور نرم سُریلے میٹھے راگوں کی آواز سے گونجتی تھی۔ دوسرا راستہ گمراہ مسافر کو ایک گہرے اندھے تنگ و تاریک غار میں لیجاتا تھا جس سے نکلنے کا کوئی رستہ نہ تھا۔ جہاں پانی کی بجائے زہر بہتا تھا۔ اور اژدہے رینگتے اور فراٹے بھرتے تھے۔ اس نے آسمان کیطرف دیکھا اور اپنی تکلیف میں چلاکر بولا۔ اے جوانی

پھر آ۔ اے میرے باپ ایک دفعہ پھر مجھے زندگی کے اسی دوراہے پر کھڑا کر تاکہ میں اچھا رستہ پسند کروں!"

لیکن جوانی کے دن گذر چکے تھے۔ اور اس کے باپ کی زندگی ختم ہو چکی اس نے اپنے سامنے دیکھا کہ پریشان روشنیاں تاریک دلدلوں پر چمکتی ہیں اور پھر غائب ہو جاتی ہیں۔ ایک ستارہ آسمان سے ٹوٹا اور ہوا کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اس نے سوچا "یہ میری مثال ہے" اس خیال کے دماغ میں گذرتے ہی لاحاصل بے سود حسرتوں کے تیروں نے اس کے دل کو چھلنی کر دیا۔ تب اسے بچپن کے ہمجولی یاد آئے۔ جو شاہراہ زندگی پر اس کے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے۔ لیکن جو نیکی اور محنت کے رستے طے کر کے آج اس وقت نوروز کی رات کو ممتاز اور خوش تھے۔ اتنے میں گرجے کی بلند مینار کی گھڑی نے گھنٹہ بجایا۔ یہ آواز اس کے کان میں پڑی اور اس کے شفیق والدین کی محبت کو اپنے بدقسمت لڑکے کے لئے اور ان نصیحتوں کو جو انھوں نے اسے سکھائی تھیں اور ان دعاؤں کو جو اس کے لئے مانگی گئی تھیں یاد دلا دیا۔ اب شرم اور رنج سے بیتاب ہو کر وہ آسمان کی طرف (جہاں اب اس کا باپ رہتا تھا) اور نہ دیکھ سکا۔ اس کی تاریک آنکھوں نے آنسوؤں کا مینہ برسانا شروع کیا۔ اور ایک مایوسانہ کوشش سے گھبرا کر اور چلا کر بولا۔

"پھر آ۔ بیا اے میری جوانی۔ لوٹ آ۔ اے میرے ایام گذشتہ واپس آجاؤ!"

اور اس کی جوانی لوٹ آئی۔ اس کے گذرے ہوئے دن پھر آگئے۔ کیونکہ یہ سب ایک خواب تھا۔ جو اس نے نوروز کی رات کو دیکھا تھا۔ وہ ابھی نوجوان تھا اور قصور اس کے واقعی تھے۔ وہ جاگا اور خداوند تعالےٰ کا پرجوش

ہجے میں صدق دل سے شکریہ ادا کیا۔ کہ ابھی وقت پر اس کا اختیار ہے اور ابھی وہ اس تاریک اور گہرے غار میں گر نہیں پڑا تھا جہاں پہنچکر نکلنا دشوار ہے۔ بلکہ وہ حقیقی خوشیوں۔ سچی مسرتوں کے لہلہاتے اور سرسبز و شاداب باغ کو جانے والے راستہ پر چلنے کے لئے آزاد تھا۔

اے لوگو! تم جو ابھی زندگی کی دہلیز پر قدم رکھے ہوئے تامل کر رہے ہو کہ کونسا راستہ اختیار کریں سمجھ لو کہ جب دن گذر جائیں گے۔ اور تمہارے قدم سیاہ پہاڑوں کے ساتھ ٹھوکریں کھائیں گے۔ تم بھی غایت تکلیف سے چلاؤ گے :-

اے جوانی پھر آ۔ اے میرے ایام گذشتہ واپس آجاؤ"

(ترجمہ از انگریزی)

محمد افضل خان

(جناب حکیم سید سلیم صاحب)

ہے مبارک نزع کی ساعت بھی مجھ ناشاد کی	بارک اللہ لنا اس بت نے میری یاد کی
انکی زلفیں بڑھ چلیں جوش جنوں پیدا ہوا	ان کے قیدی بڑھ چلے قسمت کھلی حداد کی
قامت زیبا کو ہے یارگراں لغوں کی چال	جان انجمن میں پڑی ہے سرو سی آزاد کی
تن کے اٹھا تن کے لیں چین جبیں سے برچھیاں	بل کبھی آئے کبھی تیوری چڑھی جلاد کی
آپ کا وعدہ کبھی پورا ہوا ہو گا ضرور	آرزو پوری ہوئی ہو کی کسی ناشاد کی
شیشۂ لب شکستہ ہوں مجھ میں صدا آتی نہیں	دردمند عشق ہوں عادت نہیں فریاد کی
جب ذرا پہلو کو بدلا ٹیس سینہ میں اٹھی	آنکھ جب کھولی دہان زخم نے فریاد کی
گرد مجنوں کے پھرے برسوں بیاباں میں سلیم	ناقۂ لیلیٰ کے آگے مدتوں فریاد کی

تنقید کلام

کمالِ شاعری

اصناف سخن کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں نسیم کی طبع موزوں نے جوہر کمال نہ دکھائے ہوں۔ فن تضمین میں وہ خاص طور پر ید طولےٰ رکھتے تھے۔ اس حسن سے گرہ کا مصرع دست و گلو کرتے تھے۔ کہ مضمون شعر اپنا ہو جاتا تھا۔ اور لبسا اوقات غزل کی غزل کھل اٹھتی تھی۔ لیکن صنف خاص جس میں ندرت فکر نے لطافت زبان اور رعایت الفاظ کی رنگا رنگی میں مطالب و معانی کے دریا بہائے ہیں وہ نسیم کے مرثیہ ہیں۔ اور یہی شاعری کی مشکل شاخ ہے۔ اس وادی پرخار میں وہ شیریں اور پرلطف چشمے اور آبشار جاری کئے ہیں کہ اُن کا ہلکا ترنم اور شوخ رنگ عجیب وجدانی کیفیت پیدا کرتا ہے سنگلاخ زمین میں وہ بوقلموں گلہائے تر و تازہ اُگائے ہیں کہ جن کی بھینی بھینی خوشبو مشام جان کو تراوت بخشتی ہے۔ خارستان سے گلہائے معانی کو اس کمال میں ہم رشتہ کر کے گلدستہ کی صورت میں ترتیب دیتے تھے۔ کہ ہر مذاق سلیم کی میز کی زینت ہیں۔

آپ مرثیہ گوئی میں میر خورشید علی صاحب نفیس لکھنوی مرحوم مغفور سے تلمذ کرتے تھے۔ میر صاحب مرحوم بھی اپنی خاندانی اصلاح سے مرثیہ کو مزین فرماتے تھے۔ ہر مرثیہ میں صدہا مقامات پر تحسین و آفرین کے جملے اور متعدد صاد لکھے ہوتے تھے۔ اس سے ان کے کلام کی پختگی اور قدرت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ مراثی دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ مرحوم میر صاحب کی تقلید میں کس قدر کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے متعدد مراثی

سلام۔ اور دیگر اصناف سخن پر ایک جداگانہ مبسوط مضمون کی ضرورت ہے اس مختصر مضمون میں صرف ان کی چند غزلیات پر تنقیدانہ رنگ میں ریویو کرتا ہوں

انداز خاص

نسیم کے کلام میں درد کی ایک خاص کیفیت ہے۔ جو میر درد۔ سوز۔ غالب اور میر تقی کے زار نالوں کی لذت بخشتی ہے۔ ملاحظہ ہو

کہیں دم اٹک کے ہائے کہیں دل پھڑک رہا ہے ۔۔۔ یہ مزے کہاں تھے خنجر اگر آ بدا ہوتا

قید کرکے ہم کو یہ کیسی نیند سوئے اس طرح ۔۔۔ بن کے بجلی پھونک دے اے آہ گھر صیاد کا

حافظ و ناصر ہے اب تیرا خدا ۔۔۔ اے شب غم آج ہم تو مر چلے

نسیم کے یہاں علاوہ زبان کے رعایت الفاظی بھی کثرت سے ہے۔ اور وہ بھی ایسی با موقع استعمال ہوتی ہے۔ کہ کلام کی شان کچھ سے کچھ ہو کر عجب عالم پیدا کرتی ہے۔ شعرا جب رعایت لفظی کا خیال رکھتے ہیں تو عموماً مضمون پوچ ہو جاتا ہے۔ لیکن نسیم اس طریقہ سے اپنے مطلب کو وسعت دیتے ہیں کہ شعر میں جلا آجاتی ہے۔ کمال کا حال تو جب معلوم ہو کہ دیوان کا دیوان دیکھ جائیے آورد کا کہیں نام نہیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی طبع موزوں ایک دریائے ذخار ہے جو نہایت آزادی کے ساتھ مستانہ انداز سے لہریں لیتا امڈا چلا آتا ہے۔ یہ مضمون بالتفصیل بیان کئے جانے کے قابل تھا۔ مگر طوالت کے خوف سے بالفعل معذور ہوں۔ اور نمونہ کلام پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو ؎

وہ پھر اس شوخ نے ترچھی نظر سے سوئے دل دیکھا

وہ مارا تیر پھر ابروئے قاتل نے کماں ہو کر

ملاحظہ ہو تخیل کس قدر انوکھا ہے اور واقعات سے کس درجہ دست و گریباں ہے ؎

رقیبوں کے تصور میں میرے گھر چلے آئے ۔۔۔ دکھایا زور قسمت نے نصیب دشمناں ہو کر

"نصیب دشمناں" کا استعمال ہر چند سادہ ہے۔ مگر غضب ڈھا رہا ہے
جدت خیال ملاحظہ ہو ؎
زلف شبگوں کے تصور نے جو دل آگھیرا کٹ گئی رشک کے مارے شب فرقت میری
محاورہ کس قدر بیساختہ ہے ؎
ہاتھ رکھو تو مرے سر پہ قسم تو کھاؤ تم نے غیروں میں نہیں کی ہے شکایت میری
اگرچہ نسیم مرحوم کا رنگ فصیح الملک کا رنگ تھا مگر قادر الکلامی ملاحظہ ہو
کہ لکھنؤ کے رنگ میں بھی خوب شوخ نکلے۔ فصیح الملک کا شعر ہے۔ اہل فہم
دیکھیں کہ شاگرد کو کیا رتبہ ملا ہے ؎
چڑھی نہ تربت مجنوں پہ آجتک چادر (داغ) ہم اپنا چاک گریبان لیکے جائینگے
بہار آئی سمایا سر میں پھر سودا بیاباں کا (نسیم) بندھا پھر تار چاک جیب و داماں و گریباں کا
زیارت گاہ مجنوں کا جو مجھکو طاق ثابت ہے " تو میں سہرا چڑھاؤں دھوم سے چاک گریباں کا
نزاکت میں وہ چپکے ہو گئے ہیں رکھ کے گردن پر " بنی ہے چاند تیغ فتنہ گر میرے گریباں کا
کیفیت کلام ملاحظہ ہو ؎
پھر ہو گردش آنکھ کو ہاں ساقیا تیرے صدقے پھر یونہی ساغر چلے
مضمون بالکل اچھوتا ہے ؎
پا شکستوں کا ہے تو ہی دستگیر بے ترے کیا بزم میں ساغر چلے
ایک لفظ پا شکستہ میں شعر کو معراج ہو گئی ہے۔
نسیم کے پیار میں جذبات کی مجسم تصویر ہے ؎
ہائے کیا چیز ہے محبت بھی نام پر اس کے پیار آتا ہے
شوخی مضمون کس درجہ لطیف ہے ؎
حشر میں پیش و پس ہے رحمت حق

کس کا تقصیر وار آتا ہے

نزاکت فکر ملاحظہ ہو ؎

گرمیٔ خوں سے مرے پرہیز کرنا چاہئے آنہ جائے منہ تمہارے خنجر فولاد کا

آج حسن لی ہی جو اس شوخ کے آنیکی خبر دل میں اترائی ہوئی پھرتی ہے حسرت کیسی

مہمان کے آنیکا جب اشتیاق حد سے گذر جاتا ہے۔ اور کوئی توقع نہیں رہتی اور پھر یکایک اس کی آمد سے دل کو کسی قدر امید ہو جاتی ہے تو ناامیدی حسرت کا پہلو بائے جو مایوسانہ صورت ذہن نشین کرتی ہے وہ اہل دل بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

شب فراق کے مضمون میں غیر کے قبضہ کا رشک عموماً درد کے ایک خاص پہلو سے خالی رہتا ہے۔ نسیم نے یہ کمی پوری کردی ہے ؎

دیکھوں گھٹتی ہے کہ بڑھتی ہی مصیبت میری غیر کے وصل کی شب ہے شب فرقت میری

اس شعر کی باریکیاں نہایت لطیف ہیں (۱) یعنی اگر غیر کی شب وصال جلد کٹ گئی تو مجھے تسکین ہو جائے گی۔ کہ میں ہی صرف بدنصیب نہیں ہوں (۲) کیونکہ جب اسکی شب جلد گذر جائیگی تو مانی ہوئی بات ہے کہ میری فرقت کی رات بھی جلد گذریگی اسلئے کہ ایک ہی رات کے دو واقعات ہیں ملیک واقعہ کی کمی بیشی اوقات دوسرے واقعہ پر ضرور اثر ڈالیگی۔ اس طور سے ہجر کی تکلیفیں بھی کم ہو جائیں گی

دن چھپا اور یہ دوڑی ہوئی آئی مرے گھر جیسے عاشق تو نہیں ہے شب فرقت میری

اس شعر کا انداز اور خصوص مصرعہ ثانی کا بیساختہ پن قابل دید ہے۔ شب فرقت میں بیزاری کس خوبی سے دکھاتے ہیں۔ انتہائے خوشی ہے!

سید حسن عابد جعفری آگرہ

عَذرا

صبح ہونیکو ہے اور وہ بھی گرمیوں کی۔ یوں تو ہر موسم میں یہ وقت نہایت سہانا ہوتا ہے مگر جو لطف اور دلفریبی اس وقت کو موسم گرما میں حاصل ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ بیان سے باہر ہے۔ جدھر دیکھیئے ایک نیا عالم ہے۔ ہندوستان کے غریب اور سادہ مزاج باشندے دن رات کا زیادہ حصہ موسم کی خاصیت کے اعتبار سے محنت میں گذارنے کے بعد اس وقت کو ایک نعمت خیال کرتے ہیں۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ان کے لئے باغ نعیم کی نسیم سے زیادہ جانفزا ہیں۔ سچ ہے جہاں گل ہے وہاں خار ہے۔ محنت کے بعد آرام اور آرام کے بعد محنت اس دنیا کا خاصہ ہے۔ اگر بچشم غور دیکھا جائے تو روز و شب اسکی ایک نہایت روشن دلیل ہے۔ مئی اور جون کی دن بھر کی جلتی ہوئی دھوپ اور جانداروں کے جسم کو جھلس دینے والی لو کے بعد صبح کی خوشگوار خنکی اور ٹھنڈی اور تازہ ہوا کے فرحت بخش جھونکے میدانوں میں رہنے والی۔ گرمی کی ماری مخلوق کے لئے وہی اثر رکھتے ہیں جو باد بہاری خزاں دیدہ درختوں کے لئے۔ سائنس والے جو چاہیں اس کی ماہیت بتائیں۔ ہیئت والے اسے کچھ ٹھہرائیں۔ فلسفہ والے جو کچھ جی میں آئے بنکاریں مگر ہماری رائے ناقص میں تو یہ دنیا کی نیرنگی کا ایک ادنےٰ نمونہ ہے۔ آہ صبح! پیاری صبح! میں اس وقت تیرا پورا لطف اٹھانے سے قاصر ہوں۔ کیونکہ قسمت نے ایسے شہر میں لا کر ڈالدیا ہے۔ جہاں صبح کا ٹھیک مخالف وقت قابل قدر ہوتا ہے۔

شام اودھ کون نہیں جانتا۔ مگر اے صبح جو لطف تجھے قدرت کی طرف سے خاص طور پر دیا گیا ہے۔ جو امتیاز نیچر نے تجھ میں اور دوسرے اوقات میں رکھا ہے وہ کہیں بھی بغیر اپنا اثر دکھائے نہیں رہتا۔ اور پھر اس موسم میں اسوقت بستر پر پڑے پڑے باتیں بنانا تیرے قیمتی لمحوں کو بیکار کھونا ہے

پیارے ناظرین! ذرا باہر آئیے اور دیکھئے کیا سہانا سماں ہے اور کیسا اعتدال کا وقت ہے۔ نہ تو اس قدر حرارت کہ باہر آتے ہی جسم کا ہر اعضا جھلس جائے اور نہ اتنی برودت کہ ہر حصہ جم جائے سارو گرد کی چیزوں پر نظر کیجئے۔ ہر شے جو نظام عالم کا ایک حصہ ہے کس قدر سکوت کے ساتھ اپنی اپنی خوبیاں جو کہ قدرت نے اس میں ودیعت کر دی ہیں دکھارہی ہے۔ جس طرف دیکھئے ایک سکوت کا عالم ہے گویا خود ہر چیز ایک دوسرے کے دیکھنے میں اس قدر محو ہے کہ اپنے کو بھی بھولی ہوئی ہے۔ بمصداق ع۔

خود تماشا و خود تماشائی

نہ کرہ باد میں تلاطم نہ آب میں تموج۔ نہ روشنی میں حرارت نہ آبادی میں چہل پہل نہ میدانوں میں ہلچل اور اگر جانباز عشاق کو بُرا نہ معلوم ہو تو میں یہ کہونگا کہ ان کے ہر وقت چکر کھانے والے دماغ اور ہمیشہ دھڑکنے والے دل بھی اس وقت ضرور ایک سکون کے عالم میں ہوتے ہونگے۔ یا اگر اہل فلسفہ جدید اجازت دیں تو میرے خیال میں یہ وہ وقت ہے کہ اس میں زمین بھی اپنی گردش بھولجاتی ہوگی۔ اور کچھ دیر بعد اپنے کمالات پر ناز کرتی ہوئی اسی سرعت سے چلنے لگتی ہوگی۔ منتہائے نظر کو دیکھئے۔ دل اور آنکھیں اس کے ہو لیئے۔ اس کا رنگ نظر فریب اس کا سماں دلربا اس کا نظارہ فرحت بخش اور اس کا سین کچھ عجب ہی نرالا ہے۔ کہیں کہیں اکاد کا ٹمٹماتے ہوئے تارے کسی معشوق

کے پیارے چہرے کی یاد دلا رہے ہیں جس کی چنی ہوئی افشاں کسی خوش نصیب عاشق کی ناتھا پائی سے چھٹ چھٹا کر کچھ یونہی سی کہیں کہیں باقی رہگئی ہو یا یوں کہیئے کہ وہ کسی معزول بادشاہ کی پوشاک ہے جس کے سارے جواہرات ادبار کے ہاتھوں بک چکے ہوں اور ایک آدھ اتفاق سے کہیں لگا رہگیا ہو۔ اسوقت ذرا اس کے رنگ کو تو دیکھئے نہ تو گہری نیلاہٹ ہے نہ رات کی سی تاریکی بلکہ سپیدۂ صبح نے رات کی سیاہی پر غالب آکر ایک عجیب پھیکا پھیکا سا سفید رنگ کا پوڈر جو اس وقت دونوں رنگوں سے زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے پھیر دیا ہے دنیا میں سب سے پیارا رنگ جو آنکھوں کو اپنی طرف محو کر سکتا ہے سبز ہے۔ کیونکہ زرد اور سرخ رنگ وغیرہ میں شوخی اس قدر رہوتی ہے کہ ہم ان پر زیادہ دیر نہیں دیکھ سکتے۔ اور نگاہ کو کچھ دیر بعد خواہ مخواہ واپس لانا پڑتا ہے۔ اس وقت نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے سبز ہے حتی کہ بعض وہ چیزیں بھی جن کو قدرت کی طرف سے دوسرا رنگ عطا کیا گیا ہے سبز نظر آتی ہیں انکی دیکھا دیکھی اب آسمان کو بھی رشک آیا اور اس نے بھی اپنا زمردیں جامہ نکالا جس کی خوبی کو سنجاف شفق نے اور دوبالا کر دیا۔ اب جس طرف دیکھئے سبزے ہی کی حکومت ہے۔ حتیٰ کہ چادر آب رواں بھی سبز معلوم ہوتی ہے گویا ہر جانب زمرد کی ایک دو کان کھلی ہوئی ہے۔ اور دیگر جواہرات مختلف الالوان اسوقت کمیاب ہیں۔ ہری ہری گھاس پر شبنم کے قطرے کیسے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ گویا کہ مشاطۂ قدرت نے رات بھر کی عرقریزی کے بعد ہر طفل نبات کو اس کے کان میں ایک ایک موتی کا گوشوارہ ڈالکر اہل دنیا کے روبرو اپنے کمال کی نمایش کے لئے بھیجا ہے۔ (باقیدارد)

سید ابوالحسن متعلم ایم ۔ اے کلاس ۔ علیگڈھ کالج

امیر خسرو رح

خسرو غریب است و گدا افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

اس ماہ کا رسالہ حضرت خواجہ امیر خسروؒ کی تصویر سے مزین کیا جاتا ہے۔ آپ ایرانی النسل تھے۔ آپکے والد ماجد کچھ عرصہ سے ہندوستان تشریف لے آئے تھے۔ آپ کی پیدائش کا مقام ضلع ایٹہ روہیلکھنڈ ہے۔ ابتدائی زمانہ سے آپکو علوم و فنون کی طرف زیادہ اشتہا تھی۔ آپ جامع جمیع کمالات تھے۔ آزاد اور وارفتہ طبیعت پائی تھی۔ بیچین دل ملا تھا۔ انوار معارف کی بُو اکثر دماغ کو منفعل کئے رہتی تھی۔ شاہد پرستی میں طاق تھے۔ رفتہ رفتہ دہلی پہنچ گئے۔ طبیعت حاضر تھی ذکی الفہم تھے۔ آپکے اشعار نے سولہ برس کی عمر میں دہلی جیسے مقام پر اتنا فروغ پایا کہ دہلی کے کوچہ و بازار میں بچہ بچہ کی زبان پر خسرو کے اشعار جاری تھے۔ ایکدن خسرو سے کسی نے ذکر کیا کہ دہلی میں خواجہ نظام الدین صاحب محبوب الہی فروکش ہیں اور زمانہ حضرت کے دربار کی لذت سے فیضیاب ہوتا ہے۔ خسرو کا دل بھی بیچین ہو گیا اور سلطان جی صاحب کے حضور میں جا کر حلقہ ارادت قبول کر لیا۔ دن رات حاضر رہکر خدمت کرتے تھے۔ اور کسی وقت جدا نہ ہوتے تھے۔ شاہزادہ دہلی کو بھی امیر خسرو سے بہت محبت تھی مگر امیر خسرو کو سلطان جی صاحب سے فرقت کب گوارا کہ شاہزادہ کے پاس جائیں۔ شاہزادہ بھی حضور محبوب الہی کی غلامی میں داخل تھا۔ ایک مرتبہ شاہزادہ نے یہ رباعی پیش کی۔

ما بہ عشق کسیم و او بہ تو شاد   تو کہ محبوب عالمی دلشاد

اس پر سلطان جی صاحب نے حضرت امیر کو حکم دیا کہ دونوں وقت شاہزادے کے پاس حاضر ہوا کرو۔ لہذا مجبوری روزمرہ امیر خسرو شاہزادے کے پاس جانے لگے۔

ایک دن امیر خسرو شاہزادے کے پاس تھے اور حضرت محبوب الٰہی نے حالت سماع اور غایت جوش میں ایک نعلین قوال کو دیدی۔ قوال نعلین لیکر لوٹ رہے تھے اور امیر خسرو سلطان جی کی خدمت میں جارہے تھے کہ راستہ میں قوالوں نے جوتا پیش کر کے آپ سے ایک ہزار اشرفیاں قیمت مانگی۔ آپ لوٹ آئے۔ اور شاہزادے سے دو لاکھ اشرفیاں قوالوں کو دلا کر جوتا خرید لیا۔ سر پر رکھا۔ آنکھوں سے لگایا۔ اور دیوانہ وار یہ شعر پڑھتے ہوئے سلطان جی کی خدمت میں حاضر ہوئے ؎

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

عربی۔ فارسی۔ اردو۔ ہندی چاروں زبانوں میں آپ کا کلام ہے۔ اردو اور ہندی کلام افسوس کہ ضایع ہو گیا ہے۔ بعض بعض غزلیں بعض بعض اشعار آپ کے متفرق لوگوں کی زبان پر سُنے جاتے ہیں مگر فارسی کلام آپ کا ہر جگہ مانا جاتا ہے۔ آپ کو طوطی شکرستان سخن کا خطاب اساتذہ نے دیا ہے۔

جدت طبع اس قدر وسیع تھی کہ آپ نے ستار ایجاد کیا۔ گانے میں بھی آپ کو خاص کمال تھا۔ اسوقت ہندوستان میں راوا نامی ایک مشہور اور اپنے فن میں کامل گویا تھا۔ سلطان جی صاحب کے یہاں ایک مرتبہ حاضر ہوا اور بہت دیر تک گاتا رہا۔ حضور خوش ہوئے اور حکم دیا کہ خسرو کو بلاؤ جب حضرت خواجہ امیر خسرو نے حاضر ہو کر پہلے راوا کا چربا اتارا پھر اسمیں اپنی ترکیبیں لگا کر گانا شروع کیا۔ راوا دنگ ہو گیا اور حضرت امیر کے قدموں پہ گر پڑا۔

مارٹین نے سٹری آف مارٹین میں لکھا ہے۔ کہ سلطان دہلی کے دربار میں انگلستان سے ایک سوداگر آیا۔ وہ فارسی اردو عربی نجانتا تھا۔ اور یہاں انگریزی جاننے والے ناپید تھے۔ خواجہ امیر خسرو نے اس سے انگریزی زبان میں باتیں کرنی شروع کیں۔

خسرو کی سیادت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ دہلی سے باشرع شہر میں اور پھر اس زمانہ میں جب بادشاہان اسلام کا وقت تھا اور آج کی طرح پردہ کی گردن پر چھریاں چلانیوالا بھی کوئی نہ تھا حضرت امیر کسی گھر میں پردہ نہیں ہوتا تھا۔ ملا نجم الدین صباحی لکھتے ہیں کہ "خسرو بار کان نفس تعلقے ندارد۔ لہذا در خلیت وانجمن گذرگاہ یکسان ست"۔ آپ ہر گھر میں جاتے آتے تھے لڑکیاں آپسے پہیلیاں کہلواتی تھیں گیت لکھواتی تھیں آپ لکھدیتے تھے اور وہ آجتک زبان زد خلایق ہیں۔

حضرت امیر کی شہرت خاصان ہند تک محدود نہ تھی بلکہ دیہات اور دور و نزدیک کے گنوار اور گنواریاں بھی آپ کو جانتے تھے۔ آپ خوش مزاج بھی تھے عورتیں آپ کو وابستہ چھیڑتی تھیں۔ اور ہندی کے اشعار مانگتی تھیں۔ آپ کو جس طرح عربی اور فارسی کے اشعار میں وصل کرنیکا خاص ملکہ تھا۔ اسیطرح آپ فارسی اور اردو اور ہندی کو بھی وصل کر دیتے تھے کہ ایک دوسرے کی روح معلوم ہوتی تھی۔ خالق باری جو بچوں کو فارسی عربی ہندی ترکی وغیرہ لغات سکھانیکو پڑھاتے ہیں آپ ہی کی منظوم تصنیف ہے۔ حضرت محبوب الٰہی کے یہاں یہ ساون کا میلا حضرت امیر کی ہی ایجاد تھا۔ افسوس کہ خسرو کے کمالات خسرو کی ذکاوت صرف سلطان جی کے دم تک تھی جسوقت سلطان جی صاحب کا آفتاب معرفت روپوش ہوا خسرو دیوانہ ہوگئے۔ گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اور انکی بیچینی دیکھکر ملنے والوں کے کلیجوں میں نشتر لگتے تھے۔ ۲۱ روز تک اسی طرح بدحواس رہے۔ بائیسویں روز حضرت سلطان نظام الدین صاحب کے مزار پر تشریف لائے اور یہ دوہا پڑھا پھر بیہوش ہوکر زمین پر گرے اور جاں بحق تسلیم ہوئے۔

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے کہ سانجھ بھئی چہوں دیس

(ایڈیٹر)

نیرنگ زمانہ

لاتی ہے رنگ ہر دم نیرنگیٔ زمانہ — پیش نظر کرشمے رہتے ہیں اس کے کیا کیا
اک نقش بوالعجب ہے یہ عالم طلسمی — جادو بھرا ہوا ہے اس کا ہر اک تماشا
حیرت فزا ہے دیدہ اس کا ہر ایک منظر — رنگ فریب ہر دم اس کا ہر ایک جلوا
تارا بنا ہوا ہے آنکھوں کا ہر بشر کی — پنہاں نظر نظر میں ہے نور حسن اس کا
وہ دلفریبیاں ہیں اس کی ادا ادا پر — ہر دل فدا ہے صورت پر چشم دیدہ شیدا
دل سینکڑوں اڑائے آنکھیں بنا بنا کر — ہے چشم سحر فن میں جادو کسی پری کا
تصویر اس جہاں کی تصویر ہے خیالی — دھوکہ کی ایک ٹٹی ہے گویا اسکا نقشا
چالوں سے اسکی فتنے اٹھتے ہیں ہر قدم پر — رفتار ہے مقرر محشر کا اک نمونا
حیرت میں ڈالتا ہے رنگت بدل بدل کر — نیرنگی ہے اسکی ادنیٰ سا اک کرشما
ممکن نہیں نکلنا دام بلا سے اس کے — ہر رشتۂ محبت ڈالے ہوئے ہے پھندا
رکھتا ہے گردشوں میں ذرات ہر کسی کو — گرداب سے کم نہیں ہے کچھ اس کا دور دورا
لا ڈالتا ہے سب کو گرداب نیستی میں — یہ موج بحر ہستی ہے اس کا اک کنارا
بربادیاں لگی ہیں ہر سو قدم قدم پر — دشوار ہے بشر کو اس میں سنبھل کے چلنا
جو سر اٹھا رہا ہے ہوتا ہے سرنگوں وہ — یکساں نگاہ میں ہے پست و بلند اس کا
حاصل غم توام ہے اس میں ہر اک بشر کو — ملتے نہیں خوشی کا نام و نشاں بھلا
نقشہ ہے راحتوں کا تصویر رنج و غم کی — آلام نے اڑایا عیش و طرب کا خاکا
آغاز شادمانی انجام صد الم ہے — ہنسنا کوئی گھڑی کا رونا ہے عمر بھر کا
محلوں کے جو بہار پر کل خواب دیکھتے تھے — ظالم نے آج ان کو زیر زمیں سلایا

سب کو مٹا مٹا کر اکدن مٹیگا خود بھی
ہستی میں اسکی پنہاں ہے رنگ نیستی کا
بہتر یہی ہے اس سے دلکو بچائے رکھئے
اچھا نہیں ہے رونق چالوں میں اسکی آنا

طلب

از شیخ محمد دین فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین

کرے وہ مہر سے جو وفا طلب ۔ وہ ہے اپنے حق میں جفا طلب
یہ ہے ناسزا ۔ یہ ہے بیوفا ۔ رہ حق کی اس سے ہو کیا طلب؟
جو عذاب لذتِ مہر سے ۔ دل بوالہوس ہے خطا طلب ۔
کوئی باخطا بھی نہ یوں ہوا ۔ کبھی اپنے حق میں سزا طلب
ترے عزم میں تری کاہشیں ترے ضعف میں تری خواہشیں
بتِ آرزو کو جو توڑ دے ۔ نہ ہو حق سے بھی وہ خدا طلب
جسے وصل یار کا شوق ہو ۔ جسے اس سے ملنے کا ذوق ہو
کرے حق سے راہِ فنا طلب ۔ کرے دل سے آہ رسا طلب
جو بتِ ہوس کا تو رام ہے ۔ قفس نفس میں مدام ہے
ترا مدعا ہے ضررِ کبرا ۔ تری سر بسر ہے خطا طلب
یہی درد راحت جان بس ۔ یہی غم جراحت جان بس
لگے زخمِ عشق جو سینے میں ۔ نہ ہو چارہ گر سے دوا طلب
تری جا ہے منزل لامکاں ۔ ترا گھر ہے عشرت جاوداں
جو فسادِ نفس شریر سے ۔ نہ ہو حرص فتنہ فزا طلب
جو تو مر لے اپنی حیات میں ۔ تو وہ نیستی ہے ثبات میں

جو وفات قبلِ ممات ہے۔ نہیں پھر وہ جوز قضا طلب
درِ دل کو اپنے جو کھول دے۔ کوئی پردہ گر نہ ہو سامنے
تو شعاعِ مہر نگار بھی۔ ترے گھر میں آئے بلا طلب
رہِ جستجو میں ہو گم اگر۔ تو ملے نہ اپنی تجھے خبر
ترے ہوش اُڑنے کے واسطے کریں تجھ سے بال ہما طلب
گہرِ مرادِ مراقبت۔ جو حصول ہو تجھے عاقبت
کریں خار زارِ جنوں سے بس۔ ترے اشک آبلہ پا طلب
رہے دامن اس پہ جو آئے صبا۔ خضرِ قناعت و صبر کا
تو چراغِ خاطرِ بوالہوس۔ نہ ہو باوجودِ حرص و ہوا طلب
خط و خالِ صورتِ یار کا۔ تو دکھا مرقعۂ باصفا
کرے نامہ تیرے عمل کا جب کوئی تجھ سے روزِ جزا طلب
کہاں طرزِ بیدلِ بے بدل۔ کہاں فکرِ طالبِ پرخلل
نہیں پر قصورِ قمر مگر۔ جو ہو مہر سے وہ ضیا طلب

(طالب بنارسی از بمبئی)

شمعِ محفل

محفل میں کیا کہوں کہ ہوا شمع کیا مجھے
حیرت میں ڈالتا ہے ترا ماجرا مجھے
شعلہ بسر ہے بزم میں غیروں کے واسطے
میں سوچ میں پڑا ہوں کہ کیا ہو گیا تجھے
اُف کیسی تجھکو گرمیٔ محفل پسند ہے
جلنا پرائی آگ میں کیا دل پسند ہے
ہے کچھ تو ایسے سوز میں وابستگی تری
کیا دل لگی دکھاتی ہے تجھکو لگی تری
جلتی ہے کس کے واسطے کس کی چاہ ہو
کیا شے ہے بزم میں تری جس پر نگاہ ہے

لاتی ہے نور کرنے فدا کس کی چھاؤنی
خدمت میں کس کی تو ہے کھڑی ایک پاؤں

محفل میں آئی آگ لگانے کے واسطے
کیا تو بنی ہے جلنے جلانے کیواسطے

حسنِ بتاں پہ ٹوٹنے والی تو تو نہیں
مشعل جلا کے لوٹنے والی تو تو نہیں

کیا آنکھ لڑ گئی کسی دلدار سے تری
لو لگ رہی ہے آتشِ رخسار سے تری

کیوں دودِ آہ سے تجھے کیسا ہے رابطہ
ہے کس صنم کی زلفِ مسلسل سے واسطہ

سرتا بہ پا جو سوز ہے چشم پر آب ہے
چپکے سے کہہ تو کیوں تری حالت عزاب ہے

کیا دوستی ہے میرے دلِ دردمند سے
روتی ہے ملکے ایک مصیبت پسند سے

سوز و گداز کم نہیں ہوتا ترا کہیں!!
رنج اور خوشی میں تیرے لئے فرق کچھ نہیں

دنیا کے سرد و گرم کا کیا ایک حال ہے
فرحت میں ہی ملال کہیں یہ کمال ہے

دھوکہ ہی مجھکو رنج و خوشی کا خیال ہے
تو راستی پہ ہے تجھے فکرِ مآل ہے

اے شمع میرے حال پہ رونے کا کام کر
اللہ رات بھر تجھے سونا حرام ہے

غفلت کی زندگی میری تجھکو رلا گئی
سر سے لگی اک آگ تو تلووں تک آ گئی

بدلہ ہو مجھ سے اِن تری دلسوزیوں کا کیا
آ میری دردمند تجھے دل میں لوں بٹھا

(بیخود)

ہُنر

دوستو وصلِ خدا چاہو ہنر کو سیکھو
دونوں عالم میں بھلا چاہو ہنر کو سیکھو

حق کے محبوب ہوا چاہو ہنر کو سیکھو
عیش و راحت سے جیا چاہو ہنر کو سیکھو

تنگدستی کی دوا چاہو ہنر کو سیکھو
نام عالم میں کیا چاہو ہنر کو سیکھو

بے ہنر جو ہیں نہیں ان کی جہاں میں قیمت گھر میں ہر چند ہو ان لوگوں کے مال و ثروت
پاس رکھتے جو نہیں اپنے ہنر کی دولت آنکھوں میں اہل ہنر کے نہیں انکی عزت
تنگدستی کی دوا چاہو ہنر کو سیکھو
نام عالم میں کیا چاہو ہنر کو سیکھو

نام جس طرح ہنرمندوں کا روشن دیکھا اہل زر کا بھی نہ عالم میں ہوا یوں شہرا
کونسا شہر ہے جس میں نہیں انکا چرچا کونسی بزم ہے جس میں نہیں انکا قصا
تنگدستی کی دوا چاہو ہنر کو سیکھو
نام عالم میں کیا چاہو ہنر کو سیکھو

سنتے تھے جن کو زمانے میں بڑا ہی زردار جن کے گھر میں تھے زر و مال بھی بیحد و شمار
جن کو دولت نے بہت اپنی کھائی تھی بہار باعث بے ہنری ہو گئے وہ بھی بیکار
تنگدستی کی دوا چاہو ہنر کو سیکھو
نام عالم میں کیا چاہو ہنر کو سیکھو

کل وہی وہ تھی کہ ہر ایک سے لیتے تھے خراج سلطنت ہاتھ میں تھی سر پہ تھا اقبال کا تاج
رونا آتا ہے مجھے دیکھ کے حال انکا آج کر دیا بے ہنری نے انہیں بالکل محتاج
تنگدستی کی دوا چاہو ہنر کو سیکھو
نام عالم میں کیا چاہو ہنر کو سیکھو

دوستو بڑھ کے ہنر سے نہیں اک شئے بہتر جس کو حاصل نہیں یہ بات ہی کوڑا وہ بشر
جلد حاصل کرو اس چیز کو اے اہل خبر بہر انساں ہی زمانہ میں یہی اک جوہر
تنگدستی کی دوا چاہو ہنر کو سیکھو

نام عالم میں کیا چاہو ہنر کو سیکھو

خوب ہم تم کو جتا دیتے ہیں مانو کہنا ۔۔۔ خوب ہم تم کو بتا دیتے ہیں مانو کہنا

خواب غفلت سے جگا دیتے ہیں مانو کہنا ۔۔۔ قول مردوں کا سنا دیتے ہیں مانو کہنا

تنگدستی کی دوا چاہو ہنر کو سیکھو

نام عالم میں کیا چاہو ہنر کو سیکھو

معجونِ مذاق

زمانہ ہے غرض کا جس سے مطلب اسکی پیدا ہو ۔۔۔ کسی کو کیا غرض ہے کوئی مرتا ہے کہ جیتا ہو؟

گنی ہو جس کی لونڈی چہرہ شاہی جس کا بندہ ہو ۔۔۔ اسی کا سکہ بیٹھا ہو، اسی کا نام چلتا ہو

نہ اندیشہ ہو عاصی کو۔ نہ زاہد ہی کو غرّا ہو ۔۔۔ فنا ہو دوزخ و جنت اگر شرعی دہریگا ہو!

وہی انسان ہے۔ انسانیت کا جس میں شیوا ہے ۔۔۔ وہ ہندی ہو کہ ہو انگریز۔ کالا ہو کہ گورا ہو

ملیں وہ اسطرح ہم سے تو یارب اور اچھا ہے ۔۔۔ نہ چادر ہو۔ نہ مقنع ہو۔ نہ چلمن ہو نہ پردا ہو

وہ ننگی چھوڑ دے یا تنگ ہو جائے فیشن میں ۔۔۔ یہ کیا ہے؟ پاؤں میں تو بوٹ ہو سر پر منڈاسا ہو!

الٰہی طفل بن کر ہم غم دنیا سے چھٹ جائیں ۔۔۔ کھلونے جیب میں ہوں ہاتھ میں یوسف زلیخا ہو

گھڑی ہو جیب میں۔ زنجیر ہو سینہ پہ آویزاں ۔۔۔ کوئی کھٹکا نہ ہو تو وقت کی دم میں بھی بستا ہو

پھٹی ٹوپی بھی قسمت سے میسر گو نہیں سر پر ۔۔۔ مگر جی چاہتا ہے پاؤں میں فُل اسن کا جوتا ہو

کسی مس کی محبت میں قسم کھائیں تو یوں کھائیں ۔۔۔ بغل میں جام مے ہاتھوں میں قرآن ملا ہو

سگِ دنیا پہ کون ایسا بشر ہے جو نہیں مائل ۔۔۔ مناسب ہے اگر انسان کے پہلو میں کتا ہو

خدایا تو بھی میرے ساتھ روز و شب نہیں رہتا ۔۔۔ زمانے کی روش پر گرم اگر کعبہ کلیسا ہو

نہ ذوق عیش و مستی ہے۔ نہ فکر مے پرستی ہے ۔۔۔ یہاں تو آجکل یہ فکر ہے چولھے پہ ہنڈیا ہو

آل غفلت اے طالب نظر آتا ہے پیری میں
بشر کو سوجھتی ہے جب کہ جب آنکھوں سے اندھا ہو

بہار ساون کی

دکھا رہے ہیں یہ قطرے بہار ساونکی — ہے موتیوں کی لڑی یا پھوار ساون کی
سنائیں کیوں نہ خوشی باد خوار ساون کی — مچی ہوئی ہے جہاں میں پکار ساونکی
ہیں انتظار میں گلشن کے نونہال سبھی — ہزاروں نہیں امیدوار ساون کی
کسی کی کاکل شبرنگ یاد آتی ہے — گھٹائیں اٹھتی ہیں جو بار بار ساون کی
اُگے ہیں سبزے وہاں خاک اڑ رہی تھی جہاں — عجیب فضل ہے پروردگار ساونکی
تڑپ تڑپ کے نہ کیوں یاد پھر وطن کو کرے — گھٹا جو دیکھے غریب الدیار ساونکی
گذار آہ و بکا میں نہ وقت اے بلبل — بنا چمن میں کوئی یادگار ساون کی
ہے دل میں توڑ کے توبہ کو جاؤں میخانہ — دکھائے شکل جو پروردگار ساون کی

خدا کیواسطے کمبخت توڑ بھی توبہ
کہ گذری جاتی ہے صادق بہار ساونکی

تازہ غزلیں

(جناب سید سلیم صاحب ذارتی)

ہستی موہوم ہے ہستی دل ناشاد کی — نخل ماتم ہیں مگر صورت ملی شمشاد کی
بھق نے جمعیت دل کو دیا حسن سوال — عشق نے زنجیر حیرانی مجھے ارشاد کی

خون عاشق شعلۂ جوالہ ہو جوں برق طور
ہے چراغاں بزم ماتم تک رہ جلاد کی

عشق کے دامن میں ہو جائے غم آزادہ برق
کاٹ دے یارب زبان اہلِ فریاد کی

آج دیوانوں میں بھی کچھ ہوش تھا پابند عقل
بیڑیوں کا شکریہ پابوسی ہوئی حداد کی

خلوت و تنہائی زنداں میں بے شغلی نہیں
مایۂ تسکین دل آواز ہے صیاد کی

طبع مجذوبی سے شغل ماسوا کرنیکو تھا
جو بنی بگڑی عمارت جب بنی برباد کی

دل نے ہموارہ کیا صحن عبادت خانہ ورد
تہنیت سوز چراغ خانہ کی بنیاد کی

انقلاب کوہ ناموس تھا ہمیں عشق صنم
جان شیریں نذر کرنے آئے تھے فرہاد کی

دامن آوارہ میں پیوند ہو سنجاب برق
مستی جوش جنوں میں بیڑیاں فولاد کی

عالم تصدیق ہے انوار معنی کی نوید
حیثیت مرشد کی ہو صورت بنی ارشاد کی

اُن کی چوٹی میں کہیں مو باف دیکھا تھا تسلیم
ہم نے نخل طوبےٰ میں اک شاخ کی ایجاد کی

(جناب مولوی ابو الافکار میر نفیس احمد صاحب سیوانی)

شگفتہ دل مرا شوق ابوتراب میں ہے
گرفتہ جان غم محبت مآب میں ہے

یہ آب و تاب نہ خورشید و ماہتاب میں ہے
تمہارے روئے منور کی جو نقاب میں ہے

مجھے امید معافی تری جناب میں ہے
مرا گناہ بھی یارب کسی حساب میں ہے

رکھے نہ کیوں تجھے شیرینی دہن خاموش
کہ شور تیرا حسینان لاجواب میں ہے

میں ایک جام میں سرمست ہو گیا ساقی
وہ صاف نشۂ وحدت تری شراب میں ہے

دکھاؤں اس گل رعنا کو غنچۂ نرگس
کہ یہ بہار تری چشم نیم خواب میں ہے

امیر بحر ہزاروں ہیں غرق بحر فنا
ضرور تو بھی کوئی گنبد حباب میں ہے

اٹھائے اب ترے بیمار کو خدا جلدی
کہ ہو کے تجھ سے جدا سخت تر عذاب میں ہے

وہ گل شریک ہے پھولوں میں اس خوشی کے سبب — بسی ہوئی مری روحانیت گلاب میں ہے
مرے ستانے سے اے ترک بنا ہاتھ نہ کھینچ — کہ چین دل کو مرے درد و اضطراب میں ہے

یہ بحر شعر میں عاجز رواں ہیں بحر علوم
کہ نکتہ نکتہ مرا فرد انتخاب میں ہے

(از جناب حسن وارثی)

صنم کا ناز و انداز و ادا کیا — فقیر وارثی کا مدعا کیا
نہیں گیسو ترے کالی بلا کیا — نہیں ابرو ترے خنجر نما کیا
کیا خون تمنا تو نے ظالم — تجھے درکار ہے رنگ حنا کیا
وجود ذرہ ہے ہم پلۂ خور — ہماری آنکھ میں چھوٹا بڑا کیا
مرے کوئی جئے کوئی بلا سے — تمہیں پروائے جان مبتلا کیا

حسن ہم ہیں غلام شاہ وارث
ہماری رندیوں کا پوچھنا کیا

(از جناب حامد علی صاحب)

ہو اسحٰن کی بندے چار سو جب آئے بہار — ہر ایک سمت سے آنے لگے جب آئے بہار
خزاں میں ہے یہ تمنا کہ جلد آئے بہار — بہار آئی تو وحشت یہ ہے کہ جائے بہار
جو دل بہار طلب ہیں وہیں جائے بہار — خزاں کے جھونکے ہیں دیتے ہیں سجائے بہار
چمن میں نظم کے حضرت صفی کی صبا روش — دکھا رہی ہے نظر کو مرے فضائے بہار
کسی سے ملکے دل غم رسیدہ شاد ہوا — یہی تھی میری جوانی کی انتہائے بہار
غم و خوشی سے چمن بھی نہیں ہے مستثنےٰ — کبھی ہوائے خزاں ہے کبھی ہوائے بہار

چمن میں دہر کے پستی کے بعد پھر ہی عروج ہے انتہائے خزاں ہی سے ابتدائے بہار

بلیغ و ثروت محشر عزیز وار سے ہے
چمن میں نظم کے حامد یہ سب فضائے بہار

(از جناب حکیم محمد جمشید علیخاں صاحب اختر علوی)

دل کہے مجھ سے کہ ہوں عاشق دلگیر کہ تو
میں کہوں ہیں۔ تو کہے وہ بت بے پیر کہ تو

جب کہا میں نے کہ ہوں عشق میں تشہیر کہ تو
ہنس کے کس ناز سے بولا بت بے پیر کہ تو

سچ بتا دے مجھے تو اے لب لعل جاناں
دل اڑا لیتی ہے وہ زلف گرہگیر کہ تو

کس کو آتا ہے سلیقہ ستم آرائی کا
کون استاد ہے ظالم فلک پیر کہ تو

دیکھ کر حضرت یوسف کو تجھے الجھیں گے
خوبصورت ہے زیادہ تری تصویر کہ تو

عشق گیسو کو نہ چھوڑا دل ناداں تو نے
دیکھ اب ہم یہ ہوئے بستۂ زنجیر کہ تو

خستہ بیخبری ہوں کہ کلیجا میرا
دل میں بیٹھا ہوا ملتا ہے ترا تیر کہ تو

دمبدم میرا خوشامد سے وہ کہتا سرکار
بار بار آپ کی غصہ سے یہ تقریر کہ تو

شام سے غیر کے گھر تو ہوا مہمان کہ میں
صبح تک ہجر میں تڑپا کیا دلگیر کہ تو

قیس و فرہاد کو معشوق وفادار ملے
ہمکو اے یار ملا خوبی تقدیر کہ تو

ہیں یہی آبروافزائے سخن اے اختر
اکبر و ناطق و اقبال و جہانگیر کہ تو

(جناب مولوی محمد عبد الاحد صاحب شمشاد لکھنوی)

عشق میں ساماں کیا کیا چاہئے
درد ہو دل میں بس اتنا چاہئے

حاصل کونین اتنا چاہئے
درد دل میں سر میں سودا چاہئے

جلوہ ہی جلوہ ہیں یہ سارے حجاب ۔ دل مصفا چشم بینا چاہئے
عاشقی کچھ دل لگی یا کھیل ہے ۔ اس کو پتھر کا کلیجہ چاہئے
تو ہے جلوہ کس خرام ناز کا ۔ اے قیامت تجھکو دیکھا چاہئے
غیر کا جو ہو رہے کس کام کا ۔ الحذر ا دل مجھکو اپنا چاہئے
لوگ کہتے ہیں ترا شیدا مجھے ۔ تجھکو بھی کچھ پاس اس کا چاہئے
وصل کی شب کیوں نہ خوف صبح ہو ۔ عاقبت کا ہو لمیں ڈر کا چاہئے
مجھکو تڑپانا جلانا غیر کو ۔ کچھ نہ کچھ تمکو تماشا چاہئے
حسن صورت پر نہیں موقوف عشق ۔ دلبری کی طرح زیبا چاہئے

مجھکو اے شمشاد اک گلرو کی مدح
بلبلوں کو شور و غوغا چاہئے

(از جناب محمد علی سیدہ پوری)

تمہاری بیرخی نے مار ڈالا ۔ اداؤں کی کجی نے مار ڈالا
سر محفل ہنسی نے مار ڈالا ۔ تری زندہ دلی نے مار ڈالا
رہا بلبل ہوئی فصل خزاں میں ۔ غضب ہے مخلصی نے مار ڈالا
دعا کے ہیں نہ شادی مرگ کیوں ہو ۔ مجھے تو اس خوشی نے مار ڈالا
پسا جاتا ہوں دانہ کی طرح میں ۔ فلک کی کجروی نے مار ڈالا
محبت کا نتیجہ دیکھ لیجے ۔ جسے چاہا ۔ اسی نے مار ڈالا
رقابت ہے بلاء ناگہانی ۔ خیال دشمنی نے مار ڈالا
سیہ باطن نظر آتے ہیں انسان ۔ نمود ظاہری نے مار ڈالا
ستائش خود بخود کردن نہ زیبد ۔ بشر کو خودسری نے مار ڈالا

رہے گی قوم میں کب تک لڑائی نفاق باہمی نے مار ڈالا
مرا مرنے سے پہلے اے سخنور
خیال اخروی نے مار ڈالا

(از جناب طالب بنارسی اڈیٹر)

مرتبہ افتادگی سے اور برتر ہو گیا
گر کے قطرہ سیپ میں پانی سے گوہر ہو گیا

باتوں ہی باتوں میں دل سینے سے باہر ہو گیا
دو گھڑی کی جس نے دلداری وہ دلبر ہو گیا

ہتکڑی بیڑی سے آرائش بدن کی ہو گئی
اے جنوں ساماں وحشت مجکو زیور ہو گیا

سچ تو یہ ہے جی گیا مر کر عذاب ہجر سے
ساغر زہراب مجکو آب کوثر ہو گیا

جیتے جی تھا سب سے کم لیکن خدا کا شکر ہے
خاک میں جب ملگیا سب کے برابر ہو گیا

ہات سے تیرے نکل سکتا ہی تیرا حسن کب؟
تھا اثر رنگ حنا تک دست پرور ہو گیا

رات تیری یاد میں اے سرو قد بے سر
آہ کا نکلا الف جسدم صنوبر ہو گیا

شکوہ یاس رطب ہمکو کسی کچھ نہیں
شکر اس پر کرلیا جو کچھ میسر ہو گیا

میں نے لکھا نامہ میں رونا جو اپنے شوق کا
ہنستے ہنستے نامہ بر لوٹن کبوتر ہو گیا

پھانس لینے میں کسی دل کے نہیں اسکے خطر
بڑھ گیا اتنا ترا گیسو کہ خود سر ہو گیا

تیرے طالب کو ملی خدمت جنون عشق کی
شکر ہے بیکار جو بیٹھا تھا نوکر ہو گیا

علمی کتابیں

(مصنفہ مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی)

حکمت عملی فلسفۂ عمل پر مبسوط اور جامع کتاب ہے۔ اسمیں افراد انسانی کی روحانی ارتقا کی تدابیر کے ساتھ ساتھ قومی ترقی اور عزت حاصل کرنیکے اصول بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اور تہذیب اخلاق۔ تدبیر سیاست مدن کے وہ مضامین درج ہیں جو انسان کی ذات میں جوہر شرافت پیدا کرنیوالے اور اسکو زندگی کے مختلف مدارج مختلف زمانوں اور مختلف حالتوں میں اصول حکمت پر کاربند رکھنے والے ہیں عورتوں کی تعلیم اور حقوق کی نگہداشت کا ذکر بھی موقع بموقع کیا گیا ہے۔ عبارت صاف شستہ اور رواں ہے۔ قیمت ۲ / ۱ ؎

الانسان علم الانسان میں یہ پہلی کتاب لکھی گئی ہے جس سے انسان کے تمام قوا نفسانی اور جسمانی اور خصوصیات طبعی کی کیفیت اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے۔ علم الانسان اور مشاہدہ ذات کی تعریف اور کیفیت بیان کرنے کے بعد انسان کی حیوانی ساخت ارتقا۔ قدامت۔ انواع و اقسام وغیرہ کے متعلق زمانہ حال کی تحقیقات۔ احساسات اور نطق کی حقیقت حیات نفس کی کیفیت اور نفس کی تمام قوتوں کا مفصل مشرح بیان کیا ہے۔ علم اخلاق معاشرت و تمدن کا فلسفہ نہایت خوبی سے بیان کیا ہے طرز بیان نہایت دلچسپ زبان بامحاورہ و شستہ۔ علوم جدیدہ کی اصطلاحات بھی قائم کی گئی ہیں جا بجا قرآنی آیات سے استدلال کیا گیا ہے یہ کتاب علمی۔ ادبی۔ مذہبی ہر حیثیت سے قابل مطالعہ ہے قیمت ۲ / ۱ ؎

تمنائے دید قصے کے پیرایہ میں اخلاق معاشرت و تمدن کے مفید سبق سکھاتی ہیں نہایت دلچسپ قیمت ۸ /

مبادی سائنس (ترجمہ مولوی مشوق حسین خاں صاحب بی۔ اے) سے ہر مضمون کا خلاصہ ۲ /

ملنے کا پتہ منیجر رسالہ مخزن بھاٹی دروازہ لاہور

مقاصد

(۱) اردو علم ادب کی زرخیزی ترقی۔ اعلیٰ درجے کے علمی اخلاقی ادبی فلسفی مضامین اور جدید و قدیم طرز کی بہترین شاعری کے ذریعہ سے (۲) اردو داں پبلک میں اعلیٰ درجہ کے مضامین عمدہ اشعار اور نظمیں اور دلفریب افسانے لکھنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا شوق پیدا کرنا (۳) اردو فارسی مصنفوں اور شعراء کے کارناموں کے متعلق تنقیدی مضامین شائع کرنا (۴) خاص مذہبی نزاعی اور پولٹیکل مضامین کو مخزن میں جگہ نہ دی جائیگی (۵) اردو نظم و نثر میں مفید اصلاح کرنا (۶) نئے مفید خیالات اور جذبات کو اردو زبان میں داخل کرنا (۷) علوم جدید کی طرف لوگوں کو توجہ دلانا (۸) دوسری زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کو نئے سانچے میں ڈھالکر اردو میں لانا

قواعد و ضوابط

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ کی آخری یا آیندہ ماہ کی اوّل تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) ہندوستان کے اندر جن اصحاب کو رسالہ تاریخ اشاعت سے پندرہ دن کے اندر موصول نہ ہو انکی طرف سے ۲۰ دن کے اندر عدم موصولی کی شکایت دفتر میں آجانے سے رسالہ دوبارہ مفت روانہ ہوگا۔ ورنہ بصیغہ وی۔ پی جن خریداروں کو ہندوستان سے باہر مقامات میں رسالہ تاریخ اشاعت سے ایک ماہ کے اندر وصول نہ ہو۔ انکی طرف سے ڈیڑھ ماہ کے اندر دفتر میں شکایت موصول ہونے پر رسالہ مفت ورنہ قیمتاً۔

(۳) نمونہ کے پرچہ کیلئے قسم اوّل کو ۴ آنے اور قسم دوم کیلئے ۳ آنہ کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔

(۴) رسالہ وقت پر نہ پہنچنے کی بابت خریداروں کو اپنے یہاں کے ڈاکخانہ سے شکایت کرنی چاہیے کیونکہ چٹھی رسانوں کی غفلت سے غیر محصولی چیزیں اکثر منزل مقصود تک نہیں پہنچتیں

(۵) خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور درج کیا جائے جو ہر خریدار کی پتہ کی چٹ پر درج

ہوتا ہے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف ہو۔ پوست کارڈ وغیرہ کا وہ حصہ نمبر ہے جو مخزن کو دیا گیا ہے نہ کہ نمبر خریداری۔

(۴) قابل استفسار امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا چاہئے۔ ورنہ عدم جواب کی شکایت ہے

(۵) جو اصحاب ایک مرتبہ مخزن جاری کرا لیں گے۔ وہ اسوقت تک خریدار سمجھے جائینگے جبتک کہ انکی طرف سے عدم خریداری کی باضابطہ اطلاع دو ہفتہ قبل اختتام جلد سابق نہ آجائیگی۔ نیز رسالہ سال بسال انکے نام وی پی کیا جاویگا جس کا وصول کرنا ان کا فرض ہوگا

ہاف ٹون عکسی تصویریں

شائقین جلد منگائیں

علمی اور ادبی دنیا کے مشاہیر کی جو تصویریں رسالہ مخزن میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں ان میں سے اکثر ایسی ہیں جنہیں اکثر اصحاب علیحدہ علیحدہ اپنے پاس رکھنا یا فریم میں لگانا چاہتے ہیں۔ اس لئے انکی کچھ کچھ کاپیاں زاید چھپوالی گئی تھیں جو اب برائے فروخت پیشکش کیجاتی ہیں (۱) داتا گنج بخش لاہوری (۲) ظفر آخری بادشاہ دلی (۳) فوٹو اکبر (۴) دربار شاہجہاں (۵) نورجہاں بیگم (۶) نظام حیدرآباد دکن (۷) باباگورو نانک (۸) حافظ شیرازی۔ قیمت فی تصویر یک آنہ (۹) امیر خسرو (۱۰) محمد شاہ رنگیلا بیگم (درخواستیں بنام منیجر مخزن لاہور آنی چاہئیں)

اجرت اشتہارات

سالم صفحہ یکمرتبہ صر	سالم صفحہ اول یا آخر سرورق سالانہ للعہ
سالم صفحہ اندرونی سالانہ سے	نصف 〃 〃 〃
نصف صفحہ اندرونی سالانہ عہ	نصف صفحہ اول یا آخر سرورق سالانہ ہ
[illegible] ششماہی عہ	

مخزن
اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک
نثر
تصویر ڈاکٹر حکیم ایس ایس وارثی۔
عالم اسلام پر ایک نظر۔ ایس۔ ایس وارثی ۱
موت۔ منشی محمد یوسف صاحب کوکب ۸
اتفاق۔ ایڈیٹر ۱۲
شاخ نبات۔ محمد قاسم علیخاں صاحب قمر ۲۵
بدبخت ہندوستان اور مہاکال۔ قاضی مختار احمد صاحب ۳۶
چالاک لیڈر۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی ۴۹
حریت و مساوات۔ راجہ شیر علیخاں جاگیردار ۵۶
ڈاکٹر حکیم ایس ایس وارثی۔ منیجر ۶۰
نظم
حضوری۔ ایس ایس وارثی ۶۲
رباعیات۔ نیاز احمد صاحب اقبال سہارنپوری ۶۴
راز ہستی۔ مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی ۶۵
گل و بلبل۔ ملک محی الدین احمد۔ قمر ۶۸
ہلال عید۔ محمد عبدالعزیز شوق دیناگری ۶۹
تازہ غزلیں
ازجناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز ۷۱
ازجناب میر لئیق احمد صاحب عاجز ۷۱
حضرت ثاقب بدایونی
جناب حکیم سید سلیم صاحب وارثی ۷۳
دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں
کشمیر
لاہور
دہلی
آگرہ
لکھنؤ
الہ آباد
پٹنہ
کلکتہ
رنگون
کراچی
بمبئی
حیدرآباد دکن
مدراس
بنگلور
سیلون

ڈاکٹر ایس۔ ایس وارثی

نمبر ۲

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے۔ کہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب انکی مذہبی لائٹ کا کم ہوجانا ہے۔ نماز روزہ حج وزکوۃ اور ایسے ہی اکثر ارکان شرعیہ کو اگر یہ ادا کرتے رہتے تو یہ مصیبت ان پر نہ پڑتی۔ نہ یہ آلام دنیا میں مبتلا ہوتے۔ نہ ان کو یہ برے دن دیکھنے پڑتے۔ مگر ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ نماز کے زیادہ پڑھنے اور روزہ کے زیادہ رکھنے والے دنیا کے ان مکروہ سے مکروہ آلام میں مبتلا ہیں۔ جن کو ایک برے سے برے افعال کرنے والا کبھی نہیں اٹھاتا۔ اور عیش کی نیند سوتا ہے۔ آرام سے اٹھتا ہے۔

کسی کا یہ منصوبہ ہے۔ کہ پرانی روش چھوڑ دو۔ اور نئی روشنی کے اخلاق سیکھو تو دنیا میں فلاح پا سکتے ہو۔ پرانے اخلاق کا اب زمانہ خوگر نہیں رہا ہے۔ اس کو نئی آب و ہوا کی ضرورت ہے ؎

برزباں تسبیح و در دل گاؤ خر

میں فرداً فرداً کچھ حالات ان سب گروہوں کے سناتا ہوں جن سے آپ امتیاز کر سکتے ہیں کہ ان مشفقوں کے دعوے کس قدر غلط اور کس قدر صحیح ہیں۔

نمازیوں کو میں کلیتہً تو نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے کہ ان میں وہ برگزیدہ بزرگ بھی ہیں جو واقعی قابل فخر و تقلید ہیں۔ مگر اکثر کو تو ایسا دیکھا گیا ہے کہ انکی مغرور صورتیں اپنے ہمجنس مسلمان بھائیوں پر نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ان پر کفر و شرک کے فتوے چسپاں کرتے ہیں۔ عیب جوئی اور غیبت انکا شعار ہے۔ صرف اتنے سے غرور میں کہ وہ پانچ وقت کی نماز ادا کر لیتے ہیں۔ خدا کے رحم و کرم کی صفت سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں اور اس گھمنڈ میں بڑے سے بڑا گناہ اُن سے سرزد ہو جاتا ہے۔ غرور سے بڑھکر انسان کے لئے کوئی بُرا اخلاق نہیں۔ خدا جو صفات حسن کا مقبول کرنے والا ہے۔ ایک شرابی دردمند اور غمگین مغفرت خواہ انسان کے مقابلہ میں ایسے نمازی پر رحم نہیں کرسکتا۔ جو ذرخوان صفت ہو کر چند رکعتیں ادا کر لیتے ہیں اور ان پر ناز کیا کرتا ہے۔

روزہ

گرسنہ چوں میشوی سگ میشوی سخت تند و سخت بدرگ میشوی

روزہ داروں میں بھی باستثنائے چند کُل رسمی روزہ دار ہیں۔ نہ انکی زبان صاف ہے۔ نہ اُن کے دلوں میں خوف الہی۔ یہ جھوٹ بولنے۔ چالاکیاں کرنے۔ جھوٹے حلف اُٹھانے میں مطلق دریغ نہیں کرتے اخوت و محبت ان میں نام کو نہیں۔ دن بھر بھوک پیاس کے صدمے اُٹھانیکی وجہ سے ان میں چڑچڑاہٹ بڑھ جاتی ہے۔ اور بات کرنے میں کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔

حج

روپیہ پیسہ پاس تھا۔ اور کوئی مانع زیارت خدا کے گھر سے نہ تھی۔ تھوڑا سا سفر گوارا کر لیا۔ راستہ صاف ہے یہاں سے بمبئی تک ریل اور آگے سٹیمر۔ کچھ دور اونٹوں کی سواری سے شوق چرایا اور مکہ جا کر دیکھے۔ واپسی کے بعد ایک ڈگری ہاتھ آئی۔ کہ شیخ منا سے حاجی منا ہو گئے۔ وہاں سے لیکر کیا آئے۔ شقاوت

ظلم ۔ یا عیاری اور مکاری ۔

نئی روشنی

ہر بات میں جھوٹ ہر کام میں فریب ۔ مکر و دغا وغیرہ وغیرہ کا نام نئی روشنی رکھا گیا ہے ۔ کوئی جھوٹ موٹ قوم کا بہی خواہ بن گیا ہے ۔ کسی نے چندے کی فہرست کھولدی ۔ کسی نے مدرسہ کی بنیاد ڈالدی ۔ کسی نے اپنی چرب زبانی سے وعظ اور لیکچر کی بدولت روٹیاں کمانا شروع کیں ۔ ان بھلے مانسوں سے کوئی یہ تو دریافت کرے کہ خدا نے نماز کی تعلیم کیوں دلوائی ۔ روزہ کیوں رکھوایا ۔ حج میں شرکت کا کیوں حکم دیا ۔ زکوٰۃ کا طریقہ کیوں ایجاد کیا گیا ۔ نئی روشنی والوں نے ترقی کیسے کی ہے اور ان کا اصول اسقدر مقبول کیوں بنا ہے ۔ تو یہ سوا اس کے کچھ نہیں بتا سکیں گے کہ نماز واجبات سے ہے اس کا پڑھنے والا جنت میں جاتا ہے ۔ روزہ خدا کو پسند ہے ۔ حج میں گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے ۔ زکوٰۃ سے مال میں برکت ہوتی ہے ۔ نئی روشنی کی تعلیم و تہذیب سے مزاج میں آزادی آجاتی ہے ۔

اگر ہم یہ اعتراض کریں کہ ان چند حرکتوں سے جو تم نمازمیں ادا کرتے ہو خدا کو کیا فائدہ ہے ۔ ۳۰ دن بھوکا مرنے سے اللہ میاں کا مزاج کیوں خوش ہوتا ہے اس قدر دور و دراز کے سفر میں جو تم کعبہ تک کرتے ہو خدا کو کونسی منفعت ہوجاتی ہے مکاری اور عیاری سے فائدہ کیسے ہوسکتا ہے ۔ تو کچھ تو ہمیں بیوقوف سمجھیں گے ۔ اور کچھ صاف صاف الفاظ میں کافر اور بے دین بناتے نظر آئیں گے ہم ان دینداروں کی گالیاں بھی سن کر خاموش ہوجائیں اور پھر انھیں چھیڑیں ۔ کہ آپ خدا کو تو سچا سمجھتے ہیں ۔ غالباً خدا کا دعوےٰ بھی آپ کے نزدیک غلط تو نہ ہوگا ۔ آپ نے یہ بھی پڑھا اور سنا ہوگا ۔ کہ نماز پڑھنے والا فواحشات سے کوسوں دور ہوجاتا ہے خدا کا یہ دعوےٰ ہے ۔ کہ نمازی میں بیحیائی اور خدا کی دشمنی نہیں رہتی ۔ ذرا غور تو

فرمائیے یہ صفات آپ کے اندر ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو واقعی آپ نمازی ہیں اور اگر ہیں تو سمجھ لیجے کہ آپ کی نماز ایک تماشا ہے۔

روزہ اس کیفیت کا نام ہے۔ جو خواہشات نفسانی کو دور کر دے۔ آپ روزہ رکھکر ذرا اپنے قلب پر ہاتھ رکھیں کہ آیا روزہ کا کچھ نتیجہ نکلا یا نہیں۔

حج کسوٹی ایمان ہے۔ آپ کے ایمان نے واپس ہونیکے بعد کس قدر لطافت قبول کی۔ اگر وہ لطیف اور سبک ہو گیا ہے۔ تو واقعی آپ حاجی ہیں۔ ورنہ آپنے مفت زحمت اٹھائی۔

نئی روشنی کی پابندی عزت سے زندگی بسر کرنا ہے۔ آپ کو کس قدر عزت ملی۔ اور خلق اللہ آپ کی نسبت کیا کہتی ہے۔

میرے پیارے بھائیو! میں نماز روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کا مخالف نہیں ہوں مسلمان کا یہ ایمان ہے۔ اور جب تک وہ زندہ ہے خدا کے ان احکامات کا بجالانا اس کا فرض ہے۔ مگر میں اتنا ضرور دکھانا چاہتا ہوں۔ کہ اس کا نتیجہ وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ خدا نے اپنے بندوں سے جس چیز کو دور کرنا چاہا وہ کفر اور شرک تھا اور ہے۔ نبی موعود نے اسلام صرف اس تصدیق کا نام رکھا ہے کہ خدا کا بندہ سوائے خدا کے کسی کو معبود نہ مانے۔ حضرت نے صرف اس تصدیق پر۔ اسی کے اقرار پہ ابوجہل سے جنت میں داخل ہونیکا وعدہ کیا تھا۔ نہ وہ وقت نماز ادا کرنیکا تھا نہ روزہ و حج و زکوٰۃ کے ادا کرنیکا۔ اس خاص کام میں گنہگار اور عبادت گذار دونوں اس کے فضل پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

نماز کے ارکان خدا کی یاد اور اس کی محبت اور آپس کی ملت اور اخوت و محبت ہیں۔ جماعت کی نماز کو فضیلت کیوں ہے۔ اس لئے کہ سب ملکر باہمی محبت کریں۔ انکا جتھا لوگوں کو مرعوب بنادے۔ ان کے قلوب عالم کو مسخر کریں۔ اور خدا نے

واحد کی طرف بلائیں۔ شاہ و گدا میں فرق نہ رہے۔ سب ایک آن واحد میں تابعدار غلام کی طرح اپنے معبود کے روبرو گردن جھکاویں۔

روزہ اس لئے ہے کہ بھوک کی تکلیف کے خوگر ہوں۔ راحت پسند نہ ہوجاویں دوسروں کی مصیبت کی لذت ان کے دل میں پیدا ہوجائے۔ ایک دوسرے کی کفالت کرے۔ ایک دوسرے کا دردمند ہو۔ ایک دوسرے کے غم میں شرکت کرے۔

حج میں شرکت کرنیکی ضرورت یہ ہے کہ شوق اور محبت کے ساتھ طالب خدا ایک جگہ جمع ہوں۔ آپس میں ملت ہو۔ جن لوگوں سے ملنا مشکل ہے۔ وہ ایک جگہ ملجاویں۔ اور اللہ کی محبت کا شوق ایک کو دیکھکر دوسرے کے دل میں پیدا ہو۔

زکوۃ کا نتیجہ یہ ہے کہ تم میں سے وہ لوگ جو دنیا میں راحت پا رہے ہیں اپنے مجبور بھائیوں کا حصہ اپنے مال میں سمجھیں۔ ایک دوسرے کی دستگیری کرے۔ اور قوم کبھی مفلس نہ ہونے پائے۔ وہ دنیا میں سب پر سبقت کرتی رہے۔

ان سب احکامات کا ایک یہی نتیجہ نکلا۔ کہ آپس میں اخوت اور ملت ہو۔ پھر اس طرح ہو کہ خدا کی محبت اس کا واسطہ بنے۔ جس کے مجموعی منشاء الٰہی پر ہمکو انعام دیا جائے۔ غرض تمام ارکان تمہاری ہی بہبودی تمہاری ہی منفعت کے لئے ہیں۔ ان سے خدا کو کچھ بھی حاصل نہیں۔ کاش اگر تم یہ ارکان تو ادا کرتے رہے اور تمنے ان کے مغز ان کی جان انکی روح اور انکے نتیجہ یعنی اخوت۔ ملت محبت کو چھوڑ دیا۔ تو گویا تمنے نماز روزہ حج زکوۃ اور تمام آئین اسلام پر پانی پھیر دیا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ صرف رسم ادا کر رہے ہو۔ جس سے تم کسی انعام پانے کے مستحق نہیں قرار پا سکتے ہو۔

منصف ہو تو دل میں کرو انصاف

موت

اپنی ہستی کو غم و رنج و مصیبت سمجھو
موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو

اے موت! کیا تو ہی وہ ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ تلخ اور سب سے زیادہ ناگوار ہے؟ کیا تو ہی وہ ہے جس کے خیال سے بڑے بڑے سپہ سالاروں کے دل میں ہول سما جاتا ہے۔ اور بہادرانِ عالم کانپ اٹھتے ہیں؟ شاہوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں اور امیروں کا رنگ فق ہو جاتا ہے؟ ہاں ہاں اگر تو ہی ہے، تو کیوں ہے؟ شاید اس لئے کہ تو بچوں کو یتیم، عورتوں کو بیوہ، ضعیفوں کو لاوارث کر دیتی ہے۔ یا اس لئے کہ امیروں کو فقیر، بادشاہوں کو گدا، دولتمندوں کو محتاج بنا دیتی ہے۔ یا اس لئے کہ ایوان و قصور میں رہنے والوں کو گوشۂ قبر، حریر و اطلس کے ریشمی گدوں پر سونے والوں کو تختۂ خاک، کمخواب و زربفت پہننے والوں کو ٹکڑۂ کفن عطا کرتی ہے۔ یا اس لئے کہ ہمارے عیش و آرام کا خاتمہ، ہمارے حظوظ و لذائذ کا قلع قمع، ہماری تمام امیدوں کا انقطاع کر دیتی ہے۔ ہاں ہاں اگر یہی اسباب ہیں تو بیشک اے موت! دنیا میں تجھ سے زیادہ تلخ، تجھ سے زیادہ ناخوشگوار، تجھ سے زیادہ ہیبتناک، تجھ سے زیادہ بدن میں کپکپی ڈالنے والا، رنگ کا فق کر دینے والا، حواس باختہ کرنے والا دوسرا نہیں ہے۔ لیکن کیا تیرا یہ ہولناک اثر دنیا کی تمام اقوام پر یکساں ہے؟ کیا مسلمان بھی تجھ سے ویسے ہی متاثر ہیں جس طرح دنیا کی اَور اقوام یہود و نصاریٰ، ہنود و مجوس؟ اگر ہیں تو کیا درحقیقت ان کو اسی طرح متاثر ہونا بھی چاہیئے؟

بس یہی آخری سوال ہے جس کو میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اچھی طرح اور کان کھولکر

نہیں، اور ہاں اے موت! تجھکو یہ بھی سن لینا چاہیئے کہ دنیا میں تو سب کے لیے مغضوب ترین شے نہیں، بلکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو تیرا دلی خیر مقدم کرتے ہیں - اور تو ان کے لیئے اندرائن اور ایلوا کی طرح تلخ نہیں - بلکہ شہد سے زیادہ شیریں اور خوشگوار ہے -

اے موت! وہ تیرا دلی خیر مقدم کرنے والے ہم مسلمان، ہمارا بچہ بچہ ہے، ہمارے ضعفا اور از کار رفتہ نہیں بلکہ سرمست شباب اور دنیا کے کارآمد ترین نوجوان ہیں - ممکن ہے اس خیال سے کسی کو حیرت ہو اور اس کی سمجھ میں نہ آسکے - اور بیشک نہیں آسکتا - اس لیئے کہ اس کا تعلق تمدن اور معاشرت سے نہیں بلکہ مذہب اور ملت سے ہے جو دنیا کی لامذہب قوم، فدائے دین و ملت برگشتہ قوم، حشر و نشر کی منکر قوم، خود ستاں اور ہوا پرست قوم کے قیامت تک سمجھ میں نہیں آسکتا -

ہاں اے موت! تو ہمیں ناگوار کیوں ہو؟ دنیا میں ہمارے پاس کون ایوان و قصر ہیں جس کو تو خاک میں ملاتی ہے - کون زر و جواہر ہیں جس سے تو بے مال و متاع بناتی ہے، کب ہم حریر و اطلس سے آراستہ، کمخواب و زربفت سے مزین، کلاہ زرنگار سے رفیع الشان ہیں - کہ تو عریانی کا خوف دلاتی ہے - کب پلاؤ و قورمہ ملتا ہے، کب بریانی اور شیر مال میسر ہوتی ہے، کب حلوائے مستقلی سامنے آتا ہے کہ اس کا لالچ دلاتی ہے؟ ہمارے پاس کیا ہے جو تو لیگی، ہمارا کون ہے جسے تو چھڑائے گی، ہم کیا بنے ہیں جو تو بگاڑے گی :

خالی ہاتھوں آیا بندہ خالی ہاتھوں جاتا ہے
کچھ نہ لایا سنگ میں اپنے نہ کچھ لیجاتا ہے

پھر اے موت! تو ہی بتا کہ ہمیں ناگوار کیوں ہو؟ تیرے خیال سے ہمیں ہول کیوں آئے؟ ہاں اے موت تیرا یہ وہ تاریک پہلو ہے جس نے دنیا میں تہلکہ ڈال دیا ہے اور جو زمانے کا نہایت خوفناک منظر ہے - اور جس کا عالم کو عظیم ترین شکوہ ہے - لیکن ہمیں

خوف وہراس کجا ذرا گلا بھی نہیں، اور اس کے مقابلہ میں تیرا روشن پہلو ہمارے لئے ایسا خوش آیند ہے کہ جس کا خیال کر کے ہم خوشی سے اچھل پڑتے ہیں۔ اور بے ساختہ تجھ پر نثار اور تصدق ہونیکو بیقرار ہوجاتے ہیں۔ اے موت تجھے خود خبر نہیں کہ تو ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے، اور تو ہمارے لئے کس قدر قیمت کی چیز ہے؟ اگر اس کا شمہ بھی تجھے معلوم ہو تو غرور و نخوت سے چور، نشہ خود پرستی سے مخمور ہو کر زمین پر قدم نہ دھرے، اور بڑی بڑی منتوں سے، لاکھ لاکھ طرح اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی ہمارے پاس آئے۔ اچھا اے سُن، مگر دیکھ یادہ نخوت سے سرمست نہ ہوجانا، ہماری صدا پر ہمکان دھرنا، ہماری آوازوں پر لبیک کہنا، اور جب ہم بلائیں تو بے عذر چلی آنا کچھ چون وچرا نہ کرنا، ہاں اے موت! تیری بدولت ہم دنیا کے مخمصں سے چھوٹ جاتے ہیں، تکلیفوں سے نجات پاتے ہیں، یہاں ہمارے رہنے کو جھونپڑا تک نہیں ملتا وہاں ایوان وقصور ملیں گے۔ یہاں شب وروز دوسروں کی غلامی کرتے ہیں وہاں حور و غلمان جیسے ہماری غلامی کریں گے۔ یہاں ہم پھٹے پُرانے کپڑوں میں عمریں گذار دیتے ہیں۔ وہاں اعلیٰ سے اعلیٰ نئے سے نئے کپڑے ملیں گے یہاں ہمیں پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا اور ملتا بھی ہے تو بے مزہ، بے سواد، نہ ہم شراب ارغوانی سے واقف، نہ کباب طیور کے لذت آشنا، نہ کنج باغ سے فرحت اندوز نہ ساقی ماہوش کے منت کش، کہاں میوہ جات نصیب، کہاں نفکہات میسر، اور وہاں ہمارے لئے (بشرطیکہ ہم نیک بھی ہوں) یہ سب مہیا ہونگے ؎

ہم ہونگے اور عیش کا مرانی ہوگا

ہم ہونگے اور سرور جاودانی ہوگا

پھر اے موت! بتا اور خدا کے لئے بتا، تو ہمارے لئے ناگوار موت ہے، یا خوشگوار اُمید، کلید زحمت ہے یا باب راحت، قابل نفرت دشمن ہے یا قابل

الغنت دوست؟ پھر ہم مسلمانوں میں کون تیرے لئے بیقرار نہ ہوگا، کون تیرا دلی خیر مقدم نہ کرے گا۔ بس بس یہی ہمارا تیرا حقیقی ارتباط ہے، تو آج پکار کر دنیا کو سنا دے کہ اے اہل دنیا! اے ہمارے نام سے ہول کھانے والو! مسلمانوں کا خون ناحق نہ بہاؤ۔ مسلمانوں پر ناروا ظلم نہ توڑو، ان کو نہ ستاؤ۔ انکی گردنوں پر خنجر ستم نہ پھیرو۔ وہ اگر مرنے پہ آجائیں گے۔ تو آسمان و زمین ہلا دیں گے۔ دنیا کو تہ و بالا کر دیں گے پھر انھیں کوئی چیز نہیں ڈرا سکتی، ایک خوف و ہراس لانیوالی موت تھی وہ ان کی دلی آرزو اور کلید مقاصد ہے۔ پھر ڈرو، ڈرو، ایسی قوم سے ڈرو! اس قوم کو کون دبا سکتا ہے جس کا نصب العین موت، صرف موت ہو۔

منشی محمد یوسف کوکب

حسرت و افسوس

اُردو کی زندگی پر ایک نیا عارضہ

ادیب سے خوشنما پھول کا مرجھا جانا بہت ہی قابل حیرت ہے وہ ایسا ہر دلعزیز اور دلچسپ پھر کامیاب پرچہ نہ معلوم کیوں بند کر دیا گیا۔ مخزن اپنے بھائی کی بیوقت موت پر آنسو بہا کر تعزیت میں یہ شعر پیش کرتا ہے ؎

ہمنشیں دیدۂ مشتاق سے کس کو دیکھیں

تجھسا فرزانہ ادیب ہاتھ سے جب کھو بیٹھے

(ایڈیٹر)

اِتفاق

سلیم کعبہ و بتخانہ ہر دو ضوئے یکیست
مرنج بر سر بالین کافر و دیندار

کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ قیاس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مندر بہت پرانا ہے۔ اور کسی زمانہ میں بہت خوبصورت بنایا گیا ہوگا۔ اس کے بیرونی دروازہ سے کوئی خاص رونق نہیں معلوم ہوتی۔ مگر جب پجاری اس کا پھاٹک کھولتا ہے۔ تو اس کا اندرونی حصہ خاص زیب و زینت کے ساتھ آراستہ ہے۔ اس میں سانوری سلونی ایک خوبصورت سی تصویر رکھی ہوئی ہے۔ اوپر سے اس کو چاندی سونے کا زیور اس کو پہنایا گیا ہے۔ اس کے ارد گرد اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت زنانی مورتیاں کھڑی ہیں۔ ایک بہت ہی حسین تصویر اس کے پاس بٹھائی گئی ہے۔ جس نے اس کے گلے میں ایک ہاتھ ڈالدیا ہے۔ اور گویا اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس سانوریے کے ہاتھ میں ایک بانسری ہے اور وہ منہ سے اس طرح لگی ہوئی ہے۔ گویا کہ یہ بجا رہا ہے۔

پجاری پنڈت اس کے سامنے بہت ادب کے ساتھ کھڑا ہے۔ کبھی کچھ پڑھنے لگتا اور کبھی گھنٹی بجاتا ہے۔ گویا کہ اس محفل میں یہ مورت شمع ہے اور پجاری اس کا پروانہ ہے۔ پجاری کے الفاظ تو میں نہ سمجھ سکا۔ مگر اس کے اضطرار اشتیاق اور بےچینی سے میں اتنا متاثر ہوا کہ میرا دل بےچین ہوگیا۔ اور میں کھڑا ہو کر تماشا دیکھنے لگا۔ نہ معلوم میں کب تک وہاں اسی طرح محو تماشا رہتا۔ مگر عورتوں کے غول نے آکر جو مندر میں پوجا کرنے کو آئی تھیں میرے خیالات کو منتشر کردیا۔ اور میں اس جگہ سے

ہٹ آیا۔

ناظرین! یہ میری مسافرانہ لائف ہے۔ میں کل اس مندر کی سیر کر رہا تھا۔ اور آج میری خیالی دنیا اس منظر سے کوسوں دور سمجھ لو۔ اس وقت میں جس مقام پر ہوں یہ آتش پرستوں کا ملک ہے۔ جس عبادت خانے میں آپ مجھے دیکھ رہے ہیں یہ کنشت ہے۔ یہ مکان باہر سے بہت خوبصورت بنا ہوا ہے۔ لیکن اس کی دیواریں اندر باہر سے سب سیاہ ہیں۔ اس کی آرائش کے کمرے پر بھی سیاہ پردے پڑے ہوئے ہیں اور لطف یہ کہ اس وقت اسمیں مجمع بھی سیاہ پوشوں کا ہے۔ سب کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔ یہ ان کو پڑھتے اور آگ کی پرستش کرتے ہیں۔ ہر شخص کی نظر اس شعلہ پر پڑ رہی ہے۔ جو آتشکدہ کے سامنے صنوبری شکل میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ جب اس کتاب کا کوئی حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ سیاہ پوش دونوں ہاتھ باندھکر اپنا سر نیاز کسی قدر جھکا دیتے ہیں۔ اور دعائیں مانگتے ہیں۔ کبھی یاس و اُمید کی حسرتناک صداؤں سے خداوندا یا دادار کہہ اُٹھتے ہیں۔ اس خاص جملہ کے سوا اور کوئی عبارت میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لئے کہ روزمرہ پڑھتے پڑھتے کتاب کی عبارت ان کو رواں ہو گئی ہے اور عجلت کے سبب سے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ پنڈت کی رہی کیفیت مجھے پھر یاد آ گئی۔ اور اس سوزناک واقعہ نے میرے دل میں پہلے سے زیادہ سوزش پیدا کر دی۔

میری عقل میں پنڈت کے حرکات نے کسی قدر زیرکی پیدا کر دی تھی۔ اب ان آتش پرستوں کے ملک میں اور بھی زیادہ ہلچل ہو گئی۔ اور میں یہاں سے رخصت ہو کر دوسری جگہ جا پہنچا

به جام و باده که شب زنده دار میکردند

مثال کاسهٔ ما بود و ساغرت دانند

شہر کے مختلف دروازے۔ مختلف قسم کے آدمی اونچے اونچے مکانات

اور بسا ہوا شہر دیکھ رہا ہوں۔ اس کو بیت المقدس کہتے ہیں۔ شاید یہ کوئی بڑا بتخانہ گذشتہ ہوگا۔ اس میں اونچی سی تصویر رکھی ہوگی یا بہت سی آگ جلتی ہوگی۔ مگر نہیں یہ تو ایک مکان کی سطحی شکل ہے۔ نہ اس میں کوئی مورت ہے۔ نہ آگ کا نشان ہے۔ یہودی اور نصرانی اس میں آتے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھوں میں اس کا نظم ہے۔ اور قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم کے دلوں میں بھی اس کی عظمت ہے۔ یہاں کے باشندے اس کے صحن اور محراب میں عبادت کرتے ہیں۔ اور اس کی ہی محراب میں سرِ تسلیم جھکا کر اپنا خوش عقیدہ دل نذر کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ مسلمان بھی عبادت کرتے ہیں مگر ان کا شعار ان دونوں فرقوں سے علیحدہ ہے۔ وہ اس مکان سے حسنِ عقیدت تو رکھتے ہیں۔ مگر سجدہ کرتے وقت بیت المقدس کی سمت ان کا منہ نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی مسجد ہے اس کی طرف سب کا منہ ہوتا ہے۔ اور مسجد کی اس مکان کی طرف سے پشت ہے۔ جو اس بات کا ثبوت دیتی ہے۔ کہ ان کے نزدیک چاہے یہ مقام مقدس ہو مگر وہ اس کے تقیدات میں گرفتار نہیں کی گئی ہے۔

دریافت کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ یہاں سے کچھ فاصلہ پر ایک مقام ہے جس کو کعبہ کہتے ہیں۔ اور مسلمان اس کی طرف سجدہ کرتے ہیں ؎

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

کعبہ تھوڑے سے حدود کا تکونا مکان ہے۔ جو سیاہ پتھر سے بنایا گیا ہے۔ پھر اس پر سیاہ کپڑے کا غلاف پہنایا جاتا ہے۔ اس کے اندر کچھ بھی نہیں۔ ہے صرف ایک کمرہ جیسا ہے۔ خالی اور صاف ہے۔ اس کے گرداگرد ایک چہار دیواری ہے۔ جس کو حرم کہتے ہیں۔ یہ بہت وسیع حصہ ہے۔ اس کے دو حصے اس لئے

کروئے گئے ہیں۔ کہ عورتیں الگ رہیں اور مرد الگ رہیں۔ ہر شخص چاروں سمت سے کعبہ کی طرف اپنا سر خم کرتا ہے۔ کچھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر کسیقدر جھک جاتے ہیں پھر سر کو زمین پر رکھدیتے ہیں۔ کھڑے رہنے کی حالت میں بھی کچھ پڑھتے جاتے ہیں اور قیام و سجود کی حالت میں بھی اُن کی زبان چلتی رہتی ہے۔ یہ ان کی عبادت کا طریق ہے۔ وہ الفاظ جن کو وہ عبادت کے وقت ادا کرتے ہیں یا تو خدا کی تعریف میں ہوتے ہیں، یا اس کی صفات میں یا شکریہ ہیں۔ کبھی ایک شخص سب سے آگے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے پیچھے صف بصف سینکڑوں ہزاروں آدمی کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور جو حرکت وہ کرتا ہے وہی حرکت یہ سب کرنے لگتے ہیں۔

میں ان سب تماشوں کو دیکھکر دنگ ہو گیا۔ اور خیال ہوا کہ انسان ایک کیفیت اور ایک نوع کا نام ہے۔ پھر اس کی عبادت کی مختلف ترکیبیں کیوں ہیں؟ حقیقت میں یہ سب ایک نسل کے لوگ اور بنی آدم ہیں۔ اور ان میں برادرانہ اخوت ہونی چاہئے مگر صرف اِس قبلہ و کعبہ و میخانہ و کنشت کی بنیاد نے اُن کے دلوں میں اس قدر فرق ڈالدئے ہیں۔ کہ ایک دوسرے سے منہ چڑھاتا ہے۔ ایک دوسرے سے نفرت کرتا ہے۔ قریب تھا کہ میں ان سب کو اپنی سلطنت دل سے نیست و نابود کردوں اور اخلاص کے بنیادی پتھر کے افتتاح میں بسم اللہ کروں۔ کہ میرے پیغامبر عقل نے مجھے روکا۔ اور مجھ سے استدعا کی کہ تو سب سے پہلے اس کا مفہوم سمجھ لے اور تحقیقات کو وسعت کا میدان دے۔ تاکہ بنی ہوئی عمارت کی بربادی کے انتقام کی کلفت نہ گوارا کرنا پڑے ؎

چنانکہ وید ئی ایں انقلاب گردوں ست
دگرنہ سایۂ الطاف در ضمیر یک است

انسان کی پیدائش کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ذات واجب الوجود کی محبت۔ اطاعت اور اپنے

بھائیوں کی اخوت ملت میں اپنا وقت صرف کرے۔ اس کی جستجو میں اتنا مستغرق ہو کہ موت کا فرشتہ جب اُسے واپسی کا وقت دکھا دے تب چونکے۔ تاکہ اس کا استغراق اور مکافات کی مصیبتوں کو محسوس ہی نہ ہونے دے اور یہ غم کی رات جس میں اسکو امتحان کی غرض سے بھیجا گیا ہے بخیر و خوبی ایک ہی خیال میں بسر ہو جائے۔ ان تاجداران معرفت میں سے جن کے قوانین روحانی پر آج زمانہ کاربند ہے، ہندوستان کا پادشاہ روحی وہ شخص تھا۔ جس کا پیرو کار تو نے اس پنڈت کو سندر بن میں دیکھا تھا۔ اس بادشاہ کا نام کرشن تھا۔ اس کی تعلیم کے دو ہی لفظ تھے۔ اور وہ یہ کہ "ذات قدیم کے ساتھ محبت کرو۔ اور محبت کرنے والوں کی صحبت میں محبت سے رہو۔

انسان کو انسان کی ہمدردی کرنیکی ضرورت ہے۔ اخوت میں اتنے مانوس ہو کہ تمہاری نوع فرد ہو جائے۔ اور صرف اس کی ہی ذات پر خاتمہ ہو جائے۔ اسکی ترکیب یہ ہے کہ وہ ہر ذات میں موجود ہے تم ہر مظاہر میں اس کے جلوے کی کوشش کرو۔ اور علت کو اپنی ہستی سے فنا کر کے ذات میں فنا ہو جاؤ"۔

اس کے معتقدین نے اپنے محسن کے اخلاق کریمانہ کو محبت کی نظر سے دیکھا اس کے احکامات پر کاربند ہوئے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے رہے۔

رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں تاریکی چھائی۔ انھوں نے اپنی قوت روحانی کم کر دی۔ مظاہر کی صورتوں نے ان کے قلب کو چھا لیا اور مظاہر سے بجائے فائدے کے انھوں نے مظاہر پرستی شروع کر دی۔

مظاہر پرستی کا دوسرا بادشاہ زردشت تھا۔ اس بادشاہ نے ایرانی ممالک میں بڑے شان کی نبوت کی۔ اس کا طریقہ تو وہی تھا جو ہندوستان کے نبیوں نے ہندوستان میں جاری کر رکھا تھا۔ مگر اصول مختلف ہونیکی وجہ سے اس طریقہ اور اُس طریقہ میں فرق ہو گیا تھا۔ زردشت نے صفات عناصرہ میں مظاہر پرستی کا

ان سب کی پرستش پر ایک خاص مقدار سے اندازہ کر لیا تھا۔ آفتاب پرستی۔ دریا پرستی اور مخزن پرستی یا آتش پرستی ان چار عناصر پر وحدت کے کلیہ کو ختم کیا تھا۔ اس مجاہدہ میں وہ جس قدر کامیاب تھا وہ تو خدا کو ہی علم ہے۔ مگر اس کی تدبیر سے اس کے متقدین کو کیا فائدہ پہنچا۔ آجتک کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ ان کے سوا عرب عجم اور ہندوستان میں غیر متناہی عساکرہ گذرے جن کے ذاتی حالات وہی تھے۔ جن کو عقل سلیم مانتی ہے۔ مگر ان کے پیرو کاروں نے اس تعلیم سے سوائے مظاہر پرستی کے اور کچھ حاصل نہیں کیا۔ چند روزہ غفلت کے بعد جب زمانہ کو ضلالت نے گھیر لیا۔ قدرت نے دوسرے بادشاہ کو ان پر مامور کیا۔ اس کا نام موسیٰ تھا۔

اس بادشاہ نے اپنی مصلحت کی وجہ سے قانون مظاہر پر کو مسترد کر دیا۔ اور قوم کو اس سے پہلی تعلیم کے زندہ کرنے کے لئے ایک بساط پر جمع کیا۔ اور اس بساط کا مرجع خود بنا۔ عالم نے اس کی طرف رجوع کیا۔ مظاہر پرستی سے توبہ کی۔ اور اپنی منزل سنوارنے لگے۔ اس کی مفارقت کے بعد مرجوعہ نے اپنے راجع پر ہی خوض شروع کر دیا۔ اور اس کو اس قدر اعتدال سے بڑھایا کہ مظاہر پرستی کی کیفیت پہلے سے زیادہ بدتر ہو گئی۔

انتظام مملکت روحانی تیسرے بادشاہ کی عنان حکومت میں آیا۔ لوگوں نے اس کو عیسیٰ کا لقب دیا۔ اس نے اپنی سلطنت اور احکامات میں کچھ اضافہ نہیں کیا بلکہ موسیٰ کے مسترد احکامات میں دوبارہ جان ڈالنی چاہی۔ کہ اتفاقاً اس کو اہل دنیا کے ناقدردان ہاتھوں نے اذیت دیکر اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔ اور قوم پھر اپنی جہالت کی طرف رجوع ہو گئی۔ بعض بعض کو اس مقدس سے خلوص ہو گیا تھا۔ انھوں نے اپنے خلوص میں اس معصوم کی ہدایت کے ساتھ ساتھ اس کا وقار اتنا بڑھایا کہ ذات باری تعالیٰ میں شامل کر دیا۔

اسوقت جہان میں وہ اندھیرا تھا کہ ہاتھ سے ہاتھ سوجھنا دشوار تھا۔ پہلے صنعت کا ٹوٹنا تو درکنار جس کا جو دل چاہتا تھا کرتا تھا۔ نہ کسی پیغامبر کی تعلیم اُن کے دلوں میں جاگزین تھی نہ کسی قانون کے وہ پابند تھے۔

آخر حکمت ربانی نے اپنے انوار قوی سے جس جسم کو تاک کر نازل کیا وہ ہاشمی مطلبی مکی مدنی خلیفۃ اللہ الاکبر کی ذات بابرکات تھی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے ابھارنے میں نفع سے زیادہ نقصان دیکھا۔ مظاہر پرستی کو یک قلم توڑ دیا۔ اور اسی کو وجہ خرابی سمجھکر اس کے خلاف سخت سے سخت احکامات نازل کئے۔ مظاہر پرستی کو کفر کر دکھایا۔ مرجع ذات سے قطعاً انکار کیا۔ اور صاف کہدیا کہ انسان خدا کا بندہ ہے انسان کو خدا کی ہی ذات مطلوب ہے۔ خدا مظاہر سے ساز باز رکھتا ہے۔ نہ مظاہر اس کی ملت کا ذریعہ ہیں نہ وہ کسی مرجع خاص میں ہے نہ رجعت اس کی صفات میں ممکن ہے۔ وہ سب میں ہے مگر اس ہی طرح جیسے تمہاری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ کائنات ہستی کا نظام اسکی مٹھی میں ہے۔ اور ہستی کی کل اس کے ہاتھ میں ہے۔ مگر اس کے انوار اس نور فانی سے وہ لگاؤ نہیں رکھتے کہ تم ان سفلیات سے اس کو حاصل کر لو۔ صرف خشوع خضوع اور محبت اس کی طرف تمہیں لیجا سکتی ہے۔ تم اس کے ساتھ بے لاگ محبت کرو۔ اس کی صفات تمہاری محبت کا کافی ذریعہ ہیں۔ میں بھی اس کا بندہ ہوں اور بھیجا ہوا بندہ ہوں اور تم دونوں اس کی محبت۔ اطاعت اور آپس کی ملت اور نظام عالم کی درستی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ نظام عالم کے لئے جن اخلاق کی ضرورت ہے انکو پیدا کرو۔ محبت الہی کے لئے جو دل چاہیئے وہ دل بناؤ۔ اس کی بے نیازی اس کا استغنا اس کی رحمت دل سے فراموش نہ ہونے دو۔ اور اس ہی عالم میں دنیا سے چلے جاؤ۔ اس عالم ناپائدار میں رہکر اس سے دل نہ لگاؤ۔ ورنہ یہ تمہارا وابح الہی تم اپنے آپ کو مسافروں کی طرح رکھو۔ مسافرانہ زندگی بسر کرو۔ راحت ملے تو اس کا

شکر کرو۔ مگر راحت کے جویاں نہ ہو۔

احتیاط کے لئے مظاہر یہ کی صورتوں کو نیست و نابود کر دیا۔ انکو عالم خیال کو دلوں سے محو کر دیا۔ بت پرستی تو دور کنار بیت المقدس کی سمت سجدہ کرنے میں مظاہریت کی بو آتی تھی پہلے اس کی طرف سے کعبہ کی طرف رجوع کیا۔ پھر اس میں بھی کسی قدر شبہ ہوا تو چاروں طرف اس مقیاس کو تقسیم کر دیا۔ اور کہدیا کہ مغرب والے مشرق کی طرف اور مشرق والے مغرب کی طرف جنوب والے شمال کی طرف اور شمال والے جنوب کیطرف سر جھکائیں چونکہ قانون عام تھا۔ اور کعبہ شہر میں واقع تھا اندیشہ ہوا کہ کہیں سمت وہ جاکر مظاہر یہ نہ ہو جائے۔ لہذا اپنی سکونت مکہ سے ترک کر دی اور خدا کے گھر میں شرکت کا نام ونشان نہ چھوڑا۔

• صدیوں اہل عالم نے اس برگزیدہ کے احکامات سے اخلاق سیکھا۔ روحانیت کی تعلیم پائی۔ زمانہ کو اپنی سطوت و جبروت سے ہلایا۔ اس ہادی کے متبعین کا نام مسلمان رکھا گیا۔ صدق و صفا۔ مجاہدہ۔ روحانیت۔ تقین۔ صفات جرأت۔ خوش معاملگی۔ کسب کمال علم۔ آئین میں انکو وہ دستگاہیں ہوئیں جن کو زمانہ یاد کرتا ہے۔ اور قیامت تک یاد کرے گا۔

اسلام آج بھی ویسا ہی اچھوتا ہے جیسا ابتدا میں تھا۔ تعلیم کے وہی الفاظ موجود ہیں۔ قانون کی کتابوں میں قوم نے کوئی ترمیم نہیں کی۔ اس کو جانتے بھی ہیں مانتے بھی ہیں۔ اس پر جان قربان کرنیکو بھی طیار ہیں۔ مگر افسوس کہ عملی حالت انکی بھی پہلی قوموں سے کچھ کم نہیں۔ غفلت اور تن دہی میں یہ اوروں سے سوا ہیں۔ یہ کہنا بالکل مبالغہ نہیں ہے کہ مظاہر پرستی انمیں بھی شروع ہو گئی ہے۔ تصوف جو آئینہ جمال کلی ہے اس کے ظاہر و باطن میں اس لئے فرق نظر آتا ہے کہ حال قال کا فرق اس کا حجاب بنجاتا ہے اور اسی فرق کی بدولت اس کی ظاہری مینیں

مظاہر پرستی ہو جاتی ہیں۔ تمام قوموں نے اسی میں آکر دہوکا کھایا ہے۔
کچھ زمانہ قبل مسلمانوں میں اس تکمیل کی طرف صرف خاصان معرفت کو احساس ہوتا تھا۔ اور وہ اپنی تحقیقات کو اوّل تو معرض بیان میں لاتے ہی نہ تھے۔ اور اگر لاتے تھے تو اس میں ایسے اشارات بھی رکھتے تھے جس سے معانی میں قوت ہو اور تعلیم میں مظاہریت نہ آوے۔ اسوقت باوجود ناقابلیت کے قالی حالت ہر شخص کی صاحب حال کی برابر ہے اور حال سب کا ابتر ہے۔ مجھے اندیشہ ہے۔ کہ شاید تھوڑی مدت تک اگر نظام کی یہی صورت رہی تو بالکل اس قوم کا بھی وہی حال ہوگا جو اس سے پہلی قوموں کا حال معلوم ہو چکا ہے۔
اگرچہ مسلمانوں میں اب بھی چند فرقہ موجود ہیں۔ ایک وہ جو مظاہریت میں بالکل مبتلا ہیں۔ دوسرے وہ کہ جو اس کے بین بین ہیں۔ تیسرے وہ کہ مظاہریت کے خوف سے روحانیت کی جانب مائل ہی نہیں اور مفہوم کلی سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔

سوامی رام تیرتھ

پنجاب کے ہونہار روحانی باخدا لوگوں میں سے میں نے اس شخص کو دیکھا یہ تعلیم یافتہ ایم۔ اے ایک بہت ذکی الطبع اور خوش خلق جوان العمر بزرگ تھے مجھے ان سے ملنے کا یوں اتفاق ہوا کہ جب انکی طبیعت نے آلام دنیاوی سے اختلاج دیکھا۔ یہ ترک دنیا کر کے پنجاب سے چلے گئے۔ اور کس کس مقام پر رہے یہ تو مجھے علم نہیں مگر ان کا قیام کچھ عرصہ تک اچھپانی میں بھی رہا۔ اچھپانی میرے مکان سے بہت قریب جگہ ہے۔ جس مقام پر سکونت کرتے تھے وہ گنگا کا دہانہ تھا۔ اکثر مجھے ان سے ملنے جلنے کا موقعہ ملتا تھا۔
سوامی جی کو حافظ اور شمس کی غزلیں اکثر ورد زبان تھیں۔ مگر تھوڑے عرصہ تک سوامی جی کو

مسلمان جانا وہ کبھی کبھی مسجد میں آکر قرآن کی تلاوت بھی کرنے لگتے تھے۔ اور اس کا مطلب لوگوں کو سمجھاتے تھے۔ کبھی وہ مندر میں بھی چلے جاتے تھے جب اُن سے کوئی پوچھتا تھا کہ آپ ہندو ہیں یا مسلمان۔ تو وہ یہ شعر پڑھ دیا کرتے تھے ؎

نہ ہندوم نہ مسلمان نہ کافرم نہ یہود
بہ حیرتم کہ سرانجام ما چہ خواہد بود

وہ گوشت گو مطلق نہیں کھاتے تھے۔ مگر مسلمان اور ہندو کسی کے یہاں کھانا کھا لینے سے ان کو عذر نہ ہوتا تھا۔ وہاں وہ تین سال تک رہے۔ مگر کسی ہندو مسلمان کو ان کا نام نہ معلوم ہوا۔ اتنا ضرور پتہ چل گیا تھا۔ کہ یہ ہندو نسل کے بزرگ ہیں۔

میں نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ مسلمانوں کے عقیدہ کے موافق کوئی منزل بغیر مسلمان ہوئے طے نہیں ہو سکتی۔ آپ کا اس قول کی نسبت کیا خیال ہے۔ فرمایا بہت سچا خیال ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ کہ بغیر ہندو ہوئے کوئی منزل طے نہیں ہو سکتی۔ اور ان دونوں خیالوں میں کچھ فرق بھی نہیں ہے۔ ہندو اور مسلمان ایک ہی چیز ہے۔ جس کے دو معنی بیوقوفی سے مستعمل ہو گئے ہیں۔ خدا کی پرستش اس کی محبت اور اس کے ملنے کی کوشش دونوں کو مقصود ہے۔ دونوں پیغمبر کی تعمیل کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے ان کو مظاہر پرستی کی تعلیم نفع کے لئے دی گئی تھی۔ وہ اس کے اہل نہیں رہے۔ صاحب تعلیم نے ان کو مظاہر پرستی سے روک دیا۔ میں اس تعلیم کا بھی قائل ہوں اور اس کے نقصان کو محسوس کر کے اس تعلیم کو اس وقت اس سے احسن سمجھتا ہوں لہذا مسلمان ہوں۔ اور چونکہ میں نے ہندو ہو کر جنم لیا ہے لہذا میں ہندو بھی ہوں۔ میں شان رسالت کو جس آنکھ سے دیکھتا ہوں ظاہری مسلمان نہیں دیکھ سکتے۔ میں ظاہری مسلمانوں کو مسلمان سمجھتا ہوں۔ جن کو میں مسلمان جانتا ہوں

ان کی کفش برداری میرا فخر ہے۔ میں مسلمان ہوں ان مسلمانوں میں اور ہندو ہوں اُن ہندوؤں میں جن کے دل میں خدا کی محبت ہے۔ میں اس وحدہٗ لاشریک کو ایک جانتا ہوں ایک مانتا ہوں۔ شرک سے نفرت کرتا ہوں۔ کفر پرست سمجھتا ہوں۔

نوشیروان جی مہتا

پارسی اس وقت ایران میں بہت کم ہیں۔ مگر قصبہ ذربائجان میں اسوقت بھی پارسیوں کی کثرت ہے۔ نوشیروان جی مہتا اس شہر کے معتمد بجاریوں میں سے ہیں۔ میری ان سے ذربائجان میں ملاقات ہوئی۔ ان کو لوگ بزرگ مانتے ہیں۔ پارسی ان کی بہت تعظیم کرتے ہیں۔ ایرانی مسلمان بھی ان کی شرافت کی عزت کرتے ہیں۔ میں اس شہر میں مسافرانہ طور پر وارد تھا۔ ایران کے پارسی مسلمانوں سے اتنی منافرت نہیں برتتے جتنے بمبئی کے پارسی۔ ایک دن میں ان کے پاس چلا گیا۔ میں نے ان سے تعلیم کی کیفیت دریافت کی۔ وہ اکثر دلائل ایسے پیش کرتے رہے جس سے واجب الوجود کی ذات ان مظاہرہ میں مقید ہو جائے۔ میں جواب دیتا رہا۔ آخر کو مجبور ہو کر انھوں نے مجھ سے کہا۔ کہ کیا کیا جاوے ہمارے نبی کی تعلیم ہی یہ ہے۔ میں نے اعتراض کیا کہ جب آپ تکمیل شرائع میں مجبور ہیں تو آپ کو کسی دوسرے دین سے تعلیم لینی چاہئے۔ انھوں نے فرمایا کہ ابو المکارم شامی سے مجھے پوشیدہ بیعت ہے اور میں اسوقت مظاہر پرستی چھوڑ چکا ہوں۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے اکثر پادریوں سے میں ملا ہوں۔ مگر روحانیت کا علم میری نظر سے کوئی آجتک نہیں گزرا

وہ صرف اتنے فقرہ پر فیصلہ کر دیتے ہیں کہ خدا کا بیٹا سولی پر چڑھ گیا۔ ہمارے گناہ کا کفارہ ہو گیا۔ یا

حقیقت موسوی پر اعتماد فضل ذات کو کافی ہے۔

مُلّا یوسف غنائی

یہ بزرگ دمشق کے رہنے والے ہیں۔ مصر میں انکا قیام تھا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے وصال کیا۔ مجھے ان کی قدمبوسی کا موقعہ ملا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ تنزل اسلام کا کیا سبب ہے۔ فرمایا کہ مسلمان مظاہر پرستی میں مبتلا ہیں۔ اور چونکہ انکا غیر اللہ کی طرف مخاطب ہونا پہلا موقعہ ہے یہ اندھا دھند اس میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر مدعی اسباب کے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ یہ ان کی ہی شامت اعمال کا نتیجہ ہے کہ انکی حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔ روحانیت فنا ہو گئی ہے اور اندھیرے میں آتے جاتے ہیں۔ شاید کوئی موقعہ ایسا ہو کہ ان کو ہوش آجاوے تب کچھ ترقی کر جاویں گے ورنہ پہلی امتوں کی طرح ان کو بھی پریشانی اٹھانا پڑے گی۔

حاجی امداد اللہ صاحب

ہندوستان کے ایک بزرگ تھے۔ جو مکہ معظمہ میں سکونت کرتے تھے۔ آپکا معمول تھا کہ عصر اور مغرب کے درمیان باب السلام کے پاس بیٹھتے تھے۔ ایک دن ایک عرب نماز پڑھ رہا تھا اور آپ مسکراتے جاتے تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ سلیم بت پرستی اور کعبہ پرستی میں صرف اتنا فرق ہے۔ کہ وہاں ایک مورت ہوتی ہے۔ اور یہاں نہیں ہے۔ مگر جن قلوب میں خدا کی محبت نہیں انکا دل خود بت ہے اور انکی نماز بت پرستی۔

میں نے عرض کیا حضور ذرا اور واضح طور پر بیان فرمائیے۔ غصہ ہو کر جواب دیا خاموش کہیں اتنی بھی بات سے سمجھاتی رہے۔ اور جلدی سے کھڑے ہو گئے۔

مولانا فضل الرحمن صاحب

بلور کے اسٹیشن سے اتر کر ایک مرتبہ میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسوقت مسجد میں نماز ہو رہی تھی۔ میں بھی جماعت میں شامل ہوا۔ نماز کے بعد میری طرف مخاطب ہوئے

اور فرمایا لڑکے کیوں آیا ہے میں نے عرض کیا حضور کی قدمبوسی کے لئے۔ آپ خفا ہوئے اور کہا کہ میں اس قابل نہیں۔ میں نے بھی جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ کہا اسی لئے حاضر ہوا ہوں کہ حضور اپنے آپ کو واجب التعظیم نہیں سمجھتے۔ مسکرا دئے اور مجھ سے کہا۔ جاؤ مسلمان ہونیکی کوشش کرو۔ میں نے عرض کیا۔ کہ الحمدللہ میں مسلمان ہوں فرمایا الہم زد فزد شرک بری چیز ہے۔ خدا خاتمہ بخیر کرے *

سرکار وخداوند مولنا حاج الحرم سیدنا وارث علی شاہ صاحب

میں حضور کی غلامی کا شرف رکھتا ہوں۔ اور مجھے یاد نہیں کتنی مرتبہ باریاب ہوا ہوں۔ آپ کا ایک جملہ ہر مرید کے ساتھ تھا۔ یعنی محبت کرو۔ اور محبت ہی میں مرجاؤ۔ محبت چیز ہے اور سب فضول ہے۔" اعلیحضرت نے مظاہر پرستی کو اس قدر ناپید کیا کہ اپنی خدمت میں کسی کو تعظیم کرتے ہوئے بیٹھنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے *

اس قدر طول طویل عبارت کے بعد میں تمام قوموں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً مخاطب کرتا ہوں کہ وہ ذرا اپنے افعال۔ اعمال۔ عبادات پر غور کی نظر ڈالا کریں کہ اس زندگی کا ثمرہ کیا ہے۔ اگر ان کے جمیع افعال کوئی نتیجہ نکال لیتے ہوں۔ تو ان کی زندگی واقعی بارآور ہے۔ اور اگر ان کی زندگی کا نتیجہ مظاہر پرستی ہی نکلتا ہو پھر مظاہر پرستی بھی وہ ہو جو گمراہی اور ضلالت میں پھنسانے والی ہے۔ تو اس سے اجتناب کریں۔ اور دنیا سے دوئی کے بُرے نام کو نیست ونابود کردیں۔ آپس میں ایسی اخوت پیدا ہو جائے۔ کہ دنیا اور دین کا نظم درست ہو خدا سے سرخرو ہوں اور مرتے وقت نیکی اور بھلائی لیکر جاویں اور خاتمہ بخیر ہونے پر خدا سے سرخرو ہوں *

ایڈیٹر

شاخ نبات

(گذشتہ سے پیوستہ)

بعض مورخ یہ بھی کہتے ہیں کہ شاخ نبات کی علاوہ خواجہ حافظ صاحب کو شیراز کے مفتی زادہ کے ساتھ کچھ دنوں تعشق رہا ہے۔ اور خصوصاً اس مفتی زادہ پر فریفتگی طبع کا قصہ امیر سلطان حسین رحمۃ اللہ علیہ نے جو امیر تیمور صاحبقران کے پوتے ہیں کتاب مجالس العشاق میں تحریر کیا ہے۔ کتاب مجالس العشاق کا اصل مسودہ واجد علیشاہ فرمانروائے لکھنؤ کے کتب خانہ میں مصنف کے ہاتھ کا لکھا چلا آتا تھا۔ اُس کی حفاظت کی اصلیت یہ تھی کہ امیر سلطان حسین رح نے اس کتاب میں بعض ائمہ اہل بیت کے حالات اور ان کے مرقع تحریر کئے تھے۔ چونکہ شاہان اودھ کا خاندان شیعی گذرا ہے اور شیعوں کا شغف عقیدت حضرات ائمہ علیہ السلام کے ساتھ جو ہے وہ ظاہر ہے۔ اس لیئے واجد علی شاہ کے دور حکومت تک یہ نسخہ نسخۂ کیمیا کی طرح محفوظ رہا۔ جب واجد علیشاہ میں سلطنت کی صلاحیت نہ رہی اور ان کے اعمال بلوہ تک میں لکھ کر ان کے حوالے کئے گئے۔ اور لکھنؤ سے کلکتہ کے مٹیا برج میں پہنچائے گئے۔ تو اُن کے تمام سامان اُلٹ پلٹ ہو گئے۔ اور اسی ہنگامہ میں مجالس العشاق کا مسودہ بھی کسی کے ہاتھ پڑ گیا۔ اور منشی نول کشور صاحب مطبع اودھ اخبار نے از راہ قدردانی مول لیا یا۔ اور چھاپ کر شایع کر دیا۔

کیا غضب کی بات ہے۔ کہ اس زمانہ کے لنگ طبع اور کج نگاہ مؤلف یا تذکرہ نویس تو اپنے خیالات کو الہام سمجھکر اپنی کتابوں میں پیش کریں۔ اور جو کچھ انکی رائے خواجہ حافظ صاحب رح کے متعلق ہو اس پر عوام سے آمنا وصدقنا کہلانا چاہیں

اور پرانے مورخین کی روایتیں بالکل غلط اور لغو ہو جائیں۔ صاحب مجالس العشاق امیر تیمور کے پوتے ہیں۔ اس لئے کچھ تعجب نہیں کہ جب امیر تیمور خواجہ حافظ صاحب سے شیراز آ کر ملے ہیں تو یہ بھی دادا جان کے ساتھ ہوں۔ اور بالفرض ساتھ نہوں یا اسوقت تک پیدا بھی نہوں۔ تو بھی اِن کا کہنا سب سے مستند ہوگا۔ کیونکہ ان سے زیادہ اور کوئی تذکرہ نویس خواجہ حافظ صاحب کے عہد کے قریب نہیں گذرا ہے اور امیر تیمور کا خود شیراز پہنچکر خواجہ صاحب سے ملنا اور دونوں صاحبوں کی آپس میں میٹھی میٹھی باتیں کرنا تو مشہور ہے۔ چنانچہ اسی موقعہ کا یہ لطیفہ عوام کی زبان پر ہے۔ کہ خواجہ صاحب سے امیر نے ہنسکر کہا "کیوں حافظ صاحب آپ بخارا اور سمرقند کو جو میرا اور میرے بڑوں کا وطن ہے۔ ایک معشوق کے خال رخسار کے بدلے میں لٹے دیتے ہیں" تو اس پر خواجہ حافظ صاحب نے کہا کہ "میں نے ایسے بڑے بڑے ملک دے ڈالے جب ہی تو ایسی لگائے محتاج بنا بیٹھا ہوں" مگر راقم سے ایک بخارا کے شریف مورخ اور محقق نے کہا کہ جب حافظ صاحب سے امیر نے یہ شکوہ کیا تو آپنے فرمایا "لوگوں نے آپ کو برہم کرنے کیلئے یہ مصرع گھڑ کر لگا دیا ہے کہ ع بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارارا" ورنہ میرا مطلع تو یوں ہے ؎

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا

بخال ہندوش بخشم دو سر قند و دو خرما را

اس لطیفہ کو سنکر امیر خوب ہنسے اور اگر سچ مچ کچھ ان کے دل میں خواجہ صاحب کی طرف سے اس مطلع کا غبار تھا تو وہ خواجہ صاحب کے اس لطیفہ نے دہو دیا۔

کیا انصاف ہے کہ دو انگریزی کے لفظ پڑھکر انسان جامہ سے باہر ہو جاوے اور ایشیا کے پہلے مورخین کی تکذیب پر کمر باندھ لے۔ ہمارے اس مبارک وقت میں خواجہ حافظ صاحب کی لائف لکھنے والے دو بزرگ ہیں۔ ایک مولوی محمد اسلم

صاحب جیراجپوری اور دوسرے مولانا شبلی صاحب نعمانی دونوں کے دونوں صاحب علم و فضل مورخ بے بدل محمڈن کالج کی بے بہا لائبریری کو کھنگالے ہوئے اور اپنے پاس بھی کتب خانہ رکھنے والے۔ مگر تعجب ہے۔ کہ اس فضل و کمال اور تحقیق و تدقیق پر ان دونوں حضرات نے خواجہ صاحب کے والد بزرگوار کا نام بھی تحقیق فرما کر نہ لکھا۔ چنانچہ مولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری اپنے تذکرہ حیات حافظ صفحہ ۹ مطبوعہ فیض عام علی گڈھ میں تحریر فرماتے ہیں "خواجہ کے والد کا نام مولانا کمال الدین تھا" ان کے برخلاف شبلی صاحب نعمانی شعر العجم حصہ دوم صفحہ ۲۱۳ مطبوعہ فیض عام علیگڈھ میں ارقام فرماتے ہیں "خواجہ صاحب کے والد کا نام بہاءالدین تھا"

ہم جیسے جاہل لوگ حیران ہیں کہ ان دونوں بزرگوں میں سے کون سے حضرت اپنی تحقیق و تفتیش میں برحق ہیں۔ اگر پہلے تاریخ اور تذکروں میں خواجہ صاحب کے والد کے نام میں اختلاف تھا تو ان حضرتین نے اس کو اپنے تذکروں میں کیوں نہ ظاہر فرمایا ہم تو ان دونوں بزرگوں کے معتقد ہیں۔ مگر عوام الناس اس کو پڑھکر یہی سمجھیں گے۔ کہ یہ لوگ صرف اپنے قلم سے ہی مورخیت اور کمال کو جتانا چاہتے ہیں۔ ورنہ تحقیق و تفتیش کا ان پر پرتو بھی نہیں پڑا۔ فی الحقیقت یہ ایک ایسی غلطی ہے جس کو دیکھکر ندانستہ آشنا قہقہہ اڑائیں گے۔ اور کہیں گے ؎

نام نیک رفتگاں ضایع مکن تا بماند نام نیکت برقرار

بہرحال ان دونوں حضرات میں سے ایک صحیح اور ایک ضرور غلط ہونگے اس بنا پر میں بھی یہ عرض کرتا ہوں کہ آدمی غرور اور تکبر کی نہ لے۔ کیونکہ آدمی آدمی ہی ہے۔ بھول چوک اس کے خمیر میں ہے۔ کیا تعجب ہے کہ ان حضرات سے جواب تک خواجہ صاحب کی ولدیت کی حقیقت کو نہیں پہونچے ہیں۔ خواجہ کے کمالات

پر بھی صحت کے ساتھ عبور نہ ہوا ہو اور خواجہ صاحب کی شاعری کے متعلق جو کچھ انہوں نے ریویو کئے ہیں وہ صحیح نہ ہوں۔ خیر اب ہم اس مغنی زادہ کے تعشق کی نسبت اتنا لکھنا چاہتے ہیں۔ کہ آپ اس پر مرتے تھے۔ اور مغنی زادہ کے کاکل پر پیچ میں آپکا دل پھنس گیا تھا۔ اتفاقاً ایک شب کو وہ آپ کا مہمان تھا۔ اور آپ نے اس کی ضیافت کے واسطے قسم قسم کے کھانے تیار کروائے تھے۔ علاوہ کھانوں کے بادۂ شیراز بھی مینا سبز میں اپنا جلوہ دے رہی تھی۔ نوجوان مغنی زادہ پے بہ پے جام اڑا رہا تھا۔ اور خواجہ صاحب اس کی تواضع میں مشغول تھے۔ جو ایک بے درد مخبر نے شاہ شجاع فرمانروائے شیراز کو خبر دی۔ کہ آپ جن حافظ صاحب کے ساتھ بڑا اعتقاد رکھتے ہیں انکا یہ حال ہے۔ کہ جب ڈھب لگتا ہے شراب اور شاہد کے ساتھ مزے اڑاتے ہیں چنانچہ اسوقت بھی ان کے تسبیح خانہ میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ اتفاقاً خواجہ صاحب کا مکان شاہی ایوان کے قریب واقع ہوا تھا۔ پادشاہ اس حملہ کو سنتے ہی بھیس بدلکر مخبر کے ساتھ ہولیا۔ اور خواجہ صاحب کے مکان میں آیا۔ کواڑ کی دراڑ میں سے جھانک کر دیکھا تو فی الواقع مغنی زادہ پی رہا تھا۔ اور خواجہ صاحب پلا رہے تھے۔ بادشاہ کو اس کے دیکھنے کی تاب نہ ہوئی اور بے اختیار اس نے یہ مصرعہ موزوں کر کے پڑھا ع حافظ قرابکش شد و مفتی پیالہ نوش۔

خواجہ نے بادشاہ کی آواز پہچان لی اور فوراً ہی جواب دیا ع "در عہد بادشاہ خطابخش جرم پوش"۔ اور ان دونوں مصرعوں کو مطلع بنا کر ایک غزل تصنیف کر دی۔ جو ہم شائقین کے لئے درج کرتے ہیں:۔ غزل

در عہد پادشاہ خطابخش جرم پوش	حافظ قرابکش شد و مفتی پیالہ نوش
صوفی ز صومعہ در پائے خم نشست	تا دید محتسب کہ سبو میکشد بدوش
احوال شیخ و قاضی و شرب الیہود شاں	کردم سوال صبحدم از پیر میفروش

گفتا نہ گفتنی ست سخن گرچہ محرمی | درکش زبان و پردہ نگہدار و می بنوش
ساقی بہار میرسد و جام مے نماند | فکرے بکن کہ خون دل آمد زغم بجوش
عشق است مفلسی و جوانی و نو بہار | عذرم پذیر و جرم بذیل کرم بپوش
اے بادشاہ صورت و معنی کہ مثل تو | نادیدہ ہیچ دیدہ و نشنیدہ ہیچ گوش
چنداں بماکہ خرقۂ ازرق کند قبول | بخت جوانت از فلک پیر زندہ پوش
تا چند ہمچو شمع زباں آوری کنی | پروانہ مراد رسید اے محب خموش
دی شب بنداز غیب بگوش دلم رسید | حافظ تو غصہ کم خور و بنشین و می بنوش

لطیفہ میں لطیفہ۔ لطیفہ یہ ہے کہ مفتی زادہ ایک لوہار کے لونڈے پر مائل تھا۔ اور اس کی جدائی میں نعل در آتش رہا کرتا تھا۔ ایک دن حافظ صاحب رح مفتی زادہ کے مکان پر ملنے گئے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ لوہار کے گھر گیا ہوا ہے۔ یہ لوہار کے گھر پہونچے۔ دیکھا کہ مفتی زادہ صاحب اپنے محبوب کو بغل میں لئے بیٹھے ہوئے ہنسی دل لگی کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ دونوں کے بیچ میں ہو بیٹھے۔ مفتی زادہ کو اس وقت ان کا آنا اور بے موقع بیٹھنا سخت ناگوار ہوا۔ تیوری پر بل پڑ گئے اور منہ لٹکا کر چپ ہو بیٹھا۔ چہرہ مارے غصہ کے تمتا گیا۔ خواجہ صاحب مفتی زادہ کے غصہ سے ڈر گئے اور دل میں کہنے لگے۔ کہ الصُّحبتُ تاثِرُ لوہار کے لونڈے کی مجالست نے اس کے دل کو فولاد بنا دیا ہے۔ دیکھئے آگے کیونکر بنتی ہے۔ مفتی زادہ نے خواجہ سے کہا کہ آپ اگر یہاں آئے ہیں تو میرے دوست کے حسن و ادا کی تعریف میں ایک غزل فوراً کہئے تاکہ میرا اور اس کا دل خوش ہو۔ آپ نے اس کو بھی غنیمت سمجھا اور اسیوقت یہ غزل کہکر سنائی ؎

دلم ربودۂ لولی وشیست شور انگیز | دروغ وعدہ و قتال وضع رنگ آمیز
فدائے پیرہن چاک ماہرویاں باد | ہزار جامۂ تقوی و خرقۂ پرہیز

فرشتہ عشق نداند کہ چیست، قصہ مخواں | بخواہ جام شرابی بخاک آدم ریز
غلام آں کلماتم کہ آتش افروزد | نہ آب سرد زند در سخن بر آتش تیز
فقیر و خستہ بدرگاہت آمدم رحمے | کہ جز دلائے توام نیست ہیچ دستاویز
بیا کہ ہاتف میخانہ دوش با من گفت | کہ در مقام رضا باش و از قضا مگریز
پیالہ بر کفنم بند تا سحر گہ حشر | بمے ز دل ببرم ہول روز رستاخیز
مباش غرہ بہ بازوئے خود کہ در خبرست | ہزار تعبیہ بادشاہ حکم انگیز
بشکر آنکہ جس از فلک بردی گوی | بہ عاشقاں و فقیراں خویشتن مستیز
میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست | تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

جب خواجہ نے مقطع پڑہا تو وہ بالکل حسب حال تھا۔ اور اس میں اپنے بموقعہ بیٹھنے کی معافی چاہی تھی۔ دونوں کے دونوں اس کو سنکر بے اختیار ہنس دیے اور خواجہ صاحبؒ کے آنے سے جو کدورت پیدا ہوگئی تھی وہ خوشی کے ساتھ بدلگئی۔

سب سے زیادہ افسوسناک یہ بات ہے کہ شعر العجم اور حیات حافظ کے مؤلف تصوف کے مذاق سے بالکل خالی ہی نہیں ہیں بلکہ تصوف اور صوفیہ کی ہنسی اُڑانے والے۔ خرق عادات اور کرامات اولیا اللہ کو حقارت کی آنکھ سے دیکھنے والے ہیں۔ اس لئے خواجہ صاحب کے اُس جوہر پاک کو جس سے ہماری مراد تصوف کے مسائل اور فقر کے کنائے اشارہ اور عرفان الٰہی کے اسرار ہیں نہیں چمکا سکے اس کی مثال ایسی ہے بلکہ کوئی شخص یہ بیان کرے کہ معشوق ہر طرح نکہ سکھ سے درست اور حسن و جمال میں غیرت حور اور رشک پری ہے۔ مگر اس کے سر پر بال یا زلف پیچاں نہیں ہیں۔ اور ان کے نہ ہونے سے معشوق کی خوبی میں کچھ بھی فرق نہیں آتا۔ اب سمجھنے والے سمجھ جائیں گے کہ سر منڈے معشوق کے پسند کرنیوالے عاشق کیسی بھونڈی نظر رکھنے والے ہونگے۔ بقول بزرگوں کے ولی

راولی میشناسد۔خواجہ کے کلام کے اوصاف ولی اللہ ہی خوب جانتے ہیں حضرت مولانا جامی رحمت اللہ علیہ آپ کی نسبت فرماتے ہیں "شمس الدین محمد لسان الغیب وترجمان الاسرار ست" اگر مولانا جامیؒ خواجہ حافظ کے دیوان کی شرح کرتے تو معلوم ہوجاتا کہ خواجہ صاحب نے شاعری کے پردہ میں توحید وتصوّف کے بھیدوں کو ادا فرمایا ہے۔مگر اس زمانہ کے نیچرل مورخ اس کو بھی نہ مانتے۔کیونکہ آج خواجہ صاحب کے دیوان کی متعدد شروح اور لاکھوں تصوف کی کتابیں موجود ہیں۔مگر ان اللہ کے بندوں کے نزدیک وہ سب عبث اور لغو ہیں۔یہ کہدینا کہ "خواجہ صاحب کی شاعری کو انسان کے عام معاملات سے بہت زیادہ تعلق ہے۔اس لئے جو سوالات انسانی معاملات کے متعلق خواجہ کے دیوان سے کئے جاتے ہیں۔اُن کے جواب میں اکثر مناسب اشعار نکل آتے ہیں" سراسر بدعقیدتی اور ناانصافی ہے۔خواجہ حافظ صاحبؒ سے زیادہ پولٹیکل مسائل اور تمدن اور تہذیب اور روزمرہ کی باتوں کے لکھنے والے بہت سے شاعر خواجہ صاحبؒ سے پہلے اور پیچھے ہوئے ہیں۔مگر ان میں سے ایک کا دیوان بھی ایسا نہیں ہے۔جو ٹھیک فال بتا سکے۔اس لئے ایک مسلمان کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ آپ ضرور لسان الغیب اور ترجمان الاسرار تھے۔

اور اگر کوئی ہٹ دھرم اس کو تسلیم نہ کرے تو وہ اپنے قول کی تائید میں کوئی دوسرا دیوان عربی، فارسی، اُردو کا ہمارے سامنے پیش کرے کہ دیکھئے جس طرح حافظ صاحب کے دیوان سے فال نکلتی ہے اسی طرح یہ دیوان بھی فال بتاتا ہے۔ہَاتُوا بُرْہَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْن ۵

اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ وشاب کا

میں خواجہ حافظ صاحبؒ کے تاثیرات کلام کا ایک قصہ اپنی آنکھوں دیکھا ہوا سناتا ہوں ایک بار حضرت غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

عرس پر دار الخیر اجمیر شریف جانیکا اتفاق ہوا۔ ڈپٹی سید امام الدین صاحب دیوان درگاہ معلیٰ کی حویلی میں حضرت خواجہ محمد موسیٰ صاحب تونسوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مع اپنے مریدوں کے اُترے ہوئے تھے۔ میں بھی سلام کے واسطے حاضر ہوا حافظ صاحب رح ممدوح سجادہ پر تشریف فرما تھے۔ اور آپ کے چاروں طرف سینکڑوں آدمی حاضر تھے۔ اور سینکڑوں آتے تھے اور قدمبوسی کرکے چلے جاتے تھے۔ اس میں مولوی قمر الدین صاحب مدرس مدرسہ درگاہ شریف ایک جنٹلمین بزرگ کو جن کی عمر ۶۰۔۷۰ برس سے کم نہ ہوگی لیکر آئے اور حافظ صاحب قبلہ رح سے عرض کی کہ حضور یہ جنٹلمین دلی کے ایک رئیس ہیں اور جج کے عہدے پر ممتاز ہیں۔ اور وجد سماع کے بڑے بھاری منکر ہیں۔ حافظ صاحب قبلہ رح نے جج صاحب سے مصافحہ کیا اور اپنے قریب بٹھالیا۔ اور فرمایا آپ کا اسم مبارک۔

جج صاحب "حضور مجھے سمیع اللہ کہتے ہیں"

حافظ صاحب قبلہ رح "سبحان اللہ۔ اللہ سمیع اور آپ سمیع اللہ اور پھر سماع سے انکار۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا"

جج صاحب اس لطیفہ کو سنکر دم بخود ہو گئے۔ اور صرف یہ عرض کی حضور مجھے یہ مسئلہ کماحقہٗ محقق نہیں ہوا ہے۔

حافظ صاحب رح قبلہ "اگر کسی نے انکار کیا ہے تو صرف مزامیر سے۔ نہ کہ سماع سے۔ سماع کی اباحت تو حدیث سے تعلق ہے۔ اسی اثناء میں ایک قوال حاضر ہوا۔ اور سلام کرکے جوتیوں کے پاس دوزانو بیٹھ گیا۔ حافظ صاحب رح قبلہ نے قوال کی طرف اشارہ کیا کچھ گاؤ۔ حسن اتفاق اور حافظ صاحب رح قبلہ کا تصرف قوال نے خواجہ حافظ صاحب کی یہ غزل شروع کی ؎

ایدل بکوئے عشق گذارے نمیکنی ۔۔۔ اسباب جمع داری وکارے نمیکنی

چوگان کام در کف و گوئے نمیزنی | بازی چنیں بدست شکارے نمیکنی
ایں خوں کہ موج میزند اندر جگر چرا | درکار رنگ و بوئے نگارے نمیکنی
مشکیں ازاں نشد دم خلقت کہ چوں صبا | برخاک کوئے دوست گذارے نمیکنی
گر دیگران بعیش گزارند روزگار | ایدل تو ایں معاملہ بارے نمیکنی
ترسم کزیں چمن نبرے آستین گل | کز گلبنش تحمل خارے نمیکنی
در آستین کام تو صد نامہ مندرج | آزاف سائے طرۂ یارے نمیکنی
ساغر لطیف و دلکش و می افگنی بخاک | واندیشہ از بلائے خمارے نمیکنی
حافظ برو کہ بندگی بارگاہ دوست | گر جملہ میکنند تو بارے نمیکنی

اب جج صاحب نے غور کیا تو مطلع کے مضمون کو اپنے حال کے مطابق پایا قوال کی آواز دلکش نے اس پر نمک افشانی کی جج صاحب سے ضبط نہ ہوسکا۔ پہلے تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے ۔اور پھر پرانے صوفیوں کی طرح وجد ظاہر ہوا سارا بدن تھرا اُٹھا اور دل بے قابو ہوگیا۔ قوال بھی مطلع کی تکرار کرتا رہا اور جج صاحب مزے لیتے رہے۔ جب حافظ صاحب رح قبلہ نے قوال کی طرف اشارہ کیا تو وہ خاموش ہوا۔ اور جج صاحب اُٹھکر حافظ صاحب قبلہ کی قدمبوسی کر کے کہنے لگے۔ کہ جیسا کچھ میں نے شہرہ حضور کے کمالات فقر کا سنا تھا اُس سے زیادہ اس محفل میں آکر دیکھ لیا۔ میں عرصہ سے حج کا ارادہ کر رہا تھا۔ اور اب بھی اسی قصد سے یہانتک آیا تھا۔ کہ کعبۃ اللہ کو چلا جاؤنگا۔ مگر نفس شیطان مانع ہوتے تھے اور میں ہر روز اس خیال کو بدل ڈالتا تھا۔ اور حج کا ارادہ فسخ کردیتا تھا۔ اب اسی واسطے حاضر ہوا تھا کہ اس اُلجھن کو حضور کی خدمت میں پیش کرکے دعا چاہوں مگر

عرض حاجت در حریم حضرتت محتاج نیست
راز کس مخفی نماند بر دل دانائے تو!

حضور نے اس عقدہ کو بغیر کہے حل کر دیا۔ اور جو کچھ فرمانا تھا وہ حافظ صاحب سے کہوا دیا۔ بیشک حافظ صاحب رحمتہ اللہ علیہ لسان الغیب اور انکا کلام تمام جہان اور جہان کے دلوں پر حاوی ہے۔ اب انشاء اللہ تعالےٰ بندہ یہاں سے سیدھا بمبئی لو بمبئی سے مکہ معظمہ روانہ ہو جاویگا۔ چنانچہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب جج دہلوی کے دل پر حافظ محمد موسیٰ صاحب تونسوی رحمتہ اللہ علیہ اور حافظ شیرازی کی برکت کلام نقش ہو گئی۔ اور حج سے مشرف ہو کر بہت جلد پلٹ آئے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ فال دیکھنی ناجائز ہے۔ مگر حدیثوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم بھی فال گوش لیا کرتے تھے۔ اور فال فال کا کبھی الفاظ ہی ہوتا تھا چنانچہ جب آپ نے ہجرت فرمائی۔ اور مدینہ شریف کے پاس پہنچے۔ تو آپ نے دیکھا کہ شہر کی جانب سے ایک گرد اٹھی اور اس میں سے چند سوار نمودار ہوئے۔ جب آپکے قریب پہنچے تو آپ نے اُن سواروں کے سردار سے دریافت فرمایا کہ تمہارا نام کیا ہے؟

سردار۔ حضور مجھے بریدہ بن الخصیب کہتے ہیں۔

آپ نے اس سے تفاول کر کے فرمایا کہ بَرَدَ اَمْرُنَا۔ ہمارا کام ٹھنڈا ہوا پھر آپ نے دریافت فرمایا۔ تم کس قبیلہ سے ہو۔

سردار۔ قبیلہ اسلم سے۔

اس پر تفاول کر کے فرمایا سلمنا یعنی ہم سلامت آئے۔ پھر دریافت فرمایا۔ کس قوم سے ہو۔

سردار۔ بنی سہم۔

اس پر تفاول کیا اور فرمایا خرج سہمک یعنی تم نے دولت اسلام کا پاک حصہ لے لیا۔ ہم اہل محبت کے نزدیک یہ فعل رسول اللہ کا ہمارے لئے سنت ہو گیا

پس اگر ہم بھی اس پر عمل کریں۔ اور کسی آڑے وقت میں خواجہ حافظ رحمت اللہ علیہ کے کلام سے تفاول کر لیا کریں تو کچھ مضائقہ نہ ہوگا۔ کیونکہ بربدہ اسلمی جب تک اسلام سے مشرف نہ ہوئے تھے اس وقت ان کے کلام سے حضرت نے تفاول فرمایا تھا۔ تو ایک ولی اللہ کا کلام غیر مسلم کے کلام سے تفاول کے واسطے ضرور ترجیح رکھیگا۔ آپ کے دیوان سے فال نکالنے کے بہت قاعدے کتابوں میں لکھے ہیں مگر ایک سیدھا سادہا اور چلتا قاعدہ یہ ہے کہ مسلمان وضو کر کے تھوڑی سی شاخ نبات پر خواجہ صاحب اور بی شاخ نبات کی فاتحہ پڑھکر ان کی روح کو ثواب سے شاد کرے اور اگر صبح کے وقت ۱۲ بجے سے پہلے فال دیکھنا ہو تو دیوان کے نصف پہلے حصہ میں اور اگر بعد زوال آفتاب فال دیکھنا ہو تو دیوان کے نصف آخر میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کہکر اور اپنے مطلب کو دل میں یاد کر کے کھولے۔ اور صفحہ کی پہلی سطر پر نظر ڈالے۔ اور اس میں جو شعر مرقوم ہو اس کو پڑھے۔ اگر اس شعر میں مطلب حل ہو جاوے تو فبہا ورنہ ساتویں شعر کو دیکھے۔ اس میں حل ہو جاویگا۔ اور اگر پہلے صفحہ کی پہلی اور ساتویں سطر میں حل نہ ہو تو پہلے صفحہ سے سات ورق آگے گن جاوے اور ساتویں ورق کے پہلے صفحہ اور اس صفحہ کی پہلی یا ساتویں سطر کو دیکھے ضرور مدعا نکل آئیگا۔ ورنہ تین بار یہی عمل کرے ضرور فال نکل آئے گی۔ اس کے بعد چوتھی مرتبہ ہرگز نہ دیکھے اور سمجھے۔ کہ خواجہ حافظ صاحب رح اس فال کو ظاہر نہ کرنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ صبر سے کام لے اور پھر کبھی فال نکالے جو مصری نبات کی ہے وہ بچوں کو بانٹ دے ٭ (باقی دارد)

٭ محمد قاسم علیخاں قمر
تلمیذ حضرت فراق دہلوی

بدبخت ہندوستان اور مہاکال

انسان قدرتی طور پر اہل ملک کے ادبار و افلاس اور عروج و زوال کو ہمیشہ یا وقتاً فوقتاً محسوس کرتا رہتا ہے۔ یہ حس یا تو خوشی و خورمی کے باعث سے پیدا ہوتی رہتی ہے یا فلاکت۔ رنج و افسوس کے باعث سے۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ گذشتہ اور موجودہ حالات میں مقابلہ کرنے لگتا ہے۔ اور یہ خیال کر کے کہ ہم میں سے بہتیرے ان حالات سے نابلد ہونگے۔ وہ ناواقف انسان ان امور سیاسی سے واقف ہو کر اپنے اور اہل ملک کے مفاد کے لئے چارکار سوچیں اس فراہم شدہ مصالحہ کو اہل ملک کے سامنے پیش کرنیکی جرأت کرتا ہے۔

آجکل اہل ہند کی حالت ایک ایسے ہندوستانی کی نگاہ میں جس کے دل میں حب الوطنی اور حب قومی کا جوش موجزن ہوگا ہر حیثیت سے زوال پذیر اور فلاکت زدہ نظر آوے گی۔ یہ ہر قسم کے مصائب و نوائب تنگدستی و بے بسی۔ بے سروسامانی اور اشیائے خوردنی کی گرانی میں مبتلا ہیں۔ اور آخر الذکر یعنی اشیائے خوردنی سب سے مقدم شے انسانی زندگی کے لئے ہے جس سے مطمئن ہو کر انسان دوسری ضروریات زندگی کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ خصوصاً اہل ہند عموماً زراعت پیشہ تھے اور ہیں جن کی ضروریات زندگی کا دارمدار محض زراعت پر ہے۔ وہ اسی کے ذریعہ سے ہمیشہ خوشحالی اور فارغ البالی سے بسر کرتے تھے۔ حالانکہ پہلے زمانہ میں زمین بھی اس قدر کاشت نہیں ہوتی تھی جتنی کہ اب ہو رہی ہے۔ بمقابلہ سابق اب ملا مبالغہ چارگنا رقبہ زیادہ زیر کاشت ہے۔ مگر پھر بھی غلہ اس قدر گراں رہتا ہے جس کو کال سے تعبیر کرنا بالکل درست ہے۔ اس کثرت کاشت پر بھی تین حصہ

آبادی ملک نیم فاقہ کشی سے بسر کرتا ہے۔ اور بقیہ ایک ثلث کو بھی حسب خواہش
اُن کے غذا میسر نہیں ہوتی۔ زمانہ سابق میں باوجود کمی کاشتکاری کے غلہ اس
افراط سے پیدا ہوتا تھا کہ بہت ہی تھوڑی آمدنی والوں کے بڑے بڑے قبیلے آسودہ
حالی سے بسر کرتے تھے۔ اسی ارزانی و فراوانی جنس کی بدولت عالیشان آرام دہ
پختہ و خام مکانات شہر اور بیرونجات میں صرف کثیر سے سالہا سال میں تیار ہوتے
تھے۔ لکھوری اینٹیں یعنی روڑی گڑھ کر سر بفلک عمارتیں نقش نگاری اور فن انجنیری
کا مکمل نمونہ بنکر طیار ہوتی تھیں۔ جو دائمی یادگار بلحاظ استواری کے ہوتی تھیں۔ ساکھو کی
قیمتی اور پائدار لکڑی جس کا اس وقت جنگلات سے بوجہ ناہمواری راہ لانا دشوار تھا۔
وہ نفیس گلکاری اور کاریگری کے ساتھ لگائی جاتی تھی۔ اسی ارزانی جنس کی بدولت
اولوالعزمی اور فیاضی سے غمی اور شادی کی تقریبات اور ہزارہا رسومات گھر بگھر روزانہ
ہوتی رہتی تھیں۔ دن عید رات شب برات رہتی تھی بلکہ وکھا غربا اور ان کے اہل وعیال
کی بسر اوقات کا ذریعہ تھیں۔ اسی وجہ سے اور ملکوں کے مقابلہ میں ہندوستان میں
بہت سی رسومات رائج ہو گئی تھیں۔ جن کو اب گرانی اجناس مٹا رہی ہے۔ اسی
ارزانی جنس کی بدولت مستورات اور بچے زیورات طلائی مرصع و نقرئی سے حسب
حیثیت آراستہ رہتے تھے۔ بجائے ان کے اب بکثرت پیتل اور جرمن سلور
کے زیورات طلائی و نقرئی زیورات پہننے والوں کی افلاس پوشی کر رہے ہیں۔ اور
مرصع ہیرے جواہرات سچے موتیوں کی بجائے ولایتی کانچ کے نگینے اور ولایتی
مومی موتی پہنکر دل کا حوصلہ نکالا جاتا ہے۔ اسی ارزانی جنس کی بدولت ریشمی نفیس
زریں لباس سے مزین رہتے تھے۔ علاوہ اس کے اسی جنس کو کافی طور پر مصرف میں
لانیکے بعد اور کوٹھاروں میں جمع رکھنے کے بعد جو وقت بیوقت اُن کے کام
میں آتا تھا کافی مقدار غلہ کو فروخت کر ڈالتے تھے۔ علاوہ بریں کثیر سرمایہ بصورت

غلہ کے مدفون رہتا تھا۔ یا او رستہ میں لگ رہتا تھا۔ غرضیکہ ہر طرح سے کاشتکار اور زمیندار وغیرہ کو اطمینان رہتا تھا۔ اتفاقیہ قحط سالی باعث تباہی نہیں ہوسکتی تھی۔

دیہاتوں میں یہ جنس سکہ مروجہ سے بڑھکر تھی۔ اسی کے ذریعہ سے تمام ضروریات کی چیزیں مبادلہ میں لیجاتی تھیں۔ قیمت شے سے زیادہ لاپروائی اور بیقدری سے غلہ معاوضہ میں اُجرت و مزدوری ہی پیشہ دروں کو بجائے نقدی کے دیدیا جاتا تھا جس کو وہ سب بخوشی لے لیتے تھے۔

اب اسی جنس کی گرانی کی وجہ سے زراعت پیشوں میں جدید تعمیرات کا کام رُک گیا۔ قدیم شاندار عمارتیں بوجہ افلاس کے یا تو کھُد گئیں یا بے مرمتی کی حالت میں اپنی اُس رفعت و شان کو قایم نہ رکھ سکیں اور اب وہ سربسجود ہورہی ہیں۔ مالکان اراضی خواہ وہ زمیندار ہوں یا کاشتکار قرضہ و فلاکت کے بھنور میں مبتلا ہیں۔ جلد جلد انکی حقیتیں بوجہ زیر باری و بذریعہ رہن و بیع وغیرہ منتقل ہو رہی ہیں۔ ناتجربہ کار گھر گرستی کو فروخت کرکے زمینداری خرید کرتے ہیں۔ وہ چند پشتوں تک بھی اُن کے پاس یا ان کے خاندان میں نہیں رہتی۔ قدیم زمانہ میں پشتہا پشت تک زمینداری ایک خاندان میں قایم رہتی تھی۔ اس کی تمثیلوں کے لئے دفتر رجسٹری کی الماریاں بھری پڑی ہیں کہ موروثی و نوخریدجائدادیں جلد جلد منتقل ہو رہی ہیں۔

بحث طلب امر یہ ہے کہ باوجود کثرت کاشت و فراوانی پیداوار و عمدگی فصل کے گرانی اجناس دن بدن کیوں بڑھتی جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ اسباب بیان کئے جاویں لازمی ہے کہ مقررین مصنفین اور مترجمین کے مضامین کے منتخب فقروں سے اس مضمون کی تیاری میں مدد لی جاوے تاکہ عوام الناس اہل ہند مختلف حکومتوں کے برکات کا اندازہ کرسکیں۔ ناظرین کسی حکومت کے فیض کو اس وجہ سے بیقدر نکریں کہ حکمرانوں کا مذہب دوسرا تھا یا ہے

بلکہ اس امر پر غور فرمائیں کہ ملکی اور غیر ملکی باشندوں کی حکمرانی میں کیا فرق ہے۔

انتخاب ذیل متعلق نرخ اجناس بحوالہ آئین اکبری مولفہ ڈاکٹر لیس۔کے۔سوتا بی۔اے۔آئی۔ایم۔بی۔سی۔ایچ۔پی پروفیسر فارمن کرسچین کالج لاہور کے لکچر مترجمہ بابو ڈپٹی لال صاحب نگم بی۔اے مطبوعہ رسالہ العصر مارچ ۱۹۱۳ء میں "سلاطین مغل کی سوشیل زندگی" کے حالات میں منجملہ بہت سی مفید باتوں کے اس نرخ کا بھی ترجمہ بحوالہ کتاب کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی چند اور حکومتوں کے نرخ اجناس کا ذکر ہونا بھی ضروری تھا۔ جو فروگذاشت ہو گیا۔اسی لحاظ سے اس مضمون میں چند اور نرخنامے بھی درج کئے جاتے ہیں تاکہ ارزانی و گرانی جنس میں موازنہ ہو سکے اور نیز پیداوار زراعتی اور زمینداری نسبتوں کی بابت بحالت موجودہ اور لوگوں کے کیا خیالات ظاہر ہوئے ہیں۔یا اس کے اسباب کیا ہیں۔اس موقع پر انکا ظاہر کرنا بھی چنداں بےموقعہ نہ ہو گا۔

نرخ بازار ناظمان بنگال۔نظامان دکن۔فرمانروایان راجپوتانہ مرہٹواری پنجاب باوجود تلاش فراہم نہ ہو سکا جس کی وجہ سے اس مضمون کی دلچسپی میں نقص عظیم رہگیا تاہم آخری فرمانروائے اودھ کے زمانہ کا نرخ بازار درج ذیل کیا جاتا ہے۔گو کہ اسوقت انگریزی حکومت کا رقبہ اودھ کی سرحدوں سے ہمسوا نہ ہو چکا تھا اور یورپ کے بیوپاریوں نے اودھ کے بازاروں اور منڈیوں سے غلہ کی کشش شروع کر دی تھی۔جو نوی وجہ گرانی کی آخری شاہ کے وقت میں بھی سمجھی جا سکتی ہے تاہم بلحاظ کثرت آبادی لکھنؤ موجودہ نرخ سے کہیں زیادہ ارزانی تھی۔اگر خام اور پختہ وزن میں کچھ فرق تھا۔تو اس زمانہ میں خالص سکہ تھا نیز ایک روپیہ کے پیسے حال سے زیادہ تعداد میں ملتے تھے۔

نرخنامہ زمانہ سابق و حال

نرخ بازار زمانہ اکبر شاہ ہند	نرخ بازار زمانہ واجد علیشاہ اودھ	نرخ بازار انگریزی حکومت ہند
گندم۔ فی روپیہ تخمیناً سوا تین من	گندم فی روپیہ ڈیڑھ من	گندم۔ فی روپیہ ۱۳ سیر
چاول۔ فی روپیہ پونے پانچ من	چاول۔ فی روپیہ تین من	چاول۔ فی روپیہ ۸ سیر
دال۔ فی روپیہ ۳ من	دال۔ " ڈھائی من	دال۔ " " ۱۰ سیر
روغن زرد۔ دو روپیہ دس آنہ من	روغن زرد۔ ے فی من	روغن زرد۔ " " ۱۲ چھٹانک
شکر۔ یکروپیہ ۹ر من	شکر۔ عا فی من	شکر۔ " " ۴ سیر
گوشت بکری کا عہ فی من	گوشت بکری کا عا من	گوشت بکری کا عـــہ فی من
دودھ عزباً بکثرت استعمال کرتے تھے	دودھ عہ من	دودھ صہ فی من
روغن تلخ صہ فی من	روغن تلخ فی روپیہ ۲۵ سیر	روغن تلخ فی روپیہ ڈیڑھ سیر

قسم غلہ کودوں جوار باجرا ارہر ساواں کاکن مینڈوا یہ اور بھی ارزاں تھے۔ جو آجکل سخت گراں ہو رہے ہیں۔ نمک بھی ارزاں تھا۔ اور لکڑی یقیناً زمانہ سابق میں قریب قریب مفت کے تھی۔ عوام الناس باغات اور جنگلات سے لے آتے تھے۔

آجکل روغن زرد۔ روغن تلخ اور دیگر جنسیں عام طور پر بلا آمیزش نہیں ملتی ہیں۔ اسی گرانی کی وجہ سے بہت کم لوگ صبح و شام آسودگی سے حسب خواہش غذا پر بسر کر سکتے ہیں۔ گو کہ اراضی کتنی ہی زیادہ کاشت ہو جاوے۔ اس گرانی کے مفصلہ ذیل اسباب ہیں۔

اوّل۔ محاصل پیداوار سے قریب قریب نصف کے بشکل مالگذاری سرکار لے لیا جاتا ہے۔ اور بقیہ نصف محاصل پر جو بچ رہتا ہے۔ اس پر انکم ٹیکس۔ اومن ٹیکس۔ چونگی میونسپلٹی۔ کورٹ فیس عدالت اسٹامپ انتقالنامجات رجسٹری۔ ٹیکس شفاخانجات و مدارس و سرکانہ و فیس تعلیم۔ و تنخواہ پٹواری و چوکیداری

صرفہ بٹوارہ۔ صرفہ داخلخارج۔ صرفہ بندوبست۔ صرفہ نشانات حدبندی۔ صرفہ رسدہ صرفہ آبپاشی نہر۔ صرفہ ملازمین ذاتی۔ صرفہ میلیشیان اور دوسرے اتفاقیہ اور غیر اتفاقیہ مصارف پڑتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ابواب بالاکی بہت سی شکلوں میں بقیہ رہا سہا منافع بھی گورنمنٹ کے خزانہ میں پھر واپس چلا جاتا ہے۔ ہندوستانی حکومتوں میں ان بیجا ستانیوں اور زیر باریوں سے یہ بدنصیب فرقہ ہمیشہ سبکدوش رہا کرتا تھا۔ بجز برائے نام مالگذاری شاہی کے اور کوئی بار سند بعہ بالانہ تھا۔

دویم۔ قدیم حکومتوں میں ملک کا بہت بڑا گروہ ملکبسرمے رقبہ ملک کو بصورت ائمہ کسیر جاگیرنانکار۔ معافی و باغات اور مختلف حقوق سے بلالگان حاصل کئے ہوئے تہا۔ جس پر کسی قسم کے مطالبات شاہی نہ تھے۔ اس کی پیداوار سے وہ خوشحالی سے بسر کرتے تھے۔

سیوم۔ فری ٹریڈ یعنی آزاد تجارت جس سے کل یورپ ہندوستان کی پیداوار کو کھینچ رہا ہے۔ یہ انگریزی حکومت کی مرعبہ حکمت عملی ہے جس سے تخمیناً تیس بتیس کروڑ کا گندم اور چاول علاوہ دیگر اجناس کے سالانہ یورپ کو چلا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ملک کا غلہ اندرون ملک رہنے نہیں پاتا۔ سیود بار اودھ کا دور نہیں ہے جہاں بخیال اس کے کہ رعایا پر قحط سالی کا اثر نہ ہونے پائے فوجی پہرے غلہ کی روک کے لئے سرحدی چوکیات پر قایم ہوجاتے تھے۔

بعض انگریزی مدبران فرماتے ہیں کہ اسی قدر زیادہ قیمت غلہ کی کاشتکاری پیشہ اور غلہ کے کاروباری لوگوں کو ملجاتی ہے۔ یہ سچ ہے مگر یورپی سکہ عدالتی اور قانونی اور ان ابواب بالا میں گورنمنٹ کے خزانہ میں واپس جاتا ہے جس کی نحوست اس پریشان فرقہ کے سروں پر منڈلایا کرتی ہے۔ نیز اس کا کوئی فائدہ ایسی حالت میں نہیں پہنچتا ہے جبکہ خود ان کو اپنی ضرورتوں سے اسی نرخ بازار پر غلہ خرید کرنا پڑتا ہے

بنئے بقال۔ ہاؤس ٹیکس انکم ٹیکس۔ چونگی اور باربرداری اور ملازمین دوکان کا بار بلحاظ ہر ت کے اُسی نرخ بازار پر اضافہ کر دیتے ہیں۔ بوجہ گرانی ملازمتوں کی تنخواہ زیادہ بڑھ گئی ہے۔ باربرداری کے چھکڑے وغیرہ بھی گراں نرخ پر اس وجہ سے ملنے لگے ہیں کہ لوگوں کے پاس بوجہ عدم دستیابی چارہ ودانہ وچراگاہ مویشی بہت کم رہ گئے ہیں۔ مثلاً ملک اسٹریلیا کی مختصر آبادی ۴۰ لاکھ کی ہے۔ لیکن وہاں ۱۲ کروڑ ۱۳ لاکھ ۵۵ ہزار ۱۳۰ گائے بھینس اور بھیڑیں ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان کی تیس کروڑ آبادی کے پاس ۹ کروڑ ۷ لاکھ پچاس ہزار ۵۶ سے زیادہ گائے بھینس نہیں ہیں۔ ہندوستان کے گوروں کے صرف ہیں۔ ۳۰ لاکھ پچاس ہزار گائیں آتی ہیں علاوہ دیگر لوگوں کے اس وجہ سے کھا بھی کم ہوتی ہے۔

اس فرقہ کے پاس غلہ اس وجہ سے بھی نہیں رہتا کہ دیہات میں غلہ بطور سکہ مروجہ کے ضروریات کی چیزوں کے تبادلہ میں چلا جاتا ہے۔ اور ان کے واسطے یہ ناممکنات سے ہے کہ وہ نقدی سکہ سے کاروبار چلا سکیں۔ علاوہ اس کے ان کے اہل خدمات جن کے بغیر ان کا کام ایک منٹ بھی نہیں چل سکتا ہے۔ یعنی حجام لوہار۔ بڑھئی۔ چوکیدار۔ بھاٹ۔ چمار۔ مہتر۔ دھوبی اور دوسرے خدمتی لوگ خدمات کے عوض غلہ ہی لیتے ہیں۔

سابق میں بوجہ افتادہ رہنے کثیر حصہ اراضی کے ان لوگوں کو کچھ غلہ دیدیتے تھے اور کچھ اراضی بطور معافی کے جس سے شاہ وقت بھی باوجود واقفیت کے کچھ تعرض نہ کرتا تھا۔ اب بہت سا حصہ اس قسم کے عطیہ کا بوجہ کاشتکاری وقانون ضبطی معافی و تبدیل نوعیت اراضی متنازعہ ہو گئی ہے۔ اور اس پر محاصل سرکاری بھی تشخیص ہوگیا ہے۔ اس لئے اہل خدمات نقدی اور غلہ دونوں کے طالب ہونے لگے ہیں۔ اس شکل نے بھی اس فرقہ کی پریشانی اور زیر باری زیادہ بڑھ گئی ہے۔ غرضیکہ بہت سے

موقوں پر نقدی کا بار پڑ گیا ہے۔ خواہ پیداوار عمدہ ہو یا نہ ہو اہل خدمات کو اس سے کچھ واسطہ نہیں رہا۔ اور اسی نصف پس انداز شدہ رقم میں بہت سا روپیہ لجلت فوتی وفراری وناد ہندی آسامیاں وصرفہ بیرون عدالت متعلق واہورسی اس فرقہ کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور جس کا تاوان اٹھانا پڑتا ہے۔

یہ بات ناممکن ہے کہ وہ ان پیشہ وروں سے قطع تعلق کریں۔ کیونکہ حجام انکا اور ان کے اہل خاندان کا خط بناتا ہے۔ رسومات شادی غمی میں بڑے بڑے فرائض ادا کرتا ہے۔ برادری میں دور نزدیک بلا معاوضہ نامہ بری کرتا ہے۔ لوہار اور بڑھی آلات زراعت روزمرہ اسی امید پر بناتا ہے۔ چوکیدار گوریت بھاٹ اور بارہی جنکا تعلق حفاظت غلہ کھیت اور مکان اور مذہبی ضروری خدمات سے ہے اور چمار جس کا تعلق شکست مرمت چرمی اور جوتا بنانے سے ہے یہ سب بالعوض خدمات غلہ ہی لیتے ہیں۔ دھوبی صفائی لباس ودیگر ضروریات سے تعلق رکھتا ہے نیز مہتر کی بھی بہت سی دہی خدمات ہیں۔

اسی بقیہ جنس سے مویشیوں کو دانہ پڑتا ہے۔ بسا رہ بعض اوقات خرابی فصل سے مکرر سہ کرر ڈالنا پڑتا ہے۔ زمین کم قوت ہو گئی ہے بوجہ اس کے کہ کھاد اب بہت کم پڑتی ہے یا کھاد ہی نہیں پڑتی۔ اس وجہ سے اکثر بہت سا غلہ بسارہ کی شکل میں ضایع ہو جاتا ہے۔ کاشتکار مہاجنوں سے کھیتی کے کاروبار کے لئے غلہ بسارہ پر دونے ڈیوڑھے کے نرخ سے لیتے ہیں۔ یا نقدی قرض گراں سود پر لیتے ہیں اور وہ بالعوض اس زر نقد کے وہ دباؤ میں غلہ زیادہ نرخ سے لے لیتا ہے۔

ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اب شہر اور قصبات کی کھاد سرکار فروخت کرتی ہے سابق میں کاشتکار کو کھاد تقریباً مفت پڑتی تھی۔ مگر اب کاشتکار مفلسی کے باعث

عام طور پر خرید کر ڈالنے سے معذور ہیں۔ دوسرے کھاد عموماً پیدا بھی کم ہوتی ہے۔ کیونکہ ملک میں چارہ کی قلت اور گرانی کی وجہ سے مویشی بہت کم پالے جاتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں مویشی بھی چارہ با فراط ہونیکی وجہ سے بہت زیادہ طاقتور تھے اور اب تھوڑے اور کمزور۔ اسلئے اب ایک دن کا کام بھی دو دن میں ہوتا ہے۔ اسوجہ سے بھی اس ترقہ کا صرفہ بڑھ گیا۔

سابق زمانہ میں بحالت آفت ارضی و سماوی مالگذاری قطعاً معاف کر دی جاتی تھی۔ اور بحالت عمدگی پیداوار کوئی اضافہ مالگذاری تھا۔ لگان بھی اُس زمانہ میں آجکل سے تقریباً سات آٹھ گنا کم تھا اس لئے کاشتکاروں کی حالت اچھی تھی

آئیے ذرا اس مفلس ہندوستان کے انکم ٹیکس کا بھی دیگر ممالک سے مقابلہ کریں۔ امریکہ میں قاعدہ ہے کہ جن لوگوں کی آمدنی ۱۲ ہزار سے کم ہے انھیں ٹیکس نہیں ادا کرنا پڑتا۔ مگر بارہ ہزار سے لیکر ساٹھ ہزار کی آمدنی تک ایک روپیہ سیکڑہ اور ۶۰ ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک کی آمدنی پر دو روپیہ اور ڈیڑھ لاکھ سے ۳ لاکھ کی آمدنی پر چار فیصدی ٹیکس دینا پڑتا ہے یعنی وہاں تین ہزار ماہوار سے کم آمدنی پر ٹیکس نہیں دینا پڑتا۔ مگر ہندوستان میں چھ سو روپیہ سالانہ سے زاید آمدنی ہی ٹیکس کا ذمہ وار ٹھہرتا ہے جس کا خراب اثر گرانی اجناس کی صورت میں بھی نمودار ہو کر ہندوستان کی غریب رعایا کو پریشان کر رہا ہے۔

ہندوستانیوں کے بہت کچھ شور و واویلا مچانے پر ایک عرصہ کے بعد تحقیقات گرانی غلہ کا کمیشن مقرر ہوا نتیجہ ہنوز معرض التوا میں ہے۔ مگر مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں نرخ کی نگرانی بخوبی ہوتی تھی۔ سعادت علیخاں نواب اودھ اسی استفسار کے لئے خود بازاروں اور منڈیوں میں جایا کرتے تھے۔ عالمگیر شہنشاہ ہند کی بحالت ولیعہدی روایت ہے کہ وہ سب سے پہلے وزیر اعظم سے نرخ اجناس بازاری

دریافت کیا کرتا تھا۔ اور جبکہ حسب دلخواہ صحیح صحیح جواب نہ پاتا خود اپنی واقفیت سے نرخ غلہ بیان کرتا تھا۔ ابوالفضل وزیر اعظم شہنشاہ اکبر نے نرخنامہ کا اندراج آئین اکبری میں کرنا ضروری سمجھا۔ ان امور سے ثابت ہے کہ شاہان ہند اور وزرائے سلطنت کی تمام تر توجہ اس اہم معاملہ کی طرف ہمیشہ رہتی تھی۔ موجودہ زمانہ میں تو نرخ غلہ اور بھی ارزاں ہونا چاہئے تھا کیونکہ غریب رعایا کی فریاد گرانی اجناس بذریعہ اخبارات تار ٹیلیفون عرضداشتوں اور مقررین کی اسپیچوں پمفلٹوں اور رسالوں کے دنیا کے کونوں کونوں میں پہنچ رہی ہے گو کہ اس قدر وسائل اس زمانہ میں نہ تھے تاہم ہر ایک منصف مزاج بغیر داد دئے نہیں رہ سکتا کہ قدیم فرمانروا اور ان کے وزرائے سلطنت رعایا کی مصیبتوں سے کیسے باخبر رہتے تھے۔ فی زمانہ ہزارہا نفوس دوسرے ملکوں اور نو آبادیوں میں جا رہے ہیں اور لکھو کھا تنفس طاعون میں مبتلا ہو کر ضایع ہو جاتے ہیں پھر بھی ارزانی نہیں ہوتی۔

یہاں کی مفلس قوم کی تاسف انگیز حالت پر انگلستان کے تازہ سیاح کے وہ الفاظ پیش کئے جاتے ہیں جن کو صنعتی کانفرنس کے اجلاس ہشتم بانکی پور ۱۹۱۲ء میں پریسیڈنٹ جلسہ نے نقل کیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں :-

"یہاں کے لوگ قلیل ترین راحت تک بھی دسترس نہیں رکھتے فاقہ کشی کی سڑک سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہیں۔ ملک عجب بے خانمان معلوم ہوتا ہے۔ جس سے غربت و عسرت مترشح ہے۔ دیہات مٹی کی دیواروں کا ترحم انگیز مجموعہ ہیں۔ یہ کچے جھونپڑے برہنہ زمین کے کثیف تالاب کے گرد واقع ہوئے ہیں"

ایک دوسرے اہل قلم کی تحریر کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا دل نرم اور انسانی تکلیفات کو محسوس کرنیوالا تھا۔ انکی سوسائٹی کی کیفیت کسی انگریز کی نگاہ میں قابل لحاظ طور پر سادی۔ ابتدائی آرام و آسائش کے سامانوں سے بھی میرا معلوم

ہوتی ہے جو مہذب زندگی کے لئے لازم سمجھے گئے ہیں۔ ان مسائل کے دونوں پہلوؤں پر غور کرنیکے بعد صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ آؤ ہم واقعات کو زیادہ تعمق کی نگاہ سے دیکھیں ہندوستان کی کل آبادی ریاستوں سمیت ساڑھے تین سو ملین ہے۔ اس آبادی کے تین چوتھائی کا دار و مدار حیات زراعت پر ہے مزروعہ رقبہ کی مقدار صحیح طور پر معلوم نہیں کیونکہ ہندوستانی ریاستوں کے اعداد مکمل نہیں ہیں۔ لیکن ہمارا یہ فرض کرنا چنداں غلط نہ ہوگا۔ کہ وسیع زراعت پیشہ طبقہ کے ہر فرد کے حصہ میں کم از کم ایک ایکڑ اور زیادہ سے زیادہ سوا ایکڑ اراضی آتی ہے۔ جس قدر اراضی ممالک غیر کے بازاروں کے کام آتی ہے۔ یعنی جو پیداوار باہر بھیجی جاتی ہے۔ اس کو منہا کرنیکے بعد ایک ایکڑ کی دو تہائی بھی فی کس کے پاس نہیں رہتی۔

پس فی کس اسی ⅔ ایکڑ سے ہندوستان کی آبادی کو غذا و لباس بہم پہنچایا جاتا ہے۔ دنیا میں غالباً کوئی ملک نہ ہوگا جہاں زمین سے اس قدر ضروریات پوری کی جاتی ہوں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دہقان کی اوسط آمدنی بھی بہت کم ہے ایک ایکڑ کی خالص آمدنی بھی ایک شخص کے گذارے کے لئے کافی نہیں ہے اگر کوئی ایسا خاندان فرض کیا جاوے جو دو بالغ اور تین بچے رکھتا ہو پانچ ایکڑ اراضی کا بھی بشرطیکہ مالک ہو تو پھر بھی یہی نتیجہ نکلیگا۔ البتہ ہندوستانی خیالات اور نہایت کفایت شعارانہ معیار کے مطابق پانچ ایکڑ نہری اراضی پر ایسا خاندان بارام گذارہ کر سکتا ہے۔ مگر ہندوستان کی تمام اراضی بھی اچھی نہیں ہے۔ دیگر ذرائع آبپاشی بھی بکثرت زمین نہیں رکھتی اور نہ ہر کسان پانچ ایکڑ اراضی کا مالک ہے۔ بعض زمیندار اس سے بھی زیادہ زمین رکھتے ہیں۔ البتہ ان میں بہت سے پانچ ایکڑ اراضی بھی نہیں رکھتے ہیں۔ دہقان جس کے پاس ادنے

درجے کی پانچ ایکڑ زمین بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کو بسر اوقات کے لیے سخت جد وجہد کرنا پڑے گی۔ یہ اور اس کے اہل وعیال صرف ہمارے نزدیک ہی محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے بھی غریب سمجھا جاتا ہے۔ زمینداروں کے بعد ان سے کم درجے پر بے اراضی والے لوگوں کا گروہ کثیر ہے۔ جو عام اصطلاح میں کمین کہلاتے ہیں یہ اجرت پر نسبتاً مرفہ الحال زمینداروں کے کھیتوں پر کام کرتے ہیں۔ دیہات کے دیگر باشندے بھی ہیں جو کاشتکاری نہیں کرتے لیکن بالواسطہ ان کا گذارہ زراعت پر ہے۔ یہ دیہاتی لوہار۔ نجار۔ حجام۔ جولاہے۔ موچی سقے۔ دھوبی ہیں۔ اول الذکر دونوں الات زراعت بناتے ہیں۔ ان سب کو درو فصل کے موقع پر غلہ کی معین مقدار دیجاتی ہے۔ نیز دیگر حبوب بھی ان کو ادا کرنا پڑتے ہیں۔ غرضیکہ ہندوستان کی دیہاتی زندگی قلب انسان کے لئے تاسف انگیز ہے۔

اس پر بھی انگریزی مدبران حکومت صرف سرکاری مالگذاری کو کافی تعداد میں وصول دیکھکر عمدگی پیداوار و خوشحالی رعایا تصور کرتے ہیں مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ طریقہ وصول مطالبہ سرکاری کس قدر سخت ہے۔ صرف ایک صوبہ اودھ کے قانون مالگذاری میں کس قدر جبری دفعہ قایم ہے۔ خواہ حصہ دار قانوناً ادائے مالگذاری کا ذمہ دار ہو یا نہ ہو۔ گو کہ مالگذاری کا ذمہ دار نمبردار ہی بنایا گیا ہو پٹی دار تک سے جبراً وصول کر لیجاتی ہے۔ وارنٹ قرقی ذات وجائداد عمل میں آتی ہے گو کہ وہ بذاتہ باقیدار نہ ہو۔ کیا دیسی فرمانرواؤں کے عہد میں اس قسم کا قانون جاری تھا۔ اس سخت طریقۂ مالگذاری سے مرفہ الحالی رعایا و عمدگی پیداوار تصور کرلینا عقلمندانہ خیال نہیں۔ خوشحالی اس صورت میں تصور کیجا سکتی کہ دور اکبری و واجد علی شاہ کے زمانہ سے حضور جارج پنجم کے عہد میں ارزانی ہوتی۔ اگر ہمارے دیسی فرمانرواؤں

کے وقت میں خس پوش جھونپڑے تھے۔ تواب بجائے ان کے خوش وضع پختہ مکان ہوتے۔ اور جن کے خشتی مکانات تھے ان کے سنگین اور بلوری مکانات ہوتے برعکس اس کے یہ ہوا کہ وہ قدیم خشتی مکانات بھی منہدم ہوگئے یا ہورہے ہیں جن میں سابق میں وسیع خاندان مع کثیر ملازمین وارکین رہتا تھا۔ وہ اب کھنڈر ہورہے ہیں۔ اور جن میں جنگلی جانور بسیرا لئے ہوئے ہیں۔ بوجہ افلاس وہ خشتی خس پوش جھونپڑے اور بھی شکستہ ہورہے ہیں جن میں دہوپ بارش وسروی کی آڑ نہیں۔ اور صاف ستھری ہوا کا گذر نہیں ہے۔ بخلاف اس کے یورپ کے کاشتکاران وزمیندار وعوام الناس کے مکانات آراستہ پیراستہ ہیں۔

مسلمانوں کی تقریباً چھ سو سالہ حکومت میں اگر ملک کو اس قدر سر سبزی اقبال ان کے نہیں ہوئی تھی۔ تو ایسی حالت میں انگریزوں کی تخمیناً تین سو سالہ حکومت تو ملک ہندوستان کو سرسبز بنانے کے لئے کافی تھی۔ مگر افسوس کہ ہندوستان ہر اعتبار سے تنزل کی جانب قدم بڑہا رہا ہے۔

قاضی نثار احمد خان کاوری

اخباری دنیا میں

ضرورت کے موافق اضافہ

چالاک لیڈر

۱

منشی حسن رضا خاں صاحب لکھنؤ کے قدیم باشندے اور اچھے خوشنویس تھے
حضرت محمد واجد علی شاہ اختر آخری شاہ اودھ کے زمانے میں دیوان خانے کے منشی تھے
سادہ لباس سادہ وضع کے آدمی تھے۔ نہایت متدین نیک نام اور ممتاز لوگوں
میں ان کا شمار تھا اعزا میں ان کی بہت عزت تھی۔ کفایت شعار بہت تھے۔
اور جو روپیہ پس انداز ہوتا تھا وہ قوم کی بیواؤں اور یتیم بچوں کی خدمت میں صرف
کرتے تھے۔ اور برادری کے اکثر لوگ ان کے ممنون احسان تھے۔ کنبہ پرور تھے
دس پندرہ آدمیوں کی روٹی ان کے سر تھی۔ ہمیشہ دو ایک مہمان بھی گھر میں رہتے تھے۔
بیوی بھی بہت سادہ مزاج اور نیک تھی خدا نے دونوں کو ایک مزاج
کا بنایا تھا۔ اپنی ذات پر روپیہ بہت کم خرچ کرتے تھے۔ لیکن ہمیشہ دوسروں کے
ساتھ احسان کر کے خوش ہوتے تھے۔

غدر کے بعد ان کے تمول کو زوال ہوا اور بیکار بھی ہو گئے تھے۔ تاہم آدمی
تھے ہوشیار بیوی کا زیور بیچکر اور جو کچھ روپیہ اپنے پاس موجود تھا۔ اس سے کچھ زمینداری
کا ٹھیکا لیا تھا۔ جس سے چھ سو روپیہ سالانہ کی آمدنی گھر بیٹھے ان کو پہنچ جایا
کرتی تھی۔

غدر کے بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اور ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ لاولدی کا غم
ان کو بہت تھا لیکن سن پچاس برس سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اس سبب سے
دوسرے عقد کا خیال مطلق نہ تھا۔ مگر عزیزوں نے نیک مزاجی اور خوشحالی کے
سبب سے ان کو پھر پھانسا اور ایک شریف عورت سے عقد ثانی کرا دیا۔ شادی کے

سات برس بعد خدا نے ایک بیٹا دیا۔ اس خوشی کا کیا پوچھنا ہے جو نا اُمیدی کے بعد حاصل ہوئی ہو۔ اس تقریب میں خانصاحب کی بہت دولت خرچ ہوئی۔ مگر سب قوم کے پیٹ میں گئی۔ ناچ گانے میں ایک پیسہ نہیں اُٹھایا۔ نوکر چاکر حقدار امیدوار کو انعام اکرام تقسیم ہوئے۔ دوست احباب کی دعوتیں ہوئیں۔ لڑکے کیلئے انا رکھی گئی اور بہت ناز نعم سے پرورش پانے لگا۔ عباس رضا خاں نام رکھا گیا چھٹا برس شروع ہوا تو خانصاحب کو پڑھانے کی فکر ہوئی۔ مگر اس زمانہ میں انگریزی کا آغاز تھا۔ علیگڈھ کالج میں سید احمد خاں کا مدرسہ کھل چکا تھا۔ اور مسلمانوں کا میلان خاطر انگریزی کی طرف ہو چلا تھا۔ اور اس کو بہترین ذریعہ معاش تصور کرتے تھے۔ عام رائے تو یہ تھی کہ صاحبزادہ بلند اقبال کو تعلیم دلائی جائے۔ مگر خانصاحب بہادر کی رائے اس کے خلاف تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ آدمی کی عزت اپنی مادری زبان سے ہے۔ ہندوستان کی خلقت بھیڑی دہسان ہے جس طرف ایک بھیڑی جاتی ہے اسی طرف سب بھیڑیاں بھاگتی ہیں۔ چاہے نقصان ہو یا نفع انگریزوں نے حال میں ہندوستان پر قبضہ کیا ہے وہ تو اپنی مادری زبان کو چھوڑتے نہیں اور اپنے آرام کے لئے کچہریوں کے دفتر انگریزی میں کرنا چاہتے ہیں۔ لتنے انگریز کہاں سے آئیں جو تمام عملے کو کافی ہوں۔ لہٰذا مدارس میں انگریزی تعلیم جاری کی۔ سید احمد خاں نے میرے نزدیک یہ بڑی غلطی کی ہے جو انگریزی میں مدرسہ کھولا ابھی وہ ایک ٹھوکر اٹھا چکے ہیں یعنی خود تو انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتے۔ اور مدرسے کا خزانچی اور محاسب ایک ہندو انگریزی داں نوکر رکھا۔ اور جمع خرچ انگریزی میں لکھوایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خزانچی نے کئی ہزار کی رقم غبن کر لی۔ جب یہ راز کھلا تو اپنا منہ پیٹ کر رہ گئے اور خاموش ہو رہے۔ مجھ سے اکثر کہا کرتے ہیں کہ اس رقم کا داغ میرے کلیجے پر اب تک ہے۔

خانصاحب کا خیال تھا کہ انگریزی زبان ہم کو کچھ فائدہ نہیں دیسکتی۔ اور اس سے آیندہ ہندوستان کو بہت نقصان اٹھانا ہوگا۔ بچے تو میں انگریزی زبان سیکھ کر صیغہ ملازمت کی خاطر ہی کریں گی۔ حاکم کچہریوں کے دفتر انگریزی میں بدل دیں گے۔ وہ اُردو کو غیر ضروری سمجھکر خود ہندوستان کی زبان بغیر سیکھے ہوئے ہندوستان پر حکومت کریں گے۔ ایک بہت بڑے فرقے کی جو محض ہندوستانی زبان جانتا ہے حق تلفی ہوگی۔ اور ہندوستان میں بے چینی پھیلے گی۔ حکومت کا دارومدار آگاہی رسم ورواج ملک پر ہے۔ حکام ہندوستان کی طرز معاشرت اور رسم ورواج سے نابلد ہوتے جائیں گے۔ حاکم محکوم میں نفرت پھیلتی جائے گی۔ عام رعیت کی آواز نہ سنی جائے گی ایک خاص فرقہ اپنا ذاتی نفع اٹھانے کی غرض سے اس کے دور کرنیکی کوشش نہ کریگا۔ خدا اس زمانے سے محفوظ رکھے۔ لیکن کرتے کیا زمانے کی روش اسوقت یہی تھی۔ آخر خانصاحب کو اپنی رائے بدلنا پڑی اور سال بھر میں قرآن شریف گھر پر پڑھوا کر علیگڈھ کالج میں تو نہ بھیجا۔ کیونکہ ماں کی مرضی نہ تھی۔ لیکن شہر کے اسکول میں انگریزی تعلیم حاصل کرنیکی غرض سے بھیجدیا۔

۲

گھر سے نکلکر لڑکا اسکول میں داخل ہوا تو اس نے نئی دنیا دیکھی اسکول میں کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ ماسٹر صاحب انگریزی پوشاک میں کیسے کسائے بیٹھے ہیں۔ اگرچہ خود ہندوستانی ہیں مگر ہندوستان کی ایک ایک چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

سامنے کرسیوں پر شہر کے دھوبی تیلی۔ لوہار چمار بھنگی بھڑبھونجے کے لڑکے اپنا اپنا پیشہ چھوڑ کر ڈپٹی صاحب بننے کی خوشی میں دماغی کوشش کر رہے ہیں۔ زمانہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ آیندہ تمام ہندوستان کی قسمتوں کا فیصلہ

انھیں لوگوں کے قبضہ قدرت میں ہوگا سب ہشاش بشاش بیٹھے ہیں۔ اور کوٹ پتلون سے لیس ہیں۔ کوئی چیز ہندوستان کی بنی ہوئی ان کے پاس نہیں ہے۔

مذہبی باتوں کا کہیں ذکر تک نہیں ہے سب آزاد خیال گھر میں تو بڑے خانصاحب کے حکم سے پانچوں وقت کی نماز پڑھنا پڑتی تھی۔ اسکول میں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ہندو کون ہے مسلمان کون اور عیسائی کون ہے۔ ایک لباس غرض ہی

—: ۳ :—

ابھی ایف اے میں تعلیم پا رہے تھے کہ خانصاحب کا انتقال ہوگیا۔ صاحبزادہ بلند اقبال نے ماشاءاللہ سے بیس برس کی عمر میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ مگر لباس پوشاک طرز معاشرت میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا۔ پچاس روپیہ ماہوار کی آمدنی زمینداری سے باقی رہگئی تھی وہ جدید پوشاک کی تیاری کو کافی نہ ہوتی تھی۔ ملازمت کو ہمیشہ سے مسٹر عباس رضا خاں حقیر سمجھتے تھے۔ اور تجارت کے مداح تھے میلان طبعیت کچھ ایسا ہی واقع ہوا تھا۔

آپنے دوستوں سے مشورہ کرکے گاؤں نیلام کرکے چند پریس اور ایک مکان خرید کیا۔ اور اپنے مطبع کا نام عباسی پریس رکھا۔

اسی ضمن میں ایک ہفتہ وار اخبار کی اشاعت شروع کی جس کا نام دوستی تھا مسٹر عباس کی تحریر کی تعریف تمام ہندوستان نے کی اور ان کی پولٹیکل رائے زنی کو ہندوستان کے معتدد اخبارات نے نقل کیا مدات دن دوست احباب کے خط آنے لگے۔ اور اخبار کے نمونے طلب ہونے لگے۔ کچھ ناول مسٹر عباس نے ملک کے نامور اہل قلم سے کثیر معاوضہ دیکر خرید کئے وہ طبع ہونے لگے۔

اخبار کی اشاعت کو ابھی سال بھر بھی نہ ہوا تھا۔ کہ گورنمنٹ سے چار ہزار کی ضمانت طلب ہوئی۔ بہت کوشش کی کہ یہ بات معلوم ہو جائے آخر کس خطا پر نجا

دوستی سے ضمانت طلب کی جاتی ہے ایڈیٹر تو گورنمنٹ کا پرانا خیر خواہ ہے آجتک کوئی مضمون ایسا نہیں لکھا۔ ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے بہت گہری ملاقات تھی۔ ان سے اپنی حالت کا کچا چٹھا بیان کیا۔ کہ میرے سرمایہ میں کل پچاس ہزار روپیہ تھا پیس ملیں خریدی گئے کچھ کتابیں تصنیف کرا کر چھپوائیں۔ اخبار جاری کیا۔ اور امید تھی کہ ذریعہ تجارت ہوگا۔ لیکن اب چار ہزار روپیہ ضمانت کا بے خطا بے قصور طلب کیا جاتا ہے میںنے آجتک ایک حرف بھی گورنمنٹ کے خلاف نہیں لکھا ہمیشہ ہندوستانیوں کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ پھر بے قصور اخبار کی ضمانت کیوں طلب کی جاتی ہے۔

کم سے کم مجھکو وہ عبارت دکھا کر مطلب سمجھا دیا جائے جس کو گورنمنٹ نے قابل اعتراض تسلیم کیا ہے۔

ڈپٹی کمشنر بہادر نے فرمایا ہم کو اچھی طرح حالت معلوم نہیں۔ نہ ہم اُردو کی ایسی قابلیت رکھتے ہیں۔ جو تمہارے اخبار پر نکتہ چینی کریں لیکن ہمارے عملے کے قابل لوگوں نے جا بجا اس پر ریمارک کر کے قابل ضمانت تجویز کیا ہے۔

مسٹر نے کہا حضور یہ محض دشمنی ہے اور زبردستی لوگوں نے یہ الزام قایم کیا ہے مگر ایک سماعت نہ ہوئی۔

آخر اخبار بند ہوگیا۔ لیکن مسٹر عباس کو چین کب تھا۔ آخر شہر کے رئیس نواب بہادر سے استدعا کی گئی۔ انھوں نے بطور قرض پانچ سال کی ادائی پر روپیہ مرحمت فرمایا۔

اتفاق سے جدید سڑکیں میونسپلٹی کی طرف سے تعمیر ہو رہی تھیں۔ بعض سڑکیں چوڑی کی جاتی تھیں۔ ایک سڑک میں ایک شہید مرد کی قبر پڑتی تھی جس کے کھودنے پر مسلمان ناراض تھے۔ اور سب نے اتفاق کر کے صاحب ڈپٹی کمشنر سے درخواست کی تھی کہ سڑک ہٹکر بنائی جائے قبر کے کھودنے میں

مذہب اسلام کی سخت توہین ہوتی ہے۔ اور یہ قبر آثار قدیمہ میں داخل ہے۔ ڈپٹی کمشنر بہادر نے فرمایا گورنمنٹ اس کا معاوضہ دینے کو تیار ہے۔ تم اس قبر کو مع تعوید قبر و استخواں اٹھا کر کسی دوسری جگہ تیار کر لو۔ اور تمہارے مشہور مقامات ہمیشہ گورنمنٹ نے محفوظ رکھے ہیں۔ سڑک ضرور نکلیگی اور قبر کا کھدنا لازمی ہے۔

اس سے مسلمان بہت برخواستہ خاطر ہوئے۔ اور انھوں نے ایک میموریل لفٹننٹ گورنر کی خدمت میں روانہ کیا۔ ایک جلسہ اس کارروائی کے خلاف کر کے مخالفت میں رزولیوشن پاس اور جلسے کی خبر بذریعہ تار گورنمنٹ کو دی۔

صاحب ڈپٹی کمشنر نے اپنے خلاف مسلمانوں کا جوش دیکھکر مسٹر عباس رضا کو طلب فرمایا۔ اور اُن سے کہا دوست کوئی ترکیب ایسی نکالو کہ اس وقت بات رہجائے مسلمانوں نے ہمارے خلاف کارروائی شروع کی ہے۔ مسٹر عباس رضا کی جو اس قدر عزت ہوتی تو مارے خوشی کے ان کی باچھیں کھل گئیں آپنے کہا حضور یہ کتنی بڑی بات ہے۔ آپ قبر کو پولیس کی مدد سے صبح کو کھدوا دیجیے میں اس کا ذمہ وار ہوں۔ مسلمان لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ میں یہاں کے مسلمانوں کے دستخط بھی کرا دونگا۔

دوسرے روز صاحب بہادر نے قبر کے کھودنے کا حکم جاری کر دیا۔ اور مسٹر عباس رضا سے دستخط کرا لئے کہ میرے علم میں مسلمانوں کی اس سے کوئی توہین نہیں ہوتی ہے۔ صرف ان کو معاوضہ دیدیا جائے۔

شہید کی قبر کھودی گئی۔ پولیس کا چاروں طرف پہرا تھا۔ فوج کھلی ہوئی سنگینیں لئے کھڑی تھی۔ اطراف و جوانب سے مسلمان کٹنے مرنے کو دور دور سے آرہے تھے۔

مولوی فضل الٰہی وعظ کہہ رہے تھے۔ کہ مسلمانوں کو ایسے موقع پر خاموش رہنا چاہیئے صبر کا پھل اچھا ہوتا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْن خدا چاہے گا تو ظالم ڈپٹی کمشنر کو تمام شہر کی دل آزاری کی اچھی طرح سزا ملے گی۔ دیکھو تو خزانہ غیب سے کیا ظہور

میں آتا ہے۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی خیریت سے گذر گیا۔

—: ۴ :—

دوسرے دن مسٹر عباس رضا تمام دوکانداروں سے دستخط کرا رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں دیکھو تو ڈپٹی کمشنر بہادر کو اس ظالمانہ کارروائی اور مذہبی دست اندازی کا کیسا رنج ہوا کہتا ہوں۔ بس آپ لوگ دستخط فرما دیں۔ تمام مسلمان خوشی خوشی دستخط کر رہے ہیں۔ ایک ہفتہ بھر یہ کارروائی جاری رہی۔ جب دستخط ہو چکے تو مسٹر عباس رضا نے اس پر انگریزی میں یہ عبارت لکھی:-

"ہم تمام مسلمانان شہر جن کے دستخط تحت عرضی میں ہیں۔ اس بات سے راضی ہیں کہ صاحب ڈپٹی کمشنر اس قبر کو جو سڑک میں آتی ہے کسی دوسرے عمدہ مقام پر بجنسہٖ منتقل کرا دیں۔ راقم فلاں فلاں رؤسائے شہر بقلم خود"

اس درخواست کو مکمل کر کے مسٹر عباس رضا صاحب بہادر کے بنگلے پر دوڑتے ہوئے پہنچے۔ اور ان سے کہا حضور قسم قرآن کی آج میں نے وہ کام کیا ہے جو لاکھوں روپیہ خرچ کر کے حاصل نہ ہوتا۔ عام لوگوں نے اپنی رضامندی سے دستخط کر دیئے۔

ڈپٹی کمشنر بہادر اس درخواست کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور مسٹر عباس رضا سے کہا تھنکیو۔ اور دبی زبان سے یہ بھی کہا موقع ملا تو اگلی سال تم کو خان بہادر کا خطاب گورنمنٹ سے دلوایا جائے گا۔

جب مسلمانوں کا میموریل لفٹنٹ گورنر بہادر کی خدمت میں گیا۔ تو دریافت حال پر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر نے مسٹر عباس رضا والی درخواست لفٹنٹی بھیجدی۔ صاحب لفٹنٹ بہادر نے وہ درخواست مسلمانوں کے نمایندوں کو دکھا دی۔ ان لوگوں

نے اس کی باضابطہ نقل حاصل کی۔ اور ڈپٹی کمشنر بہادر سے کل واقعہ بیان کیا۔ کہ مسلمانوں سے ایسا ہرگز نہیں کہا گیا۔ ان کو سخت دھوکا دیا گیا۔

مسٹر عباس رضا کو جب مسلمانوں نے اپنے جلسے میں طلب کر کے استفسار حال کیا۔ تو انھوں نے بقسم بیان کیا میں نے ہرگز ایسا نہیں کیا ہے۔ یہ ڈپٹی کمشنر بہادر کی جعلسازی ہے میں اس پر اخبار میں نوٹس لونگا۔

جو لوگ دانشمند تھے وہ تو اصل معاملہ کی تہ تک پہنچ گئے۔ لیکن ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ اگر یہ مقدمہ چلایا جائے گا تو پہلے تو مسٹر عباس رضا کو سخت سزا ہو گی۔ اور شاید ڈپٹی کمشنر بہادر بھی اس ضلع سے بدنامی کے ساتھ بدل دئے جائیں لیکن اگر مقدمہ حسب دلخواہ فیصل نہ ہوا تو صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سے ہمیشہ کی عداوت ہو جائے گی۔ اور وہ اس وقت برسر حکومت ہیں ہر طرح آبروریزی کرنیکا اختیار حاصل ہے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے۔

صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کو جب یہ معلوم ہوا کہ مسٹر عباس رضا نے عام مجمع میں بقسم بیان کیا کہ میری کاروائی اس کے خلاف تھی۔ صاحب ڈپٹی کمشنر نے اس پر جعل بنایا ہے تو وہ بہت برخواستہ خاطر ہوئے

عام مسلمانوں نے عباس رضا سے نفرت ظاہر کرنے کو ان کے اخبار کی خریداری بالکل بند کر دی اور جہانتک بس چلا۔ اور لوگوں کو بھی منع کیا۔ چھ ہزار اخبار کی اشاعت تھی دو سو کے قریب رہگئی۔

صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر نے ضمانت کا روپیہ سوخت کر کے اور دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کی۔

بوہیٔ ساہو شہر نے جو روپیہ قرض دیا تھا۔ نالش کر کے مطبع اور مکان نیلام کرالیا دو برس تک مسٹر عباس رضا شہر شہر کی خاک چھانا کئے۔ کسی اخبار کی ایڈیٹری ملجائے۔ مگر

کوئی صورت ظہور میں نہ آئی۔ آخر مجبور ہو کر تیس روپے مہینے کی ملازمت ڈاکخانے میں کر لی۔ اب نہ وہ کوٹ ہے نہ پتلون۔ تیس روپے میں بیوی بچوں کو پیٹ بھر روٹی تو میسر نہیں آتی۔ رات دن فاقے اور مصیبتوں کا سامنا ہے۔ انگریزی بال کٹوائیں تو ۲ مرخرچ ہوں۔ سید سے مسلمان بن گئے ہیں۔ سر منڈا ہوا لمبی ڈاڑھی۔ چمار خانی جوتہ۔ تن زیب کی اچکن چالٹین کے گھٹنے۔ پانچوں وقت نماز پڑھتے ہیں۔ اور اللہ سے توبہ کرتے ہیں۔ لیکن ابھی تک مسلمانوں کو ان سے اطمینان حاصل نہیں ہے۔ اور کہتے ہیں یہ اب خفیہ پولیس ہو گیا ہے۔ مسجدوں میں مسلمانوں کی حالت دریافت کرنے آتا ہے۔ فقط

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت

لکھنوی

نامہ نگاران و خریداران مخزن! مخزن کی خدمت ہندوستان میں ایسی خدمت نہیں ہے جس کو آپ حضرات نہ جانتے ہوں۔ اب اس کی خاص ترقی کا قصد ہے۔ اس لئے کہ اردو زبان میں یہ رسالہ ادبی۔ تمدنی۔ اخلاقی رسالہ ہونیکی حیثیت سے بہت کچھ ترقی کرنیکا محتاج ہے اسوقت اس کیلئے ہمکو ایک فاضل شخص بھی میسر ہے جو مصر و قسطنطنیہ میں ۱۲ سال تک تعلیم پاکر ہمارے ہاتھ آیا ہے یہ شخص عربی۔ ترکی۔ فرانسیسی میں ایم۔ اے ہے۔ مخزن عربی۔ ترکی۔ فرانسیسی انگریزی میگزینوں سے مضامین پیش کریگا۔ بعض مشورہ طلب مطالب کے لئے ہمارا اڈیٹر سفر کریگا۔ اور اگست سے ستمبر تک یہ مقالات ہونگے۔ سفرنامۂ ڈاکٹر حکیم ایس ایس وارثی۔ سند یافتہ قسطنطنیہ ایم اے حمیدیہ کالج و سیاح یورپ۔ اڈیٹر مخزن لاہور۔

دہلی۔ میرٹھ۔ سہارنپور۔ نگینہ۔ بجنور۔ مرادآباد۔ علیگڈھ۔ رامپور۔ بریلی۔ شاہجہانپور ہردوئی۔ بلگرام۔ لکھنؤ۔ سیتاپور۔ فیض آباد۔ کانپور۔ الہ آباد۔ اٹاوہ۔ آگرہ۔ گوالیار۔ متھرا۔ بھوپال

حریت و مساوات

اُفق اسلام پر نیر تاباں کی طرح جو زمانہ چمکتا ہے وہ عہد خلافت امیر المومنین حضرت عمر رضہ ہے آپکی سوانحات عمری فتوحات کی ہسٹری ایسی نامعلوم یا موجز نہیں کہ تھوڑی سی خامہ فرسائی سے تکمیل پا سکے۔ اس کیلئے تصانیف ہر ایک کتبخانہ کی الماریوں میں موجود ہیں بالخصوص زبردست مصنفان یورپ مثل سر ولیم میور وغیرہ منتقدر اشخاص کے پر زور قلم سے بھی آپ کے کارہائے نمایاں کی تائید ہو چکی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل بضرورت بہ حرف ملاحظہ ہو (انلس اف ارلی خلافت) مولفہ سر ولیم میور صفحہ نمبر ۳۔ یہاں فقط اس اصول کا ذکر ہے۔ جس کی رو سے آجکل تمام ممالک متمدنہ حیرت انگیز ترقیوں کا منظر دکھا کر اپنے تئیں قابل فخر و ناز سمجھتے ہیں۔ اب اسمیں بنظر انصاف یہ امر غور طلب ہے کہ کسی مہم کے انجام تک پہنچانے میں دقتوں کے پیش آنیکا کون وقت ہوتا ہے جس کے تسلیم میں غالباً کسیکو تامل نہ ہوگا کہ ہر ایک نئے قانون کے افتتاح میں وہی زمانہ زیادہ تر مشکل ہوتا ہے جسمیں اس کی سنگ بنیاد کے رکھنے کا قصد کیا جائے۔ کیونکہ ہر ایک نئے کام پر نتیجہ کے نامعلوم ہونیکی وجہ رکاوٹ کے شدید حملے ہوتے رہتے ہیں۔ ہوم رول انگلش کے ریفارمروں نے بھی میرے خیال میں اسی بنا کی عمارت کو اپنے پر تکلف فرنیچر سے سجایا جس کا ابتدا عہد خلافت امیر المومنین میں ہوا تھا۔ اہل روما و ایرانیوں کی سلطنت میں محکوم اور زیر فرمان رعایا کو جو کہ بنی نوع انسان میں تھی مال مویشی کا حکم تھا رعایا آزاد نہ تھی بلکہ غلام تھی۔ غریب کاشتکاروں کو مالک زمین زمین کیساتھ فروخت کرنیکا مختار تھا۔ اگر وہ بھاگ جاتے یا کوئی بھگا لیجاتا تو انکی نسبت اسی طرح دعوی کیا جاتا جیسا کہ مال مویشی یا کسی اسباب کی نسبت کیا جاتا ہے۔ اسمیں بھی اعلیٰ اور ادنےٰ کیواسطے ایک قانون نہ تھا مالک زمیندار۔ جاگیردار یعنی دہقان اور مذہبی پیشوا تمام قوت اور رعب داب ملک کی دولت کے مالک تھے۔ بیچارہ کسان و رعایا اس ناجائز و بیضابطہ وغیر محدود خود مختاری کے تحت میں پیوند

ہو گئے تھے۔ ابتداءً مزارع وخانگی غلام میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں قسم کے لوگ مع
اپنے کنبہ ومال وجائداد وگھر کے زمیندار وجاگیردار کا مال تھے۔ جو اُن سے حسب مرضی سلوک کر سکتے
تھے۔ اس کے بعد مزارعانہ غلام اسی زمینداری کے متعلق سمجھے جانے لگے جس میں وہ رہتے
تھے۔ تمیز کیلئے خانگی غلامی ومزارعانہ غلامی کا نشان بھی مقرر ہو گیا جو ایک لوہے کا حلقہ
تھوڑے فرق سے ہر دو گروہ کے گلے میں ڈالا جاتا تھا۔ جو کاشتکار برائے نام آزاد کہلاتے
تھے۔ انکا حال بھی مزارعانہ غلاموں سے کچھ اچھا نہ تھا۔ اگر وہ اپنی زمینوں سے علیحدہ ہونا چاہتے
تو ان کو جرمانہ کی کچھ رقم ادا کرنی پڑتی۔ نہ ان کو وراثت کے طور پر کوئی جائداد مل سکتی
تھی۔ جاگیردار اپنی محلسرا میں اور پادری اپنے گرجا میں عوام الناس کی مصیبتوں کی بہت
کم پروا کرتے تھے۔ زبردست کی مرضی ہی قانون تھا۔ عیسائیوں کے ہاں غیر اقوام
مثلاً یہودی یا بت پرستوں کے حقوق کا تو کیا ذکر ان پر یہی بڑا احسان تھا کہ ان کو زندہ
رہنے دیا جاتا تھا۔ یہودی نہ تو عیسائیوں کی برابر بیٹھ سکتے نہ انکی مانند لباس پہن سکتے
تھے۔ غرض یہ تاریکی دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ کہ سب سے بڑے نجات دہندہ نے (حضور
سرور کائنات نے) بذریعہ اسلام نوع انسان کی عملی حُرّیت ومساوات کو دنیا میں
مشتہر کیا۔ اور آپ کے بعد خلفائے راشدہ خصوصاً حضرت عمرؓ نے حریت ومساوات
کے وہ سین دنیا کو دکھائے کہ آجتک زمانہ مانتا ہے۔ باوجود خلیفۃ المسلمین ہونے کے
ایک سفر میں آدھے راستہ خود اونٹ پر سوار ہوئے اور آدھے راستہ آپکا غلام۔ اور لطف یہ کہ
شہر میں داخلہ کیوقت اونٹ پر سوار ہونیکی باری غلام کی تھی اور آپ مہار پکڑے ہوئے تھے
کیا آجکل حُرّیت ومساوات کے مدعی کوئی ایسی نظیر پیش کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازاں
غیر اقوام مفتوحہ کے ساتھ الحمد اللہ خلیفۃ المومنین کا برتاؤ کیسا منصفانہ تھا کہ خالد سے
بہادر وجری سپہ سالار کو صرف اس بنا پر واپس بلا لیا گیا کہ وہ مفتوح قوم کے ساتھ کسی قدر
سخت برتاؤ کرتے تھے۔ عملی مساوات اس کا نام ہے۔ راقم راجہ شیر علیخاں جاگیردار اچولہ

ڈاکٹر حکیم ایس ایس وارثی پنشنر قونسل سرجن قسطنطنیہ

یہ تصویر ہمارے ایڈیٹر کی ہے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۲۵ سال ہے ۰ برس کی عمر میں انھوں نے ہندوستان چھوڑا۔ حدیث۔ قرآن و فقہ وغیرہ کی کتابیں مکہ معظمہ میں پڑھکر مصر چلے گئے۔ ۷ سال مصر کے کالج میں علوم قدیم و جدید کے حاصل کرنیکے بعد قسطنطنیہ کے کالج میں منتقل ہو گئے۔ ۶ سال قسطنطنیہ میں اس طرح صرف ہوئے کہ ۳ سال قسطنطنیہ رہکر فرانسیسی زبان کا ایک امتحان دیا۔ اور ۷ ماہ فرانس میں رہکر پھر قسطنطنیہ واپس آئے۔ پھر چار سال میں آخری ایک سال فرانس میں صرف ہوا جس کے بعد ٹرکش کونسل میں انکی ملازمت شروع ہو گئی۔ یہ سات زبانوں میں ایم۔ اے ہیں۔ اس سال پنشن لیکر یہ ہندوستان آ گئے۔ اور لاہور میں مخزن نے ان کو اپنا مدعو بنایا۔ اور اب یہ اس کی اڈیٹری کر رہے ہیں۔ ٹرکش فوج میں انکی ڈاکٹری کا جسقدر زمانہ گذرا وہ ایک مقام پر نہیں گزرا۔ اسوجہ سے یہ یورپ کے اکثر ممالک کے بڑے سیاح ہیں۔ علاوہ فن طب کے ان کو نامہ نگاری کا موقعہ بھی زمانِ طالب علمی سے لیکر آجتک ہوتا رہا ہے۔ اللوا۔ اور طنین کے کالم ان کے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس پرچہ میں آپ کی تصویر صرف اس وجہ سے نہیں دیگئی ہے کہ لوگ صورت آشنا ہو جاویں بلکہ مخزن کی چند ضروریات کی وجہ سے آپ کو سفر لازمی تھا۔ اور ۱۹۔ اگست کو لاہور سے سوار ہو کر یو پی اور بہار چھوٹا ناگپور وغیرہ کے عازم ہوئے۔ اس سفر میں چند مقاصد ہیں جن کو ہم پبلک کو پیش کئے دیتے ہیں اور بعد اڈیٹر کے پہنچنے کے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

اوّل۔ ہندوستان کے معزز رؤسا اور نامہ نگار بالخصوص قابل ذکر ہیں نیکے ایسے

گمنامی کے احاطے میں گھرے ہوئے ہیں۔ کہ ان کو ہندوستانی بھی کم جانتے ہیں۔ بخلاف اس کے یورپ کے رؤسا اور نامہ نگار ہندوستان تک میں مشہور ہیں۔ جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یورپ کے اخلاقی پرچے ان کے تذکروں میں کالم کے کالم بھر دیتے ہیں۔ اور ہندوستان کے اخلاقی پرچے سوائے شوقیہ مضمون کے اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ لہذا رؤسا رسے انکی مختصر سوانح عمری اور تصویر لیکر فروگ چھاپی جایا کرے۔ بڑے بڑے پائے کے نامہ نگاروں کی تصویریں اور لطائف لیکر ان کے مضمون کے ساتھ پبلک میں پیش کیا جایا کرے۔

دوم۔ مخزن مضامین کی دنیا میں جس قدر کامیاب پرچہ ہے۔ وہ اپنی ترقی کے اعتبار پر ہندوستانی پرچوں میں کم کامیاب نہیں۔ مگر جس قدر کامیابی کی اس کو ضرورت ہے اتنی کامیابی اسوقت تک نہیں ہوئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انگلینڈ فرانس۔ قسطنطنیہ مصر یا اور بڑے بڑے مقامات سے پرچہ منگوائے جائیں۔ اور انکو اردو کے رنگ میں رنگ کر یورپ کے اخلاق سے تبادلہ کیا جاوے۔ پھر وہ پبلک کو پیش کئے جایا کریں۔

سوم۔ نئے مضامین اور پرانے مضامین یا ہر مضمون کے رنگ پر جداگانہ محاکمہ کیا جایا کرے۔ تاکہ اردو زبان کی وسعت پر تنقید کا موقعہ ملے۔

چہارم۔ مخزن کے اس رنگ کو یا تو بحال رکھنے کی کوشش کیجاوے جو موجودہ حالت میں ہے۔ یا اس رنگ میں کوئی دوسرا رنگ ملایا جائے بشرطیکہ کثرت رائے سے فیصلہ ہو۔

میں امید کرتا ہوں کہ اڈیٹر سے ملکر پبلک کو خوشی ہوگی۔ اور وہ والپسی پر میز بانوں کے شکریہ میں مضمون لکھنے پر مجبور ہونگے۔ منیجر

حضوری

اے دوست دوائے درد سازی — ہجران بسپردہ نوازی
تاریکی ہجر را چہ سامان — آوازہ وصل ترک نازی
صحرائے محبت نورد ما بود — محنت خونی و عشقبازی
یعنی کہ حریم کعبہ دل — چوں بتکدہ ایست بے نیازی
تار رم آہوان صحرا — لیکن بکشیدہ و بازی
طوفان سرم بسوخت ساماں — زین گریہ غم بلائے آزی
خونی جگرم بہ عید رمضاں — ما مہر کشیم و بے نیازی

زنگیونہ کہ ہجر یار دارم
جان و دل را نثار دارم

دامان سحر کا چاک سی کر — گل ذورق شجر اع کردوں
یا کوہ ہمالیہ پہ جا کر — شبنم کے عوض میں چشم تر دوں
بیگانہ ہے سبزہ آنکھ کر بند — میں محتسب ہو کے آب زر دوں
موہوم ہے ہستی زمانہ — سودا نہیں چاہتا تو سر دوں
تو خلوت دل میں بیٹھ آکر — میں گوشہ عافیت کا در دوں
ہرجائی ہے تیری ذات بیچوں — تقید کا رنگ اس میں کیوں دوں
تم اور طعنی گھاس کی نہ اوڑھو — دیبا و حریر سے سنوار دوں
جنگل مجنون بادیہ ہے — میں آپ کو پاک صاف گھر دوں
ہو صنعت حسن سے اگر لاگ — دولاکھ حسین جمع کر دوں

سنسان میں دل لگی کہاں ہے — دل ویراں کو نذر کر دوں
مانا چشمہ یہاں رواں ہیں — میں چشمہ چشم چشم تر دوں
پھولوں کی بہار دیکھنا ہے — میں زخم جگر کو باغ کر دوں

صحرا میں نہ جاؤ جانِ جاناں!
یہ ٹھیک نہیں ہے منہ چرانا

ایں ظلمت شب کہ تیرہ راہ ست — سنگین سیاہیش گواہ ست
صد کبریا او کمین کاہ ست — افتادہ ہزار زیر چاہ ست
کیں زیں قدر رحم امید داری — واللہ کہ حال دل تباہ ست
رحمت بچہ بادہ ایست یارب — نالاں لغزاق خندہ راہ ست
ایں وفا اگر ہمیں ست — بسیار تپید تم گواہ ست
گر عزت دوستاں چنیں بود — خورسندو لیم دل تباہ ست
گر دولت بندگاں لقدرست — بیدام شدن طریق ما ہست

گر دار و رسن امید ما داشت
ہر دانہ کہ کشتنم ہمیں کاست

اسلام کا کیا قصور پیارے — ایمان تو دیکھ لو ہمارے
عاصی ہیں گناہگار بھی ہیں — خجلت سے ہیں شرم کے بھی مارے
اعمال برے بھلے ہیں لیکن — خادم ہیں غلام ہیں تمہارے

سمجھا ہے تم ہی کو جان جاناں
اسلام کے نام پہ ہیں قرباں

آتی ہیں گھٹائیں چار سو سے — قلقل کی صدائیں چار سو سے
مینا سو رنگ ڈھل رہا ہے — مشکیں ہے دماغ جس کی بو سے

رنگیں ہیں لباس اک جہاں کے — مسلم کے شہابہ لہو سے
ہوتی ہی نہیں نماز واللیل — اس نیم شبانہ وضو سے

توحید سے شرک مل رہا ہے
بازیچہ میں لا کھل رہا ہے

اے رحمت مسلمین فریاد — اے آیت مسلمین فریاد
اے شوکت عالمین فریاد — اے محسن لب یقین فریاد
آمادہ ہے کارزار ہستی — اے روح رہ امین فریاد
مٹتے ہیں تمہارا نام لیکر — اے مالک سرزمین فریاد
ہے موسم گل میں چاک ہستی — اے قطب رہ معین فریاد
ہو بھی کرم کوئی اشارہ — شاہنشہ راہ دین فریاد
رخصت اسلام ہو رہا ہے — اے وارث آئین فریاد

اس درد کے چارہ گر تم ہی ہو
اس سوز کے دادگر تم ہی ہو

تسکین بجاہ یہ خدارا — تعیین بعنایہ خدارا
تعطی بعطایہ خدارا — اشفی بشفایہ خدارا

اکرم بجاہ امت سلیم
ادرک بلقائہ کریم

رباعیات

اول ہی سے ہے مزاج عاشقانہ میرا — مطلوب ہے وہ شاہ یگانہ میرا
باغ احدیت کی میں اک بلبل ہوں — اور وحدہٗ لاشریک ہے ترانہ میرا

کتنا یہ عمل ہے جاہلانہ میرا ہے غیر سے ربط مشفقانہ میرا
ہے نفس لعیں سے اُنسیت کیا کیا کچھ دشمن سے بہت ہے دوستانہ میرا

ہے قابل افسوس فسانہ میرا سب مکر و فریب میں کٹا زمانہ میرا
کیا حشر کے روز حشر ہوگا اقبال جائیگا نہ پیش کچھ بہانہ میرا

ہر طرز و طریق زاہدانہ میرا پھر اس پہ لباس صوفیانہ میرا
ظاہر تو یہ ہے مگر بباطن اقبال دل کینہ و شر سے ہی سیاہ خانہ میرا

افسوس وہ اب کہاں زمانہ میرا تھا دل میں حسینوں کے ٹھکانہ میرا
اب تیرے لئے وقف ہی عہد پیری اے ضعف کبھی شباب تھا نہ میرا

دشمن ہے ہر ایک غائبانہ میرا ہے مدعی آجکل زمانہ میرا
پر خوف نہیں بفضلہٖ تعالیٰ اقبال جب تک ہے جہاں میں آب و دانہ میرا

ہے دل بھی عجب آئینہ خانہ میرا روشن ہے کلام عارفانہ میرا
ہے بلبل طبع مظہر معانی اقبال کشاف رموز ہے ترانہ میرا

نیازمند محمد اقبال سہارنپوری

راز ہستی

ہوشیار رہو باخبر اے سرخوش عہد شباب تا کجا نظارۂ نیرنگئ دار الخراب

رخ کی رفتار سے پیدا نہ ہو دوران سر　　تا کجا دیکھے گا غافل وضع دار انقلاب

جلوۂ صبح کفن دکھلائیں گے موئے سفید　　جب محاسن سے اٹھیگا پردۂ شام خضاب

تشنہ لب جاتا ہے غافل کس طرف دیوانہ وار　　دیکھ یہ دریا نہیں ہے طلعت دشت سراب

ساز و سامان زمانہ سیمیائے وہم ہے　　اعتباری ہے یہ سب مفہوم دار الانقلاب

یوں یہ آنکھوں میں کھپا ہے جلوۂ دنیائے دوں　　کیوں یہ کانوں میں بھرا ہے نغمۂ چنگ و رباب

م انہیں آنکھوں سے نکلیگا ترا اے محو دید　　عینک عبرت لگا کر دیکھ ہستی حباب

لتیاب تشنگی مرزع سے بچنا محال　　نوش کر کوئی مسکن تو عرق یا برف آب

یں نے مانا تو ہے اپنے وقت کا اسفندیار　　میں نے مانا تو ہے اپنے وقت کا افراسیاب

میںنے مانا تجکو ہے ہر فن میں کامل دستگاہ　　میں نے مانا تو جہاں میں ہی کمالات انتساب

میںنے مانا عالم اعیان موجودات سے ہے　　میں نے مانا فلسفہ دانی میں تو ہی لاجواب

میںنے یہ مانا کہ منطق پر تجھے ہے وہ عبور　　تو سر ایک ذرہ کو دعوے سے بنادے آفتاب

میںنے یہ مانا ریاضی میں ریاضت تونے کی　　میںنے یہ مانا کہ اہل حل میں ہے نکتہ یاب

میںنے مانا تجکو علم ہندسہ میں ہے کمال　　کیا سمجھ سکتا ہے فرد موقف یوم الحساب

یا انبساط خاک پر بستر نہ ہوگا ایکدن　　میں نے مانا تو ہے زیر خیمۂ زریں طناب

یا نہ ہوگا کاسۂ سر تیرا کشکول گدا　　میں نے مانا آج تو ہے خسرو مالک رقاب

اک افشاں کل جب ار قبر ہوگی فرق پر　　آج سر پر چتر ہے مانند دور آفتاب

انہ دشت میں کل تو ہوگا تنہا گوشہ گیر　　ہیں اراکین زمانہ آج ہمراہ رکاب

ہوگا اس چہرے پہ تیرے خاک کا انبار کل　　بار ہے جس پر تجھے اسوقت ہلکی سی نقاب

بنیں سوراخ مور و مار ہوں گی کل یہی　　وہ تری آنکھیں جنہیں کتنے ہیں جام شراب

یاروں کی زندگی پر کھینچ کے ملتا ہے عبث　　خیمۂ ہستی کی تیرے ٹوٹنے کو ہے طناب

علم اسباب سے وابستگی اچھی نہیں　　گوش دل سے سن ندا آواز عجل فی الذہاب

کل تعفن ہوگی تجھ میں اور نہ ہوگی کچھ خبر — آج تو ہوتا ہے نزلہ سونگھ کر بوئے گلاب

تیری اس کی ایک منزل ایک بستر ہوگا کل — کیوں فقیروں سے ہے اے منعم تجھے آج اجتناب

اے حریص زندگانی ختم کر بس ختم کر — نوحۂ شام جوانی ماتم عہد شباب

یاد کر وہ وقت جب رگ رگ میں ہچکی نزع میں — خیمۂ ہستی گرے گا ٹوٹ جائیگی طناب

راز ہستی کھولتی ہے ایک ہچکی نزع کی — فاش کر دیتی ہے عقدے گردش چشم پر آب

تیرے ماتھے پر نہیں ہے یہ پسینہ موت کا — ہے ہر ایک قطرے میں اسکی روح کا لب لباب

ہچکیوں سے نزع کی کھلتی چلی ہے ہر گرہ — بے خبر ہے عمر کے رشتے کی اے مست شباب

بے خبر تو اہتمام زینت پیکر میں ہے — کہتے ہیں اعضا ترے یا لیتنی کنت تراب

جس پہ زنگار نگ تصویریں نظر آتی ہیں آج — یہ ورق اک دن الٹ دیگی ہوائے انقلاب

تختۂ گور غریباں ہے کہ فرہنگ عدم — ہیں یہ وہ نقشیں جو تھیں مجموعۂ اضطراب

خوان قسمت پر ترے ہو دوغ و قیماق و شکر — دور صحبت میں ترے ہو دورۂ جام شراب

ایک دن پینا ہے تجھکو جام تلخ آب فنا — شربت انگور پی یا جام مے یا قند آب

طعمۂ کرم لحد کل ہوگی یہ تیری زبان — یاد رکھ نالے نمک پروردۂ ذوق کباب

قاقم و خز ہو کہ اطلس یا حریر و پرنیاں — سر سے پا تک اپنے تو پہنے جواہر کا ثیاب

تیرا خلعت اک کفن ہے اور ایک تختۂ لحد — تیرا بستر ہے زمیں اور تیرا بالش ہے تراب

ساکنان خاک کی بستی حقارت سے نہ دیکھ — سینکڑوں تارے یہاں ہیں اور ہزاروں آفتاب

سنگ تربت کو پڑھو دیباچۂ حسرت ہے یہ — دیکھو قبروں کو ہر اک اپنی سی ہے عبرت کا باب

حالت اقلیم عدم کی کس سے پوچھیے عزیز
رہنے والے تو یہاں کے کچھ نہیں دیتے جواب

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

گل و بلبل

آرائش چمن ہے حسن و جمال میرا
محبوبیت کی جاں ہے غنج و دلال میرا

سو زیوروں کا زیور اک میری سادگی ہے
بے خط و خال ہونا ہے خط و خال میرا

خاکی گہر ہوں لیکن کیفیتیں نہ پوچھو
جامِ جہاں نما ہے جامِ سفال میرا

مجھ سے ہیں آشکارا حسنِ ازل کے جلوے
دفتر ہے معرفت کا مضمون حال میرا

کہتے ہیں مجھکو شاعر کیوں گوش بے سماعت
بادِ صبا سے پوچھو کچھ وجد و حال میرا

فصلِ بہار گویا میرا ہے اک تبسم
موسم ہے جو خزاں کا ہے اک ملال میرا

شمشاد پابگل اور پیچ و خم میں سنبل
پھیلا ہوا ہے ہر سو گلشن میں جال میرا

نرگس کی آنکھ ہر دم مجھ پہ لگی ہوئی ہے
بینا وہی ہے جو ہے محو جمال میرا

سوسن کی دس زبانیں مصروف ہیں ثنا میں
وردِ طیورِ گلشن ہے قیل و قال میرا

درمحفل بہاراں شمع جگر گدازم
اے چوں گلم بخوانی آگہہ نہ زرازم

گل نے کہا یہاں تک جب اپنی داستاں کو
بلبل نے بھی اٹھایا پھر سر سے بوستاں کو

بولی کسے سناؤں میں کون ہوں کہاں ہوں
پیدا کروں کہاں سے ہمراز و ہمزباں کو

کیونکر بتاؤں کیا کیا صدمے پہنچ رہے ہیں
گلچیں سے گلستاں کو بجلی سے آشیاں کو

مجھکو پڑی ہوئی ہے پھولوں کی گلستاں کی
میری پڑی ہوئی ہے صیاد و باغباں کو

گلہائے اشک خوں سے نکلا ہے رنج اسکا
دل میں چھپا رکھا تھا جس شاخ ارغواں کو

پھولی وہ چار دن کی شاخ آشیانوں پہ
رکھا بہار میں بھی پیش نظر خزاں کو

غشِ دل گلاب پر ہے لالہ کا خوں جگر ہے
آشوب کس قدر ہے اک جانِ ناتواں کو

گھر کر لیا ہی دل میں جس دن سی عشق گل نے ہے کام لخت دل سے بس چشم خونفشاں کو
اک برق آسماں کی۔ اک قہر باغباں کی کس کس سے میں بچاؤں خاشاک آشیاں کو

از عافیت دریں جا گاہے نشاں ندیدم
بر ہیچ شاخسارے کنج اماں ندیدم

[illegible]

ہلال عید

شاہد گلشن امید ہے تو مژدۂ ساعت سعید ہے تو
اک تمنائے شوق دید ہے تو ہائے کیا شے ہلال عید ہے تو

دید تیری ہے اک پیام طرب
ہے ترے دم سے زندہ نام طرب

تو ہے عنوان کتاب راحت کا تو ہے زمزمہ رباب راحت کا
تو ہے اک مژدہ خواب راحت کا تو ہے مضمون باب راحت کا

آرزو تیری ہر بشر کو ہے
شوق دیدار ہر نظر کو ہے

تیری صورت میں حسن صورت ہے تیرے دیدار میں مسرت ہے
تیری آمد نوید راحت ہے ہر بشر محو عیش و عشرت ہے

تیرا مشتاق اک زمانہ ہے
ہر زباں پر ترا فسانہ ہے

ہے ترے نور میں خدا کا نور ہے ترا نور رشک شمع طور
تجھ میں اے ماہ کچھ ہے بات ضرور کہ ظہور طرب ہے تیرا ظہور

نور ہے دیدۂ فلک کے لئے
شمع ہے محفلِ ملک کے لئے

تیرا ہر رنگ۔ رنگِ شادی ہے — یہ تری وضع گرچہ سادی ہے
حق نے صورت مگر یہ کیا دی ہے — گویا قدرت سبھی دکھا دی ہے

رونقِ گلشنِ فلک ہے تو
زینتِ دامنِ فلک ہے تو

اے مہِ عید شاہدِ اُمید — سائلِ پرتوِ رُخِ خورشید
سب کو تیرا ہے انتظارِ دید — منحصر تیری دید پہ ہے عید

تجھکو دیکھیں تو عید ہو جاوے
دل کی پوری امید ہو جاوے

تو پیامِ نشاط لایا ہے — تو نے رنگِ طرب جمایا ہے
تو نے جلوہ ابھی دکھایا ہے — تو برس دن کے بعد آیا ہے

کیوں نہ اب دیکھیں تیری صورت کو
کہ ترستے تھے ایسی ساعت کو

اے شہنشاہِ بارگاہِ نجوم — داروئے حسرتِ دلِ مغموم
دہر میں تیرے حسن کی ہے دھوم — اے مہِ نو ہے کچھ تجھے معلوم

تیرے آنے سے عید ہوتی ہے
مہ جبینوں کی دید ہوتی ہے

تجھکو لیکن ہے انس راحت سے — تجھے نفرت ہے غم کی صورت سے
جو ہیں مہجورِ عیش و عشرت سے — تجھکو کیا کام ان کی حالت سے

بدنصیبوں کو پوچھتا ہی نہیں!!!
ان کی جانب تو دیکھتا ہی نہیں

خوش نصیبوں کو تو ہنساتا ہے ۔۔۔ نغمۂ عیش بھی سناتا ہے
غم نصیبوں کو غم کھاتا ہے ۔۔۔ رونے والوں کو جب رُلاتا ہے

پھر انھیں شوق دید سے کیا کام
غم نصیبوں کو عید سے کیا کام

تازہ غزلیں

(جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز)

نزع میں آ کے کوئی کام بھی کرنے نہ دیا ۔۔۔ میں تو مرتا تھا مگر آپ نے مرنے نہ دیا
آئینہ چھوڑ کے دیکھا کئے صورت میری ۔۔۔ دل مضطر نے مرے انکو سنورنے نہ دیا
اٹھ گیا انجمن ناز سے گھبرا کے کوئی ۔۔۔ قصۂ دل کو مجھے ختم بھی کرنے نہ دیا
رشتۂ عمر کو کوتاہ محبت نے کیا ۔۔۔ ہمکو جو کام کہ کرنا تھا وہ کرنے نہ دیا
کون سی چیز تھی دریائے محبت میں عزیز ۔۔۔ جو کوئی ڈوب گیا اس کو ابھرنے نہ دیا

(از جناب مولوی ابوالاذکار میر شفیق احمد صاحب)

نہیں بیوجہ یہ دو چار تل رخسار قاتل کے ۔۔۔ حفاظت کے لئے کافر ہے ہمراہ قفل کے
زباں سے اب ہیں پھر بھی دل سے ہم مداح قاتل کے ۔۔۔ نکلنے دے اگر دو چار ہی ارماں کہیں دل کے
دہان و ابرو و رخسار و گیسو کا تو کیا کہنا ۔۔۔ شب خلوت اگر آئیں تو بوسے لیں میں تل تل کے
کسی کمسن کے مصحف کا ہے دل کو اب خیال ہر دم ۔۔۔ محبت کر کے بندہ سی ہوئے حافظ حمائل کے
ہمارا خون ناحق کیا یونہی بیکار جائے گا ۔۔۔ پکڑلیں گے حشر میں جو ہر نگاہ و ناز قاتل کے
رقیب رو سیہ اس کی نظر میں خار ہی عاجز ۔۔۔ نہ کیوں رہنے لگیں کہنے ہمارا آبلے دل کے

(از جناب ثاقب بدایونی)

کام آئیگی قیامت کو اٹھانے کے لئے ۔۔۔ چال رہنے دو یہ آئندہ زمانے کے لئے

ہوش اڑانے کے لئے دل ہے جلانیکو لئے
بجلیاں تیغ تبسم سے گرانے کے لئے

ضعف میں جب ترے کوچہ پہ بڑی پائے جنوں
درد دل اٹھنے لگا میرے اٹھانیکے لئے

انکی خو میں ہیں وفائیں بھی جفائیں بھی مگر
وہ گھٹانیکے لئے ہیں وہ بڑھانیکے لئے

شوخیاں بزم عدو میں ہیں زمانے سے نئی
شمع گل کرتے ہیں وہ میرے جلانیکو لئے

صدمۂ ہجر بتاں رشک عدو جور فلک
دیکے دل ہمنے مزے سارے زمانیکے لئے

قبر ثاقب کا نشان تمنے مٹایا ہے تو کیا
نام باقی ہے جو دنیا سے مٹانیکے لئے

(از جناب حکیم سید سلیم صاحب ارثی)

جس کسی محفل میں بیٹھے فتنہ زا کرنے لگے
جو کوئی دل ہات آیا اس میں جا کرنے لگے

دل جدا کرنے لگے سینہ جدا کرنے لگے
ہستی موہوم کی ہستی ہستی فنا کرنے لگے

پھر جو بھی تیوری کسی کی پھر ستم ہونے لگا
پھر وفا کا ترک ٹھیرا پھر جفا کرنے لگے

لوگ پاتے ہیں سراغ کوچہ جاناں کی راہ
مجھکو رسوا ہائے میرے نقش پا کرنے لگے

بستر راحت بنا فرش زمین کوئے یار
ہم ترے نقش قدم کا بوریا کرنے لگے

اللہ اللہ ناز وہ انداز وہ کبر و غرور
دیکھنے والے بھی ذکر کبریا کرنے لگے

پھر ہوائے عشق سے سرسبز ہی صحن باغ
پھر اسی بچپن دل کا حوصلہ کرنے لگے

پھیر دے زلفوں کو کوئی چھوڑ دے گیسو کوئی
دیکھئے پھر کیا سے کیا وہ فتنہ زا کرنے لگے

یا الٰہی ہو کسی ظالم کا دل عاشق کا دل
یا الٰہی کوئی ہمسے التجا کرنے لگے

پھر ترے گیسو لٹک آئیں کہیں بیساختہ
پھر تری زلف دوتا بڑھکر خطا کرنے لگے

شورش ہنگامہ سے مجروح بے ہنگامہ ہوں
حضرت دل یہ میرے پہلو میں کیا کرنے لگے

دل شکستہ ہو کے پائی مسند شاہی سلیم
کہ بسمار کو وقف رضا کرنے لگے

مخزن

اردو علم ادب کی ... ایک ماہانہ

نثر

نظم

حمیدیہ کالج

حمیدیہ کالج قسطنطنیہ ِلیدوز کے شرقی جانب بنایا گیا ہے۔ اس کا منظر ایک تو دریا کی وجہ سے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے اطراف میں متعدد برجیاں بنائی گئی ہیں اور ہر ایک برجی کو علمی قاعدہ سے ہشت پہلو بنا کر ایک برج کا عکس دوسرے برج پر اس طرح ڈالا گیا ہے کہ خط استوی کے قایم ہوتے وقت ان کا عکس دریا میں ایک جگہ اس طرح پڑتا ہے کہ کالج کا پورا منظر دریا میں دیکھ سکتے ہیں۔ تواریخ سے معلوم ہوا ہے کہ اس کالج کی بنیاد تو سلطان مراد کے زمانہ میں پڑ چکی تھی اور پرانی تعلیم کا عربی زبان میں درس بھی ہوا کرتا تھا۔ مگر اس کو فروغ اور استغنا جس قدر نصیب ہوا وہ سلطان عبدالحمید خاں سابق سلطان کے ہاتھوں سے ہوا۔

کالج کے اندر تین بڑے بڑے ہال ہیں۔ جن میں سے ایک ہال میں مُلّا یوسف یحیٰی اور دوسرے ہال میں یوسف صفائیہ تیسرے ہال میں منظور دمشقی کا درس ہوتا ہے۔ اس ایک ایک ہال میں متعدد متعدد علما درس دیتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ سب ان تینوں کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں اس لئے ان ہالوں کو انہی تین ناموں کے ساتھ شہرت ہو گئی ہے۔

پہلا ہال جس میں ملا یوسف نجمی پڑہاتے ہیں پرانی اور نئی تعلیم کو ملواں جلواں پڑہائے جانیکا مقام ہے۔ اس میں اکثر وہ طلبا ہوتے ہیں جو مصر و دیگر ممالک عرب سے آتے ہیں۔ دوسرے ہال میں جس قدر تعلیم دیجاتی ہے وہ ترکی زبان میں ہوتی ہے۔ اور نئے علوم کو پرانی تعلیم سے مطابق اور مخالف کرکے دکھایا جاتا ہے۔ تیسرے ہال میں تکمیل علم کے بعد بعض بعض فنون کا رابطہ کرایا جاتا ہے۔

مجھے سب سے زیادہ تعلق ملا یوسف نجمی کیساتھ تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ جس زمانہ میں مصر کے کالج میں مجھے پڑہنے کا موقع تھا۔ ملا صاحب مصر کے کالج میں پروفیسر تھے اور ایک معنی کرکے ملا صاحب کے مصر آنیکا بھی سبب میں ہی ہوا تھا۔

حمید قاوندی مصر کے دار العلم میں مالک العلم تھے (مالک العلم اس استاد کو کہتے ہیں جس کا ترجمہ ہیڈ ماسٹر ہو سکتا ہے۔ مگر ہیڈ ماسٹر کو صرف اتنے اختیارات ہوتے ہیں کہ وہ اسکول کا نظم درست رکھے اور مالک العلم کے اختیارات اس سے وسیع ہوتے ہیں) میں منطق پڑہتا تھا اور مجھے اتنا لطف نہ آتا تھا جتنا آنا چاہیئے۔ ایک مرتبہ میں دل برداشتہ ہوگیا اور میں نے حمید قاوندی سے بہت ڈھٹائی کے ساتھ کہا کہ اس تعلیم سے ہماری تسکین نہیں ہوتی (ملا صاحب بہت قابل آدمی تھے اور ان کو کتابیں بھی اچھی یاد تھیں۔ مگر انھوں نے کثرت اشغال سے تعلیم و تعلم کا سلسلہ بالکل منقطع کردیا تھا) میری اس گستاخی پر وہ ناخوش نہیں ہوئے۔ بلکہ مجھے عصر کے بعد ایک گھنٹہ شرح سلم کے پڑہنے کے لئے وقت دیا۔ اور میں بہت لطف کے سات پڑہتا رہا۔ تصدیقات میں ایک مرتبہ بہت دیر تک میں الجھا رہا۔ ملا صاحب پڑہاتے پڑہاتے میرا منہ تکنے لگے اور فرمایا کہ سلیم تو ملا نجمی کے پاس چند روز رہ آ۔ جب تو وہاں سے فارغ ہوکر آویگا ہم ایک معمولی امتحان لیکر مدرسہ میں داخل کرلیں گے۔ مجھے ملا یوسف نجمی کے ملنے کا اشتیاق ہوتا اور آخر ملا صاحب کے حکم کے موافق میں دمشق چلا گیا۔

ملا یوسف بھی دمشق کی مسجد یحییٰ میں درس دیا کرتے تھے اور سو دو سو طالبعلموں کا روزمرہ درس ہو جایا کرتا تھا۔ وہاں جا کر میں نے طلباء کو اس قدر مستعد دیکھا کہ مجھے اپنی ذکاوت اور مشقت کا گھمنڈ جاتا رہا۔ مجھ پر ملا یوسف نے اتنی شفقت بھی کی کہ باوجود کارہ ہونے کے اپنے درس میں شریک کر لیا۔

دمشق کے علماء جامع دمشق میں ہی اکثر درس دیتے ہیں۔ اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی قبر کے چاروں جانب بیٹھ جاتے ہیں۔ انکا خیال یہ ہے کہ روحانی طور پر دربار نبوت سے استفادہ ہوتا ہے۔ خیر یہ تو عقائد کے مسئلہ ہیں بعض اس خیال کو صحیح سمجھتے ہیں۔ بعض اسمیں اعتراض کرتے ہیں مگر وہ منظر ضرور قابل دید ہوتا ہے کہ بیچ میں اس مزار مقدس کا حلقہ ہے اور چاروں طرف علما اور طلباء کا مجمع۔

صبح سے شام اور عشاء تک صرف ان اوقات پر تو درس نہیں ہوتا جس وقت موذن اذان دے اور جماعت ہو ورنہ ہر وقت درس ہوتا رہتا ہے۔ دمشق کے رہنے والے خلیق اور رئیس بھی ہیں مسافر نوازی بھی کرتے ہیں۔ مجھ سے دو چار روز میں ہی اکثر احباب سے محبت ہو گئی اور میرا دل لگ گیا۔ مجھے اس مسجد میں ہی رہنے کو حجرہ ملا تھا اور میرے علاوہ بھی اسمیں سو ڈیڑھ سو طلباء رہتے تھے۔ اس لئے کہ یہ حلقہ نما مسجد ہے اور چاروں طرف نیچے اوپر اسمیں حجرہ ہی حجرہ بنے ہوئے ہیں۔

رات کے ۹ بجے کا وقت ہوگا۔ میں مطالعہ دیکھ رہا تھا چونکہ مسجد کی پشت پر ہی ملا صاحب کا مکان تھا اور وہ پانچوں وقت نماز پڑھنے مسجد میں ہی آیا کرتے تھے۔ ایک روز عشاء کی نماز کے بعد میرے حجرہ کی طرف چلے آئے۔ انکی پہلی آواز جس میں محبت اور رفاقت کی بو آتی تھی "بابا ہندی" تھی جس نے مجھے چونکا دیا میں کتاب چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سلام کے بعد معانقہ کیا اور مولوی صاحب بیٹھ گئے۔ کچھ عرصہ تک تو مجھ سے ہندوستان کے حالات اور ہندوستان نشوونما پوچھتے رہے۔ اس کے بعد

دمشق آنیکی وجہ دریافت کی میں نے حمید قاوندی کا تذکرہ اور اپنا اشتیاق عرض کر دیا وہ ملا قاوندی کی تعریف کرتے رہے اور مصر کی تعلیم کی کیفیت دریافت کرنے لگے میں نے عرض کیا کہ مصر میں بہمہ وجوہ تعلیم اچھی ہوتی ہے مگر آپ کی کسر ہے۔

مسکرائے اور فرمایا کہ میاں فقیروں کو وہاں کون پوچھتا ہے۔ وہاں تو نئی روشنی کی لائٹ میں مطالعہ ہوتا ہے (یہ فقرہ یعنی نئی روشنی کی لائٹ میں مطالعہ ہوتا ہے اردو زبان میں تو کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا مگر عربی زبان میں بڑا خاصہ لطیفہ ہے) حمید قاوندی نے ایک مرتبہ مجھے وہاں بلانا چاہا تھا۔ مگر نہ معلوم کس خیال نے انکو روک دیا۔

میں دس ماہ پانچ دن رہکر مصر واپس آیا اور حمید قاوندی میری تعلیم سے بہت خوش ہوئے مجھ سے باقاعدہ پرچوں پر امتحان بھی نہیں لیا۔ بلکہ بعض بعض کتابوں میں سے بعض مسائل سنکر مجھے کالج میں داخل کر لیا۔ چھوٹی جماعت کے بعض طلباء کو میں پڑھانے بھی لگا تھا۔ چونکہ میرے پاس رات ہی کو وقت خالی ہوتا تھا شہدیے اور رابعہ یک دو طالب علم عشاء کے بعد زاویہ پڑھنے آیا کرتے تھے۔ زاویہ ایک کتاب ہے جس کو حسن رماسی نے لکھا ہے اور اس میں نسبتاً اتنے ہی مسائل ہونگے جتنے قطبی میں ہیں۔ میرے پڑھانے کی حالت میں ایک رات حمید قاوندی ٹہلتے ٹہلتے ادہر آنکلے۔ میں خاموش ہو گیا۔ تسبیح ہات میں تھی اور کچھ پڑھ رہے تھے۔ مجھ سے اشارہ کیا کہ پڑھاؤں مگر مجھے اتنی جرأت نہ ہوئی کہ میں پڑھا سکتا۔ اور خاموش ہی بیٹھا رہا آخر بولنا پڑا۔ اور تسبیح کے ایک دانہ کو چٹکی سے پکڑکر فرمانے لگے کہ میاں مجھے تمہاری تقریر بہت ہی تو مزا آرہا تھا جس کی وجہ سے میں ادہر آگیا۔ مجبوراً میں نے حکم کی تعمیل کی اور ملا صاحب نے فوراً اعتراض کیا۔ میں نے اعتراض کا بھی جواب دیا۔ بہت خوش ہوئے اور فرمایا عجمی نے اپنی زبان کاٹ کر تیرے منہ میں رکھدی ہے۔ ملا منے کے دریچہ میں احمد سارابی رہتے تھے ملا صاحب نے پکارا احمد سارابی کہ فوراً احمد سارابی

نیچے اتر آئے۔

ملا صاحب - ہمارا قصد ہے کہ ملا احمد نجی کو یہاں بلالیں۔ فلسفہ کے درجہ میں ایک استاد کی ضرورت بھی ہے۔

احمد سارابی خوش قسمت۔ مدرسہ ایسے لوگوں کا ہمیشہ محتاج رہتا ہے۔

صبح ہوتے ہی ملا حمید نے مجھے بلوایا اور میرے سامنے ایک خط اور کچھ خلعت دیکر حسین نامی ایک طالب علم کو بھیجا کہ جاؤ اور نجی کو لے آؤ۔ اگر وہ کچھ حیلہ بہانہ کریں تو تم چلے نہ آنا وہ ذرا نازک دماغ ہیں جبر بھی نکرنا۔ اور جب تک وہ نہ آئیں پڑے رہنا ملا صاحب کے خط کا مفہوم یہ تھا۔

"حبیبی لدیکم

آنکھوں کو تمہارے دیدار کا انتظار ہے۔ جب سے طالعلمی چھوٹی استاد کی طرح تم بھی چھوٹے مجھے امید ہے کہ اس مرتبہ فقیر کی جھولی میں ضرور بھیک ڈالوگے اور میرے خط کے جواب میں تم خود آؤگے۔ حمید"

حسین نامی خط لیکر رخصت ہوئے اور اکیس روز کے بعد ملا احمد نجی مصر کے کالج میں آگئے۔ میں جب کبھی مُلّا احمد نجی سے ملتا تھا وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے وطن چھڑانیکا سبب تو ہوا ہے۔ چنانچہ میرا نام انھوں نے **باعث** رکھ لیا تھا۔

ایک سال بعد میں قسطنطنیہ چلا آیا۔ اور ملا صاحب مصر میں رہے۔

اعیان ثانیہ کے زمانہ میں جب سلطان عبدالحمید خاں معزول نے مدرسہ کو نئی پرانی روشنی کے الحاق کے تدبر پر ترتیب دیا تو ان کو اچھے اچھے استادوں کے بلانیکی ضرورت ہوئی۔ انتخاب میں ملا یوسف نجی بھی ایک منتخب مانے گئے اور ان کو حمید یہ آنا پڑا۔

میں نے حمیدیہ میں ملا صاحب سے کچھ پڑھا تو نہیں مگر دیکھا کم ہوتا تھا کہ میں

ملا صاحب کی خدمت میں دو چار مرتبہ روزمرہ حاضری دیتا ہوں۔ ملا یوسف نجمی سے خصوصیت کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ملا صاحب صوفی مشرب آدمی تھے۔ اور مجھے اہل تصوف کی ملت کا ہمیشہ سے اشتیاق رہا ہے۔ ملا صاحب با اوقات بھی پرلے درجہ کے تھے اور خشک ملانہ تھے۔ ملا صاحب کے مزاج میں مذاق بھی بے انتہا تھا۔ ملا رفاعی سائنس کے درجہ میں پڑھاتے تھے اور انکی داڑھی بہت لمبی تھی ملا یوسف ان کو نپت کا جال کہا کرتے تھے۔

ہندوستان کے کالجوں میں مدرسہ کے وقت کے بعد کھیل میں جو وقت ہوتا ہے اس میں گیند وغیرہ کا کھیل ہوتا ہے۔ حمیدیہ میں گیند وغیرہ کا کھیل نہیں ہوتا۔ وہاں کے اوقات یہ ہیں۔ صبح کی نماز کے وقت ایک موذن آکر نماز کے لیے جگاتا ہے۔ مسجد میں حاضری ہوتی ہے۔ نماز کے بعد دروازہ پر گھوڑے طیار ملجاتے ہیں۔ اور یہ سب سرکاری گھوڑے ہوتے ہیں۔ ایک ایک طالب علم کو ایک ایک گھوڑا ملتا ہے وہ اسپر سوار ہو کر میدان میں چلا جاتا ہے اور وہاں اسکو فن سپہگری اور قواعد سکھائی جاتی ہے۔ ۸ بجے وہاں سے لوٹ آتے ہیں۔ پھر دس بجے سے ۲ بجے تک کالج میں رہتے ہیں۔ درمیان میں صرف نماز ظہر کیلیے پاؤ گھنٹہ ملتا ہے۔ ۲ سے ۴ بجے تک چارپائی میں صرف ہوجاتا ہے اور ۴ بجے گھوڑے آجاتے ہیں اور اسوقت متفرق فوجی کام جو اسی اقتباس ہوتے ہیں کئے جاتے ہیں۔ اس فوج میں مدرسہ کے درجات کی امتیاز پر عہدے بھی ملتے ہیں۔ اور اکثر یہ وقت جھوٹی لڑائیوں میں صرف ہوتا ہے۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور رم کیول کیا جاتا تھا۔ رم کیول اس مصنوعی لڑائی کا نام ہے جو رات کو آئینہ کے ذریعہ کیجاوے جمعرات کے روز کالج میں نصف دن کیلیے چھٹی ہوتی ہے۔ دس بجے جسوقت ہم کالج میں گئے طلبا نے یہ شورہ کیا رات کو رم کیول ہوتا ہے اور چار مہینہ سے متواتر رم کر رہے ہیں کوئی لڑائی ہوئی نہیں دل گھبراتا ہے آج چلو ۲ بجے دن سے لڑائی ہوگی اور رات کو رم کرتے ہوئے بورڈنگ تک چلے آویں گے۔

غرض آج فوج کے اصطلاح دو حصہ کیے گئے تھے - کہ ایک طرف شہزادہ معزالدین جرنل بنائے گئے تھے - اور ایک طرف شہزادہ رشید - میں شہزادہ رشید کی جانب تھا - ہمنے پہلے اپنی فوج کو دائرہ کی صورت میں منتشر کردیا اور کوٹ مارشل کرتے ہوئے آگے کو بڑھے چونکہ میں بھی اسوقت کپتان تھا - میرے ساتھ سات ہزار کی فوج کردی گئی تھی - رفاہ یلدوز کے نیچے کسی قدر نشیب میں جاکر میری فوج کا دائرہ منتشر و ایک جگہ ہوگیا - اس لئے میں جہاں سے چلا تھا وہ بہت کشادہ میدان تھا اور اب جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں غنیم کی فوج نے میدان کو تنگ کردیا تھا - الف - قواعد چار ہیں - میں نے پڑھا تھا کہ جب غنیم کی فوج تمہارے وسیع دائرہ کو چھوٹا کردے تو تم سمجھ لو کہ اب ہم گھرنا چاہتے ہیں -

تمہارے لئے بہتر یہ ہے کہ تم دشمن کی قوت کو اپنے اوپر غالب آنے دو اور پیچھے ہٹتے چلے جاؤ - جس وقت وہ تیز قدم تمہاری طرف آوے اسوقت تم اُلٹے سرپٹ ہو لو - غالباً غنیم کی فوج تم سے قریب تر ہو جاویگی - جب دونوں ملنا چاہیں تم پہلے قاعدہ کے موافق منتشر ہو جاؤ اور معاً گھیرا ڈال دو - اگر غنیم بھی ہوشیار ہو اور وہ منتشر ہی آیا ہو - تو تم کسی اونچے مقام تک برابر ہٹتے چلے آؤ - اور جب اونچا مقام تمہارے ہات آجاوے اس وقت اس ہی ٹیلہ کے اردگرد منتشر ہو جاؤ -

چونکہ میں اس ترکیب میں آچکا تھا - میں نے اس قاعدہ پر عمل کیا - اور آخر ریحان کے ٹیکرہ پر آکر میں نے اپنی فوج کو منتشر کیا - اور اُس بزن پر غالب آگیا - ریحان کے ٹیکرہ سے یلدوز کا وہ حصہ جس پر سلطان رہتے تھے تقریباً ایک فرلانگ ہوگا - میں چاہتا تھا کہ دشمن کو ہتھیار سے سبکدوش کروں کہ ایک برقنداز ہلال لیکر دوڑا ہوا آیا - (ہلال کا سیدھا آنا صلح کی نشانی ہے) میں نے اپنی فوج کو روک لیا -

اس نے مجھے شاہی حکم سنایا کہ فتح نہیں ہوئی اور تم کو حضور سلطان میں پیش ہونا ہوگا - اوّل تو مجھے اس سے قبل کبھی سلطان کی حضوری کا شرف نصیب نہیں

ہوا تھا۔ جب مجھے یہ سنا دیا گیا تھا کہ یہ فتح نہیں ہوئی میرے دل میں خیال گذرا کہ غالباً یہ کوئی میری غلطی ہے۔ میں بہت پریشان اور سہما ہوا برق انداز کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے مجھے الفاتمس اور برج انبار سے گذار کر دربار خاص میں لا کھڑا کیا۔

قواعد کی رو سے مجھے گھوڑے پر سے اترنا نہیں چاہیئے تھا۔ میں ایک گھنٹہ تک وہاں کھڑا رہا ایک گھنٹہ کے بعد برق انداز نے مجھ سے گھوڑا لے لیا۔ میں تو سمجھا کہ ہمیشہ کو مجھ سے گھوڑا چھنا۔ اس لئے کہ اس نے مجھے پیادہ کر کے گھوڑے کو اپنی جانیکی پروانگی دیدی۔ میں پیدل دربار خاص میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید بہ منٹ وہاں مجھکو انتظار کا موقعہ ملا ہوگا کہ سلطان تشریف لے آئے۔ میں نے سلام علیک کیا۔ اس لئے کہ بج میں مجرئی کرنیکا حکم نہیں۔ مجھ سے پوچھا کیا نام ہے۔ میں نے عرض کیا غلام کو سلیم کہتے ہیں۔ فرمایا تم ہندوستانی ہو۔ میں نے عرض کیا درست ہے۔ فرمایا تب تمہاری فتح صحیح ہے۔

ایک خواجہ سرا نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دوسرے نے قہوہ دیا۔ میں کانپتا گیا اور پیتا گیا۔ سلطان مسکراتے رہے۔

سلطان۔ تم ڈرتے کیوں ہو میں تم سے ناخوش نہیں ہوں تمہارا کام برا نہیں ہے۔

میں۔ مگر وہ پہلا .... حکم۔ ......

سلطان۔ کسی ترک سے اگر ایسا ہوتا تو بیشک میں اس کی فتح کو شکست کہتا۔

میں۔ اس کی .... وجہ ...

سلطان۔ قواعد کے اعتبار سے تمنے بہت اچھا کیا۔ مگر ترکوں میں پیچھے ہٹنا توہین اور بزدلی ہے۔ وہ ایسے وقت پر کاوان کیا کرتے ہیں۔ وہ دفعہ جس کو تم نے دیکھا ہے فرانس والوں کے ہاں زیادہ مستعمل ہے۔ مگر میں نے اسمیں یہ نقصان دیکھا ہے کہ غنیم اکٹھا ہو کر تو کبھی تعاقب کرتا ہی نہیں۔ اب صرف تمکو کسی پہاڑ کا سلسلہ درکار ہوتا ہے

اسمیں دو نقصان ہو سکتے ہیں پہلا تو یہ کہ ممکن ہے تمکو دور تک پہاڑی نہ ملے اور دوسرے یہ کہ تم دور ہو جاؤ اور غنیم کی مدد پہنچ جائے اور تمہاری فوج تم سے بہت دور ہو جاوے۔ اچھا اگر تمہاری فوج پسپا ہونے لگے اور تم کو کوئی پہاڑی نہ ملے تو تم کیا کروگے۔

میں ۔میرے نزدیک تو میں گھمسان کی لڑائی شروع کر دونگا۔

سلطان ۔کیا تمنے کسی قاعدہ میں ایسا پڑھا ہے۔

میں ۔جی نہیں قاعدہ تو یہ چاہتا ہے کہ میں ہتھیار ڈالدوں مگر جب ہتھیار ڈالنا ہی مقصود ہوا تو ہم کیوں جان دیکر تقدیر آزمائی نکریں۔

سلطان ۔شاباش میرے بچے۔ تو عرب معلوم ہوتا ہے غالباً تیری نسل عرب سے ہوگی۔ بھلا بتاؤ تو تم کون ہو؟

میں نے عرض کیا میں قریشی خاندان کا سمجھا جاتا ہوں۔

سلطان ۔قریش کے خاندان سے ہندوستان مسخر ہے۔ وہاں شیخ سید زیادہ ہیں۔

اتنا کہکر ایک خواجہ سرا کی طرف دیکھا وہ شاہانہ لیکر آیا۔ اور مجھکو دیدیا۔ شاہانہ وہ عطیہ ہے جس میں پانچ پونڈ ایک رومال اور ایک قہوہ کی پیالی ہوتی ہے۔

میں نے دوبارہ شکریہ کا سلام کیا اور "شاہانہ" کالج میں بھیجدیا گیا۔

یہ قہوہ کا پیالہ یہاں پیا نہیں جاتا ہے بلکہ کالج میں جاکر تقسیم ہوتا ہے۔

(باقیدارد)

ایس۔ ایس۔ وارثی

کالی بلا

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

ہرمزی بیگم کے بڑھاپے ہونیکے دن نہ تھے۔ بمشکل انکی عمر تیس برس کی ہوگی۔ پہل پہلوٹن کا مچھو پیٹ پونچھن تھا اکلوتا مچھویی ایک بچہ نواب میرزا انکی کوکھ سے پیدا ہوا تھا جسکی سولویں سالگرہ کی تیاری کر رہی تھی جو یکایک کسی نے اسد بیگ کی سناونی آئی خط میں تو وہی بول لکھے ہوئے تھے مگر قاصد نے زبانی بیجاپور کا قلعہ پر اسد بیگ کا حملہ کرنا اور اپنے سینہ کو قلعہ کے کواڑوں سے بھڑا دینا قلعہ والوں کا اوپر سے گولے اور گولیوں کا مینہ برسانا قلعہ کا فتح ہو جانا اسد بیگ کا مارا جانا بیان کیا۔ تو دیوانخانہ سے لیکر محلسرا تک عورتوں اور مردوں میں کہرام مچگیا۔ اور سننے والوں کے کلیجے پھٹ پھٹ گئے۔ ہرمزی بیگم نے یہ کہکر پچھاڑ کھائی میرزا نہیں بیگم کو کمسن چھوڑ گئے۔ پچھاڑ کھاتے ہی وہ بیہوش ہو گئی اور تین دن تک اُسے دنیا و مافیہا کی سدھ نہیں۔ مگر انسان کو خدا نے پتھر سے زیادہ سخت بنایا ہے آخر صبر آ جاتا ہے۔ آنسوؤں کے دریا بہ چکے جی ٹھہرنے لگا۔ نواب میرزا ابھی بچہ کو روکر چپ ہو گیا۔ ہرمزی بیگم شہید زندگی فاتحہ و درود میں مشغول تھی جو اسد بیگ کے بوڑھے چچا نے جن کا نام نعمت اللہ بیگ تھا ہرمزی سے کہا بہو بیگم کاٹے کا نام تلوار کا ہے سپاہی نام سردار کا ہے کہنے کو تو یہی کہا جائیگا کہ بیجاپور اورنگ زیب نے فتح کیا مگر سچ تو یہ ہے بیجاپور اسد بیگ نے فتح کر لیا ہے اور سنا ہے کہ حضور والا نے یہ فتح اسد بیگ کے ہی نام پر لکھی ہے اور ہونا بھی یہی تھا۔ بادشاہ سلامت کو صدمہ بھی بہت ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نواب میرزا کو بیجاپور بھیجو۔ بادشاہ سلامت اسی کو دیکھکر بہت خوش ہوں گے۔

ہرمزی بیگم بھیت پہ رہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ اس بندی سے نہیں ہو سکتا کہ آگے دیکر اپنے لال کو گلا کٹوانے کے لئے دوں۔ کن بدے مجھ کو کچھ نہیں چاہئے یہ جیتا رہے میں نے بھر پایا۔ ابو یہ سر ہے کا سہرا ہے نہ کٹوا دوں منصب اور جاگیر پر یہ میری آنکھوں سے اوجھل ہوگا تو میں کیسے دیکھکر جیونگی۔ ہمارے نہ وہ مار کے ہاتھ۔ ہے اللہ ابا جان کو بہشت نصیب کرے میرے جہیز میں ایک کٹرہ دے گئے ہیں۔ دو لاکھ پچاس روپیہ مہینہ کے کرایہ کے مہینہ کے مہینہ چلے آتے ہیں ہم ان بیٹوں کے روٹی کپڑے

کیلئے کافی ہیں۔ سر آئیں گے اور پاؤں جائینگے میں تو اسے دہلیز سی باہر قدم بھی نہیں رکھنے دونگی؟
ہرمزی بیگم کی بات کا جواب ابھی نعمت اللہ بیگ دینے بھی نہ پائے تھے جو نواب میرزا جھپ سے بول اُٹھا "بی اماں جان آپ کا فرمانا درست ہی۔ خدا کے فضل سی ہمیں کھانے پینے کی کچھ کمی نہیں ہی۔ گھر میں نقد جنس سب کچھ موجود ہے۔ مگر مغلوں کو خدا نے مرنے مارنے کیلئے ہی پیدا کیا ہے۔ یہ تلوار کے دھنی ہیں لڑائی کے میدان کو کبڈی کا پالا جانتے ہیں۔ آپ چاہی خوش ہوں یا ناخوش دو دو بخشیں یا نہ بخشیں میں بیجاپور لاکھوں میں جاؤنگا۔

۲

ماں سی بیٹے کے بچھڑنیکا وقت آن لگا۔ نواب میرزا نے بیجاپور جانیکے لئے کمر باندھ لی۔ ہرمزی بیگم نے امام ضامن کا روپیہ اسکے بازو پر باندھکر بلائیں لیں کلیجہ سی لگا یا پیار کیا اور بے اختیار رونے لگی۔
ہرمزی بیگم۔ شیخ جی تم اس کے دلوا کے وقت کے آدمی ہو۔ اسی لئے تمہیں اسکے ساتھ کیا ہے۔ حافظ تو اصل اللہ ہے مگر تم دم بھر کے لئے اس سے الگ نہ ہونا"
شیخ عبداللہ (پردہ کے باہر سی) بھلا بیگم صاحب آپکے فرمانیکی بات ہے بڑے میرزا صاحب کا نمک میری بوٹی بوٹی میں بھرا پڑا ہے۔ میں چھوٹے میرزا صاحب کو ہاتوں چھاؤں کرتا ہوا لیجاؤنگا۔ جہاں انکا پسینہ گریگا وہاں میں اپنا خون بہادونگا"
الغرض نواب میرزا دلی سے متھرا آگرہ ہوتا ہوا گوالیار پہنچگیا۔ گوالیار سے نکل کر زبان بالکل بدلگئی تھی۔ اور اس کے سمجھنے میں نواب میرزا کو دقت ہوتی تھی۔ عربی منبرو پرده خود سوار تھا اور ایک یابو پر شیخ عبداللہ چڑھے ہوئے تھے۔ اور اسی پر سفر کا سامان لدا ہوا تھا ایک مہینہ چلتے چلتے ہولیا تھا مگر بیجاپور ابھی دور تھا۔ رات کی بے آرامی اور دن کی گرمی اور لو سے نواب میرزا کا گلاب جیسا چہرا مرجھا گیا تھا۔ چھتری جو آج ادنے ادنے لگائے پھرتے ہیں اس زمانہ میں امیروں کو بھی نصیب نہ تھی۔ البتہ چھتری کی صورت کا چھتر بادشاہوں کے سر پر لگایا جاتا تھا۔ سونا چاندی جواہر سب کچھ اس میں لگا ہوتا تھا۔ مگر اس کے بھدے پن

کا یہ حال تھا کہ اسوقت کی معمولی چھتریوں کی طرح وہ بند نہ ہوسکتا تھا۔ بوجھ کے مارے بدنصیب چھتر بردار کا بات شل ہوجاتا تھا۔ غریب آدمی جب دھوپ میں چلتے تھے تو گرمی کے بچاؤ کے لئے کچھ کپڑا سر پر ڈال لیتے تھے۔ مگر مینہ اور پانی سے بچنے کے لئے اُن کے پاس کوئی آلہ نہ ہوتا تھا۔ ایک دن عصر کے قریب نواب میرزا ایک گاؤں میں پہونچا جس کا جھوھرا نام تھا۔ گاؤں تو چھوٹا سا مگر رونق خوب تھی بازار میں قسم قسم کی ترکاریاں اور میوہ اور خاص کر دکن کا تحفہ کیلے اور شریفوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ سیندھی کا بھی بازار خوب گرم تھا۔ سرا بھی لپی پتی ہوئی تھی بھٹیاری بھی خوش سلیقہ معلوم ہوتی تھی۔ شیخ عبداللہ نے گھوڑے تھان پر باندھے۔ کوٹھری میں اسباب رکھا نواب میرزا کا بچھونا پلنگ پر بچھایا اور کھانا پکانے کے لئے ہو بیٹھے۔

جس کوٹھری میں نواب میرزا ٹھہرا تھا اس کے برابر والی کوٹھری کے دروازہ پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا اور قرینہ کہتا تھا اس کے اندر کوئی پردہ نشین عورت ٹھیری ہوئی ہے۔ مگر کوٹھری کی دیوار میں جو دار پار ایک چھوٹا سا سوراخ تھا اس میں سے کھانسنے کی آواز آتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کوئی بڈھا مرد اس کے اندر ہے اور دمے میں مبتلا ہے۔ گلے کی خرخرا سے ایک دم چین نہیں لینے دیتی ہے۔ رات آئی اور چاند تاروں نے آسمان پر اپنی بہار دکھائی۔ شیخ جی نے نواب میرزا کو کھانا کھلایا اور سائبان میں اپنا بچھونا بچھا پاؤں پھیلا سو رہے۔ مگر نواب میرزا کو مچھروں نے بے چین رکھا۔ نیند اُچٹ گئی۔ اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیال اپنا رنگ دکھانے لگے۔ یہ بچھونے پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ رات آدھی گذر رہی تھی جو اس نے دیکھا دو شخص لانبے قد کے ڈھاٹے باندھے ہاتھوں میں لٹھ لئے سرا میں آئے اور دبے پاؤں برابر والی کوٹھری میں جس میں سے کھانسی کی آواز چلی آرہی

بھی گھس گئے دیوار کا ننھا سا چھید اس وقت نواب میرزا کے لئے ٹیلی فون بنگیا اور اُسنے
اس کی مدد سے بڑے بڑے حیرت انگیز باتیں سنیں۔

آواز۔ مہاراج یہ دیبی سنگھ چوروں کے سرغنہ ہیں۔ ہٹولا پور میں ایک
کروڑپتی سیٹھ کے ہاں چوری کرنی چاہتے ہیں۔ تماگی نے جہاں مال رکھا ہے
وہاں کا پتہ نشان بھی اچھی طرح بتا دیا ہے۔ مگر یہ آپ کے بغیر شگون کے لیئے ایسے
بڑے کام پر جانا نہیں چاہتے ہیں۔ اگر آپ نے ان کو ٹھیک شگون بتا دیا
اور جواہر کا صندوقچہ یہ لے آئے تو چوتھائی آپ کو بھینٹ دینگے۔

آواز۔ آج سے آٹھویں دن کنوار لگ جائیگا (کھانسی) اس کے دوسرے
دن تڑکے اُٹھ کر ایک کالا بکرا کالی دیبی کے تھان پر جا کر چڑھائیں۔ پھر گھر آکر
وہی چانول کھائیں اور رات کو اپنے کام پر جائیں۔ جب کول لگ جائے تو یہ
دھول جو میں دیتا ہوں اس کے اندر ڈالدیں اور اپنے جی میں کالی دیبی کالی دیبی
کہتے ہوئے گھس جائیں۔ کالی کی دیا سے سب گھر والے ایسے سو جائیں گے
جیسے سانپ سونگھ گیا۔ مال لیکر سلامت چلے آئیں گے شگون بالکل سچا ہے

دوسری آواز۔ دیبی سنگھ تم کچھ سوچ بچار نہ کرو اور جو کچھ مہاراج نے کہتے
ہیں اُسے پلہ باندھو ان کے شگون گلے بندھے ہوتے ہیں۔ جھوٹے پڑتے
ہی نہیں۔ ایک دفعہ میں نے اور نہال سنگھ نے چوپاڑیں بیٹھے بیٹھے یہ صلاح
کی مہاراج کے شگون کا امتحان کرو۔ کہیں یہ جھوٹ موٹ تو لوگوں کو نہیں بہکاتے
ہیں۔ اور ایک بات گانٹھ کر ہم دونوں مہاراج کے پاس آئے۔ نہال سنگھ
سرا کے پیچھے رہگیا اور میں سرا میں آکر اور مہاراج سے پالاگن کر کے بیٹھ گیا۔
نہال سنگھ نے سرا کے پیچھے سے گیدڑ کی بولی بولنی شروع کی اور بڑا غل مچایا
مجھے اس کی ہیاؤ ہیاؤ کرنے پر ہنسی تو بہت آئی۔ مگر میں نے ضبط کر کے کہا مہاراج

یہ گیدڑی کیا کہتی ہے۔

مہاراج:- بڑی کھوٹی بات کہتی ہے۔ منہ سے نکالنے جوگی نہیں ہے"

میں:- کچھ تو کہئے"

مہاراج:- مہاراج نہ پوچھ اس کا پوچھنا اچھا نہیں ہے"

میں:- نہیں مہاراج ضرور بتائے گیدڑی کیا کہتی ہے"

مہاراج:- گیدڑی یہ کہتی ہے کہ میری موت کی گھڑی آن لگی ہے۔ میرا کوئی دم میں پیٹ پھٹیگا اور میں مرکر رہجاؤں گی"

مہاراج کی اس بات پر مجھے زیادہ ہنسی آئی اور میںنے دروازہ کی طرف دیکھا کہ نہال سنگھ آجائے تو میں مہاراج کے شگون کے ڈھکوسلے کی قلعی کھول دوں مگر نہال سنگھ کسی طرح نہ آیا۔ اور مجھے انتظار کرتے کرتے ایک گھنٹہ ہوگیا۔ آخر مینے پیشاب کا بہانہ کرکے سرائے کے پیچھے جاکر دیکھا تو ہوش اُڑ گئے۔ نہال سنگھ کا پیٹ پھٹ گیا تھا انتڑیاں نکل پڑی تھیں اس کی برچھی اس کے پیٹ میں وار پار ہورہی تھی۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ نہال سنگھ کی برچھی اس کے پیٹ میں کیونکر اُتر گئی مگر سوچتے سوچتے معلوم ہوا کہ گیدڑ کی بولی بولنے کے لئے یہ گھانس کی گنجی پر چڑھنا چاہتا تھا۔ مگر گھانس کی گنجی اونچی تھی یہ اس پر نہ چڑھ سکا۔ تو سہارے کے لئے اس نے اپنی برچھی گھانس کی گنجی سے ملاکر گاڑی اور اسے پکڑکر چڑھ گیا۔ جب بولی بول کر اُترنے لگا۔ تو اس کا پاؤں پھسلا دوسرے رات بھی اندھیری تھی یہ دکھائی نہ دیا کہ ادھر برچھی گڑی ہوئی ہے اوندے منہ پیٹ کے بل برچھی پر آیا اور کام تمام ہوگیا۔

آواز۔ نہیں نہیں مجھے کچھ وہم نہیں ہے مینے بہت لوگوں سے مہاراج کے سچے شگون کی تعریف سُنی ہے۔ میرے ایک دوست نے اپنی آنکھوں کا دیکھا ہوا مہاراج کے شگون کا قصہ مجھ سے بیان کیا وہ کہتے تھے۔ ایک رات میں

میرا اور مہاراج کا ساتھ ہو گیا آدھا رستہ کٹا ہو گا جو سڑک کے نیچے ایک سرس کا پیڑ آیا
اس پر ایک کلچڑی بیٹھی ہوئی زور زور سے بول رہی تھی۔ چڑیا کی آواز سُنکر مہاراج نے
کہا دال میں کالا دال میں کالا ارے رام رام کلجگ کے پھل اپنا گن دکھانے لگے۔
اس بات کو سُن کر دولھا کے باپ نے کہا مہاراج کیا ہے چلتے چلتے ایسی منحوس
باتیں مُنہ سے کیوں نکالتے ہو۔

مہاراج۔ میں کچھ نہیں کہتا کلچڑی کہتی ہے اُسی کو میں دہرا رہا ہوں۔

دولھا کا باپ۔ کلچڑی کیا کہتی ہے۔

مہاراج۔ یہ کہتی ہے کہ یہ بیاہ تمہارے پتر کو اچھا بھاگنا نہ ہو گا۔ کنیا
میں بڑا بھاری دوس ہے۔

دولھا کا باپ۔ کنیا میں کیا دوس ہے۔

مہاراج۔ کنیا کے پیٹ میں حرام کا گرب ہے۔

دولھا کا باپ تو اس بات کو سُنکر سناٹے میں چلا گیا۔ مگر اور براتی مہاراج
کے سر ہو گئے اور برا بھلا کہنے لگے۔ کہ تمہیں شرم نہیں آتی پرائی کنواری بیٹی پر چھینٹے
جوڑتے ہو اور بیاہ میں کھنڈت ڈلواتے ہو۔ پنڈت تم نہیں جوتشی تم نہیں۔ پھر ہم
تمہاری بات کیونکر مانیں۔

مہاراج۔ دیکھو یہ کلچڑی جو پیڑ پر بیٹھی ہے اُسے مارو اور اس کے پیٹ
میں سے انڈا نکلے تو میں سچا اور اگر نہ نکلے تو سات جوروں کی مار مجھے دینا۔
برات میں بہت سے تیر انداز بھی تھے ایک شخص نے تیر سے چڑیا مارلی۔
پیٹ چیرا تو درحقیقت ایک انڈا نکلا۔ اب تو سب براتیوں کے منہ فق ہو گئے۔ مہاراج
نے کہا تمہیں اب بھی یقین نہ آیا ہو تو سرس کے پیڑ پر چڑھ جاؤ اور اس ٹہنی کو توڑ لاؤ
جس پر کلچڑی بیٹھی بول رہی تھی۔ اور پھر ٹہنی کو کھڑا چیرو۔ اگر اندر سے کیڑا نکلے تو

لگتی ہے تو وہ نا ندوں کا بھرا ہوا پانی پیتے ہیں۔ اور ان کے منہ کا کسی قدر لعاب اس پانی میں ملتا رہتا ہے۔ جب ہماری عورتیں حاملہ ہوتی ہیں تو زچہ خانہ تک انہیں وہی جانوروں کا جھوٹا پانی دیا جاتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو گھٹی اُسی پانی میں پکا کر دیتے ہیں اور بارہ برس تک بچہ سوائے اس پانی کے اور کوئی پانی نہیں پی سکتا ہے۔ خدا نے ہر چیز میں اثر رکھا ہے اور ان جانوروں کے جھوٹے پانی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ہمارے بچوں کو جانوروں کی بولیاں اور کنایہ اشارہ سمجھنے کی ایک استعداد ہو جاتی ہے۔ اور وہی شگون کے وقت کام دیتی ہے۔

نواب میرزا ان باتوں کو سنکر دنگ ہوگیا اور سمجھا کہ یہ بڑا شگونی ہے۔ اور چوروں بدمعاشوں کو شگون بتاتا ہے۔ اور حاکم کے ڈر کے مارے پردہ ڈالے بیمار بنا ہوا کوٹھری میں چھپا پڑا رہتا ہے۔ پھر اُسے یہ خیال آیا کہ ایسا نہ ہو وہی سنگھ وغیرہ چور جو بڑھے شیطان سے باتیں کر رہے ہیں جاتے وقت میرا گھوڑا کھول کر لیجائیں مجھے سونا نہیں چاہئے۔ اور اس نے وہ رات جاگ کر کاٹ دی اور صبح ہوتے ہی جھومرہ سے چلدیا۔ اور بہت سی منزلیں طے کر کے اخیٹا پہنچگیا

۳

کوہستان اخیٹا دور تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے دامن میں ایک قصبہ آباد تھا۔ جس میں پانچ چھ ہزار آدمی بستے تھے۔ نواب میرزا جب قصبہ کی سرا میں پہنچا تو بہت اندھیرا ہوگیا تھا۔ رات کے آٹھ بج گئے تھے اور بادل بھی خوب چھا رہے تھے سرا سافروں سے کھچا کچھ بھر رہی تھی اور اس کی انگنائی میں رتھ منجھولیاں پالکی نالکی اونٹ گھوڑے کھڑے تھے۔

نواب میرزا۔ او مہترانی ادھر آ۔
مہترانی۔ آئی حضور۔

نواب میرزا۔ ہمارے ٹھہرنے کیلئے جلد مکان بتاؤ ہم تھکے ہوئے ہیں۔

مہترانی۔ میاں مکان تو اسوقت گھس لگانے کو بھی نہیں مل سکتا۔ ادہر سے اُدہر تک سرامیں برات اتری ہوئی ہے تل رکھنے کو بھی جگہ نہیں ہے۔

نواب میرزا۔ تو پھر ہم کہاں ٹھہرینگے۔

مہترانی۔ حضور میں کیا بتاؤں۔

نواب میرزا۔ میں دلّی رہتا ہوں اور دلی والوں کو آرام سے ٹھہرانے اور رستہ میں انکی حفاظت کرنے اور بیگاری دینے کے لیے قصبہ اور گاؤں کے پٹیل اور چودہریوں اور چوکیداروں اور سرا کے ٹھیکہ داروں کو بادشاہ کی طرف سے کیا کچھ تقید ہے۔

مہترانی۔ حضور میں سب کچھ جانتی ہوں آپ کی صورت دیکھکر ہی پہچان گئی تھی کہ ایسے گبرو سوائے دلّی کے شہزادوں کے اور کہیں نہیں ہوتے ہیں یہ بھی انھیں میں سے ہیں۔ مگر سرامیں اس وقت جگہ تو ہے نہیں۔

اسی بحث وتکرار میں ایک مسافر نے سرا کی انگنائی میں بیٹھے بیٹھے چرس کا دم لگایا اور اس کی چلم کی آگ سے لو اٹھی جس کی روشنی سرا کی ایک کوٹھری کے دروازہ پر پڑی جو نواب میرزا کے منہ کے سامنے تھا۔ نواب میرزا نے دیکھا اس میں ایک قفل لگا ہوا ہے

نواب میرزا۔ مہترانی تو تو کہتی تھی سرا کے مکان سب رکے ہوئے ہیں مگر مجھے تو سامنے والی کوٹھری خالی دکھائی دیتی ہے۔ اسمیں قفل کیوں لگا ہوا ہے میں جانتا ہوں اس میں تو نے اپنا حسن بھر رکھا ہے اپنی جان کی خیر چاہتی ہو تو اسے جھپ سے خالی کر دو نہیں میں کوڑے کے زور سے خالی کرا لونگا۔

مہترانی۔ اس کوٹھری میں اپنا حسن نہیں اور یہ خالی بھی ضرور ہے۔ مگر یہ کھل نہیں سکتی۔

نواب میرزا۔ یہ کیوں۔

مہترانی۔ اس کے کھولنے کی حاکم کی طرف سے مناہی ہے۔

نواب میرزا۔ کیا وجہ کیا سبب؟

مہترانی۔ اس میں بلا رہتی ہے۔ جو مسافر رات کو اس میں سوتا ہے وہ اس کا گلا مسوس ڈالتی ہے صبح کو مرا ہوا نکلتا ہے۔ جب چار بیسی مسافر اس میں اسی طرح مرمر کر رہ گئے اور یہ بھید بھی نہ کھلا کہ آدمی اس میں کیوں سوئے کا سو بار ہجاتا ہے۔ تو حاکم نے انہیں قفل ڈلوا کر یہ حکم دیدیا کہ آگے پھر کبھی یہ کوٹھری نہ کھولی جائے اور نہ مسافر کو اس میں ٹھیرایا جائے۔ اور اگر بھٹیاری نے لالچ کے مارے مسافر کو اس میں ٹھیرایا اور اس کی جان کو جوکھوں پہنچی تو بھٹیارنی کی گردن ماری جائگی۔

نواب میرزا۔ یہ کب کی بات ہے۔

مہترانی۔ تین برس کی۔ اور جب ہی سے بند ہے۔

نواب میرزا۔ جس حاکم نے یہ حکم دیا تھا ان کا دفتر گاؤ خورد ہوگیا اب شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا دور دورہ ہے۔ اس دیندار بادشاہ کے عہد میں یہ ڈھکوسلہ کوئی کان دھر سنتا بھی نہیں ہے۔ نہ ان پر کسی کو یقین آتا ہے کنجی کوٹھری کی جلد لاؤ نہیں لنگر خانہ کے بلاؤ کی طرح دہما دہم پٹو گی۔

شیخ عبد اللہ۔ بھلا حضور اس ضد کا بھی کچھ ٹھکانا ہے۔ سر یکا مہترانی کہہ رہی ہے کہ کوٹھری میں آسیب کا خلل ہے اس کوٹھری میں کوئی ٹھہرتا نہیں ہے مگر حضور اپنی دہائیں دہائیں کے آگے اس غریب کی سنتے ہی نہیں۔ ایسی جگہ ٹھہر کر کیا میرا منہ کالا کروائیگا۔ مہترانی تو جا اپنا کام کر ہم جاتے ہیں جنگل میں پیڑ کے تلے رات کاٹ دیں گے ع

شب تنور گذشت و شب سمور گذشت

نواب میرزا۔ شیخ جی آپ جیسے اگلے زمانہ کے بھولے لوگوں نے تو چھوٹی تانتی کا نیوانا س کیا ہے بچہ نے ہوش سنبھالا اور اسے ڈرانا شروع کیا ہوا پکڑ

لیجاتا ہے۔ بی شادی پیٹ میں گھس جاتی ہیں۔ چڑیل کلیجہ کھالیتی ہے بھتنی چمٹ جاتی ہے آسیب منڈیا مروڑ ڈالتا ہے۔ جب اماں باوا۔ دادی دادا خالہ پھوپھی گھر کا گھر بچہ کے کلیجہ پر نقش بٹھائیگا تو کیوں نہ بیٹھیگا۔ اور اکیلے دوکیلے اندھیرے اُجالے میں اُسے کیوں نہ ڈر لگیگا۔ اور سفر سے کیوں نہ ہچکچائے گا۔ پہلے تو میں ٹھیرتا یا نہ ٹھیرتا۔ مگر اب تو میں ضرور اس کوٹھری میں ٹھیرونگا۔ اور اس بلا کو دیکھونگا جو مسافروں کی گردن توڑکر دھر دیتی ہے۔

یہ کہکر نواب میرزا گھوڑے پر سے اتر پڑا اور جب دیکھا کہ سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا ہے اور مہترانی کوٹھری کی کنجی نہیں لاتی تو اس نے پانچ چار کوڑے زور زور سے اس کے کولوں اور کمر پر ٹکا دیئے۔ پھڑک اٹھی اور لگی دوہائی دینے مارکے آگے بھوت بھاگتا ہے دوسرے ترکی مارا تازی کا نپا سرا کے سارے مسافر بھی تھرا گئے۔ اور ایک زبان ہوکر کہنے لگے نیک بخت یہ دلی کے مغل ہیں آجکل ان کا اقبال ان کے سامنے ہے ان کے سامنے بھوت پریت سب کان ٹیکتے ہیں۔ تو اپنے ان چپڑ دلالوں کو رہنے دے اور کنجی لاکر کوٹھری کھول دے مہترانی جھاڑ پونچھ کر کھڑی ہوگئی اور ٹسوے بہاتی ہوئی اور کولے سہلاتی ہوئی کنجی لے آئی۔

نواب میرزا۔ چراغ بھی لاؤ جھاڑو بھی لاؤ۔ چارپائیاں دو لاؤ۔

مہترانی۔ یہ لیجے چراغ حاضر ہے اور جھاڑو بھی اور پلنگ بھی۔ مگر میاں چاہے تم میری بوٹیاں کاٹ ڈالو وہ بندی اس تنکاری کوٹھری میں قدم نہیں رکھنے کی

نواب میرزا۔ ہم بھی تمہیں اندر بلانا نہیں چاہتے۔ ہم ظالم نہیں ہیں اور یہ مار تو تمہاری زبان نے تمہیں کھلوائی ہے۔

مہترانی (روکر) خیر میاں میں نے کہی تو خیر خواہی سے ہی تھی۔ مگر تم اُلٹ

پڑے ۔ میری قسمت ۔

نواب میرزا چراغ لیکر کوٹھری کے اندر گیا تو معلوم ہوا اس کی دیواریں چھت تہ زمین خوب صاف ستھری ہے۔ تین برس سے بند پڑی تھی مگر نہ جالے تھے نہ مکڑ تھے۔ نہ کوڑا تھا نہ خاک دھول تھی۔ شیخ جی نے معمول کے موافق کوٹھری میں اسباب رکھا چارپائی پہ میاں کا بستر لگایا پھر کھانے پکانے ۔ دھندہ میں مشغول ہو گئے ۔ ۱۰ بجے نواب میرزا نے عشا کی نماز پڑھی کھانا کھایا اور کوٹھری کی کنڈی اندر سے لگا کر بچھونے پر لیٹ گیا۔ وفادار بوڑھے نے سر مارا کہ آج مجھے بھی کوٹھری میں پٹی کے نیچے سو رہنے دیجیے مگر نواب میرزا نے نہ مانا۔ ناچار شیخ جی باہر سائبان میں پڑ رہے۔ آدھی بجگئی سرا کے سب مسافر سو گئے ہوا سناٹے سے چلنے لگی لبستی کے کتوں نے بھیانک لہجہ میں رونا شروع کیا۔ اور جنگل سے گیدڑوں نے وحشت خیز لہجہ میں جواب دیا۔ نواب میرزا گو دلیر اور عاقل شخص تھا مگر متخیلہ پر کسی کا زور نہیں چلتا ہے اس کے دل میں قسم قسم کے وسوسہ اور اندیشہ پیدا ہونے لگے۔ اور نیند اڑگئی ۔ یہ سوچنے لگا کہ اس کوٹھری میں انسان کیوں مر کر رہجاتا ہے اور اس کا کیا سبب ہے ۔ چراغ دھیرے دھیرے جل رہا تھا انھیں خیالات کے تلاطم میں نواب میرزا نے دیکھا کہ کوٹھری کے کواڑوں میں جو دراڑین ہیں انکی اندر سے کالا کالا دھواں کوٹھری میں آرہا ہے ۔ اور دم بدم زیادہ ہو رہا ہے ۔ پہلے تو نواب میرزا نے خیال کیا کہ مسافروں نے مچھروں کے بھگانے کے لئے سرا کی انگنائی میں دھونی رمائی ہوگی اور وہیں سے یہ دھواں آرہا ہوگا ۔ مگر نہیں دو چار بار دھوئیں نے کوٹھری میں ایسی حرکت کی جس سے نواب میرزا کو یقین ہوگیا کہ درحقیقت یہ دھواں نہیں ہے وہی بلا ہے جس کو دیکھکر مسافر دہل جاتا ہے۔ اور خوف کے مارے اس کا دم نکلجاتا ہے کیونکہ ایکبارنہ دھواں کوٹھری میں اس قدر پھیلا اور بڑھا کہ چراغ کی روشنی اسمیں

گم ہوگئی اور نواب میرزا کی آنکھیں اندھی ہوگئیں اور قریب تھا کہ اس کا اس دہوئیں کی شدت سے گھٹ کر دم نکلجائے مگر چونکہ وہ اسد بیگ کا بیٹا تھا اور موت کی پروا نہ کرتا تھا اس نے اپنی طبیعت کو سنبھالا۔ طبیعت کا سنبھلنا اور دہوئیں کا کم ہوجانا یہانتک کہ دہواں ڈبل پیسہ کی برابر گول ہوکر چھت میں رہگیا اور چراغ کی روشنی کوٹھری میں پھیل گئی۔ نواب میرزا نے اپنے دل کو سمجھایا کہ یہ وہ دشمن نہیں ہے جسکا تلوار یا خنجر سے مقابلہ کیا جائے اس کی روک صرف ہمت اور اوسانوں کی درستی سے ہوسکتی ہے۔ اب پھر دہواں بڑہنا شروع ہوا اور کوٹھری میں پہلی طرح گھپ ہوگیا۔ اور خلاصہ یہ ہے کہ رات بھر میں سینکڑوں بار دہوئیں نے گھٹ بڑھکر نواب میرزا کو ڈرایا مگر وہ بہادر اصلا نہ ڈرا صبح ہوتے ہی دہواں جس طرح آیا تھا اسی طرح دڑاڑوں سے نکل گیا اور نواب میرزا فجر کا دوگانہ پڑہنے کے لئے باہر آیا تو بھٹیارنی اور سرا کے سب مسافروں کو اسے دیکھکر سخت تعجب ہوا کیونکہ اخیٹا کی سرا کی بلا مشہور تھی۔ اور دکن کے کونہ کونہ اور چپہ چپہ میں یہ قصہ لوگوں کی زبان پر رہتا تھا جس کسی نے ان سے پوچھا کہ رات کو آپنے کوٹھری میں کچھ دیکھا تو انھوں نے کہدیا کچھ بھی نہیں۔ مگر انکا شوق یہ کہتا تھا کہ جب تک دہوئیں کا پورا بھید معلوم نہ ہوجائے یہاں سے جانا نہیں چاہئے شیخ جی نے چلنے کے لئے کئی بار تقاضا بھی کیا مگر نواب میرزا نے سنی ان سنی کردی اور وہ ٹھیرہی گیا۔ دوسری رات کے آنیکا اتنا ہی اشتیاق تھا جتنا قیس کو لیلی کے آنیکا ارمان رہا کرتا تھا۔ وہ مغرب کی نماز پڑہتے ہی کوٹھری میں جا بیٹھا مگر آدھی رات تک دہواں نہ آیا۔ البتہ ۱۲ کے بعد اس کی آمد شروع ہوگئی اور کوٹھری میں اندھیرا چھا گیا۔ رات بھر دہوئیں نے اپنی ملت پھرت کے شعبدہ نواب میرزا کو دکھائے مگر نواب میرزا خبر بھی نہ ہوا اس کے دل میں دھڑکن بھی پیدا نہ ہوئی۔ صبح ہوتے ہی دہواں رخصت ہوا تیسری رات کو دہواں دونوں راتوں سے زیادہ کوٹھری

میں آکر جمع ہوا نواب میرزا کو معلوم ہوا وہاں کیا کالے کالے پہاڑ ہیں جو اُٹھتے چلے آتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان میں سے کوئی گر پڑے تو پس کر رہجاؤں گا۔ مگر یہ سب متخیلہ کے دھوکے تھے۔ صبح ہوتے ہی دہواں چلدیا نواب میرزا بھی پلنگ سے اُٹھا تاکہ دروازہ کھول کر باہر جائے۔ جو اس نے اپنے ہاتھ میں ایک کاغذ پایا۔ چراغ جل رہا تھا اسے کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا خط ہے پڑھا تو یہ مضمون تھا۔

"میرزا صاحب اگر آپ دہوئیں کا راز معلوم کرنا چاہتے ہیں اور عجیب وغریب تماشے دیکھنے چاہتے ہیں تو یہاں سے چار کوس پر اخیٹا کے غار میں تشریف لائیے اور بیجاپور نہ جائیے۔ مگر جب آپ غار کے دہانہ پر پہنچ جائیں۔ تو گھوڑا چھوڑ دیجیے گا اور پیادہ اندر آئیگا میں آپ سے وہیں ملوں گی۔"

دہوئیں کی یہ نیرنگیاں خط کا خود بخود ہات میں آجانا اور خط کے مضمون کا وہی ہونا جس کی خلش نواب میرزا کا دل رکھتا تھا۔ اُسے پاگل بنانے کے لیے کافی تھا نواب میرزا نے کوٹھری سے نکلتے ہی شیخ جی۔ سے کہا اسباب باندھو گھوڑے کسو۔ بس اب میں یہاں گھڑی بھر بھی رہنا نہیں چاہتا۔ شیخ جی کا دم ناک میں آرہا تھا انھوں نے دم بھر میں چلنے کا سامان کرلیا۔

۴

نواب میرزا نے چلتے وقت مہترانی کو کرایہ کے علاوہ پانچ روپیہ اور دئے کیونکہ اسے مارا پیٹا تھا اور اس کے چھوکرے کو سات لیا تاکہ اخیٹا کے غاروں تک پہنچا کر چلا آئے۔

شیخ جی۔ آپ بیجاپور چلتے ہیں یا اخیٹا کے غار دیکھنے جلتے ہیں۔

نواب میرزا۔ چلتے تو بیجاپور ہی ہیں مگر گھنٹہ بھر غاروں کی سیر کرلیں تو کیا ہرج ہے۔

شیخ جی ۔ آپ جانئے میرا کہنا تو آپ کے آگے چلتا ہی نہیں ہے جو جی میں آتا ہے وہ آپ کرتے ہیں "۔

تخمیناً چار ہی کوس چلے ہونگے جو اخیٹا کے غار آ گئے اور مہترانی کا چھوکرا سلام کر کے چلتا ہوا۔ نواب میرزا نے گھوڑے پر سے اتر کر دیکھا کہ پہاڑ کی جڑ ایک میل تک مشبک ہو رہی ہے۔ اور چھوٹے بڑے ہزاروں دہانے غاروں کے دکھائی دے رہے ہیں اور ان کے اندر تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ جسے دیکھکر سینہ کے اندر دل کانپا جاتا ہے۔ غار کیا ملک عدم کے بیشمار راستے ہیں جہاں سے پلٹ کر آنا ناممکن ہے۔

نواب میرزا ۔ شیخ جی آپ ذرا میرا گھوڑا پکڑ لیجیے میں غار کا ایک دہانہ جا کر دیکھ آؤں کہ کونسا بڑا ہے۔ اور کس کے اندر ہمیں آپ کو چلکر سیر کرنی چاہیئے۔ پھر ہم آپ دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے۔

شیخ جی ۔ حضور گھوڑا تو میں پکڑے لیتا ہوں۔ مگر خدا کے واسطے آپ غار میں نہ جائیے میرا دل ان کے دیکھنے سے کانپ رہا ہے جب باہر سے یہ اس قدر ہولناک ہیں تو خدا جانے ان کے اندر کیا قہر بھرا ہوگا۔ لعنت بھیجئے اور سیدھے بیجاپور چلئے۔

نواب میرزا نے شیخ جی کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور وہ غاروں کے دہانوں کو جھانکتا ہوا ایک فرلانگ چلا گیا۔ اور ایک بڑے سارے غار کے دہانے میں اتر گیا۔ شیخ عبداللہ بدنصیب نے گھنٹہ بھر نواب میرزا کا انتظار کیا۔ مگر وہ پلٹ کر نہ آیا۔ اور شیخ جی کو ہول دل پڑ گیا۔ گھبرا کر وہ اپنے یابو سے اُترے اور دونوں گھوڑوں کو درخت سے باندھکر اُدھر چلے جدھر نواب میرزا گیا تھا۔ پہاڑ کے نیچے جا کر دیکھا کہ ہزاروں غار اور غاروں کے ہزاروں دہانے ہیں۔ بیتیرا میرزا صاحب میرزا صاحب کہہ کر انھوں نے

اپنا گلا پھاڑا پاؤں کے نشان دیکھے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ نمک حلال نوکر نے شام تک نواب میرزا کو تلاش کیا۔ مگر وہ کہیں ہوتا تو ملتا ؎

کاروانم ہمہ بگذشت ز میدان شہود   ہمچو نقش کف پا نام و نشانم باقی است

جب دیکھا کہ اندھیرا ہوا جاتا ہے تو شیخ جی روتے پیٹتے انجیٹا کی سرا میں آئے مہترانی سے حال کہا تو اس نے کہا ع کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے تمہارے میاں نے مجھے بھلائی کے بدلے میں مارا تھا خدا نے ان کو دکھا دیا۔ شیخ جی ایک مہینہ تک سرا میں پڑے رہے دو تین آدمیوں کو سات لیکر صبح ہی جاتے خود بھی نواب میرزا کو ڈھونڈتے اور ان سے بھی ڈھنڈواتے مگر نواب میرزا کا نہ پتہ چلنا تھا نہ چلا شیخ جی کے پاس خرچ بھی ہو لیا۔ اس لئے روتے پیٹتے دلّی چلدئے۔ جب مرزی بیگم نے سُنا کہ جوان بیٹے کو پہاڑ نگل گیا تو وہ زندہ درگور ہوگئی دن رات روتی پیٹتی چیختی چلاتی مگر کیا ہوتا تھا ؎

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر   گیا ہے سانپ نکل تو لکیر پیٹا کر

لطیفہ یہ ہے کہ جس دن سے نواب میرزا انجیٹا کی سرا کو چھوڑ کر گیا پھر اس سرا کی کوٹھری میں کیلی کا کھٹکا بھی نہ ہوا۔ اور مسافر اس میں بیدھڑک ٹھیرنے لگے۔

۵

نواب میرزا اندھیرے غار کو طے کر کے ایک لق و دق میدان میں پہنچا۔ وہ حیران تھا کہ میں اب کدھر جاؤں جو اس نے دیکھا سامنے سے ایک پیر مرد چلا آتا ہے جب وہ نواب میرزا کے قریب پہنچا تو اس نے سلام کر کے مصافحہ کیواسطے ہات بڑھایا اور یہ کہا کیا آپ وہی شخص ہیں جو وجود ہوئیں کا بھید معلوم کرنے اور شہرستان انجیٹا کی سیر کے مشتاق ہیں۔

نواب میرزا۔ جی ہاں میں وہی شخص ہوں۔

پیر مرد۔ میں وہ خط دیکھنا چاہتا ہوں جو آج رات کو آپ کے ہاتھ میں کسی نے کوٹھڑی میں دیا تھا۔

نواب میرزا نے وہ خط جیب سے نکالکر پیر مرد کے حوالہ کیا۔ پیر مرد نے اسے غور سے دیکھا اور کہا آپ بالکل سچ فرماتے تھے۔ خدا شہرستان کی سیر آپ کو مبارک کرے آپ ذرا آنکھیں تو بند کر لیجیے۔ نواب میرزا نے آنکھیں بند کرلیں چند منٹ کے بعد پیر مرد نے کہا آنکھیں کھولتے جیے۔ نواب میرزا نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا میں ایک نقرئی کشتی میں سوار ہوں۔ جو ایک سنہری دیوار کے نیچے ایک دریا میں کھڑی ہے۔ دیوار کا قرینہ یہ کہتا ہے کہ کسی شہر کی فصیل ہے۔ دیوار میں عقیق سفید کا ایک دروازہ نصب تھا۔ جس کے کواڑ عقیق سرخ کے تھے۔ اور ایک یاقوت کا قفل اس میں لگا ہوا تھا پیر مرد نے اپنی جیب سے کنجی نکالکر دروازہ کا قفل کھولا اور نواب میرزا سے کہا بسم اللہ اندر تشریف لے چلئے نواب میرزا نے دروازہ میں قدم رکھا تو اپنے تئیں ایک محل میں پایا جس کے در و دیوار سونے کے تھے اور اس کا نقشہ خوبی اور دلربائی میں بہشت بریں سے ملتا جلتا تھا۔ پیر مرد نے ان کو لیجا کر صدر دالان میں بٹھا دیا جہاں جواہر دوز مسند بچھی ہوئی تھی۔ اور وہ کسی طرف چلا گیا۔ نواب میرزا مکان کی تیاری کو حیرت کی نظر سے دیکھ رہا تھا جو پہلو کے کمرہ کا ریشمی جھالردار پردہ مرواریدہ سرکا اور ایک عورت حسین خوبرو شاہانہ زیور اور لباس پہنے ہوئے نکلی۔ جس کے رخساروں کی تجلی سے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس عورت کی عمر تقریباً چالیس برس کی ہوگی۔ نواب میرزا گھبرا کر اس کی تعظیم کے لئے اٹھا اور اس نے انھیں بچوں کی طرح گلے لگایا بلائیں لیں اور کہنے لگی۔ میں صدقہ گئی واری گئی تمہیں رستہ میں کچھ تکلیف تو نہیں ہوئی۔

نواب میرزا۔ کچھ نہیں آپ کی دعا سے بہت آرام کے ساتھ یہانتک

پہنچا ہوں۔ مگر حضرت مجھے معلوم نہیں کس نے بلایا ہے اور کیوں بلایا ہے اور یہ کیا مقام ہے۔

عورت۔ میں نے آپ کو بلایا ہے اور جو دھواں آپ کوٹھری میں دیکھتے تھے اور جس نے آپ کو خط لکھا ہے وہ میں ہی روسیاہ ہوں میرا نام مشکینہ گیسودراز ہے اور یہ میرا غریب خانہ ہے اور جس زمین پر آپ تشریف رکھتے ہیں اسے شہرستان اجنیہ کہتے ہیں۔ پچاس ہزار برس سے اسمیں ہنی جان رہتے ہیں۔ پہلے اس کا اصلی نام انسانوں کو یاد تھا۔ مگر کچھ مدت سے انھوں نے اسے بگاڑکر اجنہ کا اخیڈہ کرلیا ہے۔

نواب میرزا۔ آپ دھواں بنکر سرائیں کیوں جاتی ہیں۔

مشکینہ گیسودراز۔ میری ایک بیٹی چار برس سے بن بیاہی جوان بیٹھی ہے اُسے بر نہیں جڑتا ہے اسی فکر میں سرا جاتی تھی۔ کہ کوئی لایق لڑکا آدمی کا ہی ملجائے تو اس کے پلے سے باندھ دوں مگر آپ کے سوائے ابتک کوٹھری میں جو آدمی آکر ٹھیرے وہ دل کے ایسے بودے تھے کہ میری زلفوں کی سیاہی کو دیکھ کر مرگئے اور پھنکا نہ کھایا۔

نواب میرزا۔ کیا خوب ؎

تو اپنی کاکل مشکیں کے طول پر نازاں ۔۔۔ درازی شب ہجراں تری بلا جانے

مگر یہ تو فرمائے آپ اپنی قوم میں بیٹی کیوں نہیں دیتیں

مشکینہ گیسودراز۔ میاں کیا پوچھتے ہو اپنا گھٹنا کھولے اور آپ ہی لاجوں مرے ہماری قوم کے سب لڑکے بدچلن اور آوارہ ہوتے ہیں۔ جی نہیں چاہتا کہ اُن کے سات بیاہ کر قسمت پھوڑوں۔ میں نے اسی کارن آپ کو تکلیف دی ہے۔ اگر آپ اپنی خدمت کے لئے قبول کریں تو آج ہی اس کا نکاح آپ سے کردیا جائے۔ اور اگر آپ کو منظور نہ ہو تو صاف

کہدیجے۔ میں آپ کو وہیں پہنچادوں جہاں سے بلایا ہے۔ میں آپ کو دل وجان سے پسند کرتی ہوں۔ کیونکہ آپ شریف خوبصورت اور دلیر ہیں اور میرے امتحان میں پورے اترے لاکھ ڈرایا مگر نہ ڈرے۔ شاباش ہے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔

نواب میرزا کا دماغ ان حیرت انگیز باتوں نے خراب کر دیا تھا۔ اس کی عقل سلب ہو گئی تھی اور سچ مچ کی پری کو وہ کب چھوڑنیوالا تھا اس نے فوراً ہاں کر لی۔

مشکینہ گیسو دراز۔ دو شرطیں آپ کو منظور کرنی پڑیں گی۔

نواب میرزا۔ وہ کیا؟

مشکینہ گیسو دراز۔ ایک تو یہ کہ عمر بھر اس محل اور باغ سے آپ کو باہر جانا نصیب نہ ہوگا کیونکہ میں نے آپکو بادشاہ اور قوم کی چوری سے بلایا ہے۔ چھپ کر رہنا پڑے گا اور اگر آپ چوکھٹ سے باہر پاؤں دھریں گے تو جن پکڑ لیجائیں گے بادشاہ آپ کو ہلاک کرواویگا اور ہمارا گھر بھی برباد کر دیا جائے گا۔ دوسری یہ کہ ہم نئی جان ہیں ہماری خصلتیں اور رسمیں بنی آدم کے خلاف اور برعکس ہیں اگر آپ کسی وقت کوئی بات نئی اور انوکھی دیکھیں تو اس کی لم نہ دریافت کریں کیونکہ اس کا پوچھنا گالی سے زیادہ ہمارے ہاں عیب گنا جاتا ہے اور پوچھنے والیکو سزا دی جاتی ہے آپ کیلئے یہ سزا ہوگی کہ آپ کو شہرستان سے نکالدیا جائیگا اور آپ عمر بھر پرستان کے عیش کو رویا کریں گے۔

نواب میرزا۔ "مجھے یہ شرطیں منظور ہیں"

نواب میرزا کے ہاں کرنیکی دیر تھی۔ قاضی صاحب آئے۔ نواب میرزا دولہا بنکر مسند پر بیٹھے۔ پرستان کا لباس پرستان کا زیور پرستان کے پھولوں کا سہرا بدبی طرہ عطر سب ہی کچھ نرالا تھا نکاح ہو گیا۔ دولہن کا نام زہرہ زرینہ کفش تھا۔ زہرہ کی تعریف صرف اتنی کافی ہے کہ وہ پری تھی اس کا پنڈا آئینہ سے زیادہ صاف تھا۔ اس کا چہرہ گویا آفتاب عالمتاب تھا باغ کا سہانا سماں طلسماتی بہاریں ہوش ربا تھیں زہرہ کی کم سنی اور دل آرائی سے

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

نواب میرزا کو عیش ونشاط میں دو برس تک یہ خبر ہی نہ ہوئی کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں گھر کہاں تھا کہاں سے آیا تھا کہاں جاتا تھا۔ اور غالباً اس میٹھے خواب سے اس کی آنکھ عمر بھر نہ کھلتی مگر اس کی بدنصیبی سے پری حاملہ ہو گئی۔

مشکینہ گیسو دراز۔ بیٹا نواب میرزا مبارک ہو تمہاری بیوی کو کچھ ہے ہماری قوم کا دستور ہے کہ جب تک بال بچہ نہیں ہو لیتا اس وقت تک میاں سے بیوی پردہ کرتی ہے اس لئے اب زہرہ تمہارے پاس جم ہی جم آئیگی۔ اصل خیر سے بامراد ملنا۔

نواب میرزا۔ سنگ آمد و سخت آمد۔ بہت اچھا جو آپ کی خوشی۔

جدائی اور جدائی بھی معشوق سے اور معشوق بھی کون کہ پری۔ نواب میرزا کو دس مہینے کاٹنے دو بھر ہو گئے۔ جب وہ پائیں باغ میں آکر رہا تھا وہ بارہ دری سے باہر بھی نہ نکلا تھا۔ مگر اب وہ سارے باغ میں چلتا پھرتا۔ مگر اس کا جی نہ بہلتا۔ ایک دن اس نے گل اندام لونڈی سے کہا۔ مجھے تو چھت پر لے چل میرا جی شہرستان کی عمارتیں دیکھنے کو چاہتا ہے۔

گل اندام کا دل نواب میرزا سے ملگیا تھا۔ کیونکہ جب مشکینہ گیسو دراز اسے مارتی توڑتی تو وہ اسکی شکایت نواب میرزا سے کر کے اپنا دل ہلکا کر لیا کرتی تھی۔ وہ اسے چھت پر لیگئی اگرچہ مشکینہ کی ممانعت تھی۔ نواب میرزا نے جب شہرستان کی خوبصورت عمارتیں دیکھیں اور شاہی قصر و ایوان کا نظارہ کیا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہگئیں۔ کیونکہ جنوں کی دستکاری طرفہ اور عجیب وغریب تھی۔

نواب میرزا۔ یہ سجدہ گاہ جواہر نگار جس کے مینارے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں کس کی بنی ہوئی ہے

گل اندام۔ ہمارے پیغمبر سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کی ہے یہ حضور نے ہی بنوائی تھی۔

نواب میرزا۔ یہ بیچ صحن میں اس کے قبہ کیسا ہے۔

گل اندام۔ اس قبہ کے اندر حوض ہے جسمیں حضور وضو کیا کرتے تھے۔ اس

حوض کے پانی میں یہ اثر ہے کہ جو جن پری اس سے نہائے اس کے قوائے ناریہ بجھ جاتے ہیں طاقت پرواز زایل ہو جاتی ہے اور وہ بنی آدم کی طرح مٹی کا ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ جس کسی مجرم جن کو سزا دینی ہوتی ہے تو حاکم اُسے اس حوض میں غوطہ دیکر شہرستان کی سرحد سے باہر نکالدیتا ہے۔ اور وہ جن آدمی بنکر دھکّے کھاتا پھرتا ہے اور آخر کار مرکر رہجاتا ہے۔ اسی لئے قبہ میں قفل لگا رہتا ہے۔ اور اس کی ہر دم حفاظت کیجاتی ہے تاکہ کوئی جن اپنے مخالف جن کو اس حوض میں غوطہ ندے سکے ؎

زندگی در گردنم افتادہ بیدل چارہ نیست شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔

خدا خدا کر کے دس مہینے گزرنئے بی زہرہ چلہ نہالیں لڑکا ہولیا۔ اور وہ وقت قریب آیا

؎ چہ خوش باشد کہ بعد از انتظارے بامیدے رسد امیدوارے

گل اندام نے آکر کہا بڑی بیوی نے آپ کو دعا کہی ہے اور فرمایا ہے محل میں آکر اپنی بیوی بچہ کو دیکھئے خدا کا شکر بجالائے۔ نواب میرزا پہنچے تو دیکھا زہرہ پری نہائی دھوئی دلہن بنی پرستان کے موتیوں کی ایک پٹی سر سے باندھے بچہ کو گود میں سوزنی کے اندر لئے ہوئے بڑے طمطمہ سے جواہرنگار پلنگ پر بیٹھی ہے۔ زچہ خانہ میں جو پرستان کے میوہ اور سوڑہ کھائے ہیں تو گال یاقوت کی طرح چمک رہے ہیں۔ جو بن ٹپکا پڑتا ہی یہ کرسی پر بیٹھ گئے اور زہرہ نے دو انگلیوں سے ان کو سلام کیا۔ شکینہ نے لڑکے کو ان کی گود میں دیدیا۔ انھوں نے بچہ کی صورت دیکھی تو خوشی کے مارے جامہ میں پھولے نہ سمائے۔ اوّل تو خود ہی مغل تھے پھر جو ر و ملی پری۔ بچہ مجنّس ہوکر عجیب ہی شکل کا پیارا پیارا ہوا۔ جب بچہ کسمسایا تو شکینہ نے بچہ کو زہرہ کی گود میں دیدیا اور خود وہاں سے اُٹھکر چلی گئی۔ میاں بیوی باتیں کرنے لگے۔ نواب میرزا فراق کی داستان کہہ رہے تھے جو یکایک بچہ زور سے رویا۔ بچہ کا رونا تھا کہ نواب میرزا نے دیکھا سامنے والے حجرہ کا دروازہ کھلا۔ اس میں سے ایک شیرنی مہیب شکل کی گرجتی اور دوڑتی

ہوئی اس تھہ سے نکلکر زہرہ کی طرف جھپٹی کہ نواب میرزا کے حواس گم ہوگئے۔مگر زہرہ تمکنت کے
ساتھ بیٹھی رہی جب شیرنی اس کے پاس اپنا منہ کھول کر اور دانت نکال کر آئی تو اس نے بچہ گیو
میں سے اٹھا کر اس کے منہ میں دیدیا۔اور وہ شیرنی بچہ کو منہ میں لیکر کوٹھری میں اس طرح
چلی گئی جس طرح بلی کبوتر کو پکڑ کر لیجاتی ہے۔

نواب میرزا۔ تمنے کیا غضب کیا میرے لخت جگر کو شیرنی کا نوالہ کرادیا۔

زہرہ۔ آپ گھبرائیے نہیں آپ کا بچہ صحیح سلامت ہے۔

نواب میرزا۔ اجی بیٹھو کیا صحیح سلامت ہوگا اُسے تو شیرنی کھا گئی میری سمجھ میں
نہیں آیا کہ شیرنی کوٹھری میں کہاں سے آئی اور تمنے اس کے منہ میں بچہ کیوں دیدیا
اور پھر تم کڑھتی نہیں گھبراتی نہیں تمہارا دل ہے یا پتھر ہے۔

زہرہ۔ دیکھو یہ وہی بات ہے جس کی شرط آپا جان نے آپ سے پہلے دن
کروالی تھی اس میں آپ بولئے نہیں اور کچھ زیادہ کہئے نہیں آپ بہت پچتائیں گے۔

نواب میرزا۔ لعنت ہے اس شرط پر تم بچہ کو میرے شیرنی کے منہ میں دیدو
اور پھر مجھ سے شرط کی پابندی کرواؤ۔مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا۔

زہرہ نے نواب میرزا کو بہت سمجھایا مگر بچہ کی مامتا کے آگے اس نے اس کے
سمجھانیکی اصلا پروا نہ کی وہ غصہ کے مارے آپے سے باہر ہوگیا۔مشکینہ اس میں آگئی
اس نے بھی بہت کچھ سمجھایا مگر تقدیر پلٹا کھانیوالی تھی نواب میرزا چیختا چلاتا رہا۔

مشکینہ۔ تو نواب میرزا تم راضی ہو تمہیں اسبات کا بھید بتا دیا جائے اور
شہرستان سے نکالدیا جائے۔عمر بھر افسوس کروگے۔

نواب میرزا۔ تو تو میٹھے جبکہ ہم جام وسبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے
ہاں ہاں میں راضی ہوں۔

مشکینہ۔ سنئے بچہ آپ کا زندہ سلامت ہے۔ وہ شیرنی جو اُسے لیگئی وہ اُس کی انا تھی ہمارے ہاں بچوں کی انا شیرنی کی ہی صورت میں رہا کرتی ہے۔

یہ کہکر مشکینہ نے دستک دی اور نواب میرزا نے دیکھا ایک لنبی بھکاری عورت بچہ کو لئے آئی اور پیچ کر چلی گئی۔ نواب میرزا بچہ کو دیکھکر شاد ہو گیا۔ مگر مشکینہ کا چہرہ مارے غصہ کے سیاہ ہو گیا اور اس کے مُنہ سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔ اس نے جنی زبان میں چند کلمہ مُنہ سے کہے اور آسمان پر سے ایک بڑا سارا گدھ آیا اور نواب میرزا کو چڑیا کی طرح چنگل میں اُٹھا کر لیگیا۔ اور ہزار گز اونچا لیجا کر پنجہ سے چھوڑ دیا۔ نواب میرزا اس صدمہ سے بیہوش ہو گیا۔ اور جب اُسے افاقہ ہوا تو اس نے اپنے تئیں شہرستان اجنہ کے باہر اس فصیل کے نیچے کھڑا پایا جس میں عقیق سفید کا دروازہ کبھی پہلے لگا دیکھا تھا۔ مگر آج وہ دروازہ غائب تھا۔ سامنے دریا تھا پیچھے دیوار تھی نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے سرک سکتا تھا۔ نواب میرزا کو اپنی بیکسی اور بربادی پری کی جدائی بچہ کے قلق وطن کی یاد پر افسوس ہوا۔ اُس کا جی بھر آیا۔ اور وہ دریغ کی آواز سے رونے لگا۔ اور اسی رونے میں اُس نے سُنا کوئی شخص اُسے پکارتا ہے۔ اس نے ہر طرف دیکھا مگر بولنے والا دکھائی نہ دیا۔ اور یہ ہکا بکا ہو گیا پھر آواز آئی کہ اوپر دیکھو اس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا فصیل میں ایک جھروکہ ہے۔ اور جھروکہ میں ایک نازنین حوروش بیٹھی ہوئی ہے نواب میرزا نے اُسے سلام کیا نازنین نے پوچھا تم کون ہو اور شہرستان اجنہ کی سرحد کے پاس غار طے کر کے اور دریا عبور کر کے کیونکر پہنچے ہو۔ نواب میرزا نے اپنی رام کہانی نازنین کو سنائی۔

نازنین۔ اوہو وہ بھٹیاری تمہیں پرستان میں لے پہنچی تھی۔ وہ تو بیچاری غیبانی پچھا ہے کہکر بھولی پر نہ چڑھ ہوا یا ہو تو سہی۔ اچھا نواب میرزا تم اوپر آجاؤ ہم تمہیں

تمہارا بچہ اور تمہاری جورو دلا دیں گے۔

نواب میرزا۔ میں اوپر آپ کی خدمت میں کیونکر آسکتا ہوں نہ میرے پر ہیں نہ جھروکہ کا زینہ ہے۔

نازنین نے کہا پروں اور زینہ کی کیا ضرورت ہے۔ تم میرا ہاتھ پکڑ لو میں تمہیں اوپر کھینچ لونگی۔ اسکے ساتھ ہی نازنین کا ہاتھ جھروکہ سے نکلکر نواب میرزا کی کمر تک آگیا اور ایک اشارہ میں نواب میرزا اوپر پہنچگیا۔ اور اس نے دیکھا میں ایک قصر شاہانہ میں ہوں جس کے آگے مشکینہ کے محل اور باغ پیخانہ سے بدتر ہیں۔

نازنین۔ تمہاری ساس قوم کی بھٹیاری ہے اور اسیواسطے وہ سرا میں جا کر اپنی لونڈیا کیلئے خصم ڈھونڈتی تھی اور تمہیں بھلامانس پاکر اپنے پھانسا اور شہرستان میں لے آئی اور مردار نے یہ خیال نہ کیا کہ آدم زاد کے رہنے سہنے سی شہرستان کی آب وہوا پر کیا اثر پڑیگا۔ اور رئیس الجنہ سن پائگا تو کیا ہنگی۔ تم تو بے فکر ہو مگر کل دیکھنا دربار میں اسکی کیا سزا ملتی ہے۔

نواب میرزا نے رات رئیس الجنہ کی بھتیجی کے محل میں کاٹی۔ اور صبح ہوتے ہی نازنین اُسے اپنے چچا رئیس الجنہ کے دربار میں لے پہنچی اور نواب میرزا کی داستان اُسے سُنادی۔ نواب میرزا رئیس الجنہ کے دربار کی شان وشوکت اور جنوں کی ہولناک پرہول شکلیں دیکھکر سہم گیا۔ رئیس الجنہ نے حکم دیا مشکینہ اور اسکی بیٹی زہرہ کو مع بچہ کی حاضر کرو سرہنگ جن گئے اور دونوں ماں بیٹیاں کو مشکیں کس کرلے آئے۔ جب ان ماں بیٹیوں نے نواب میرزا کو دربار میں دیکھا تو ہوش اُڑ گئے اور سمجھیں کہ اب خیر نہیں ہے۔

رئیس الجنہ۔ ان دونوں ماں بیٹیوں کو سو سو کوڑے شہاب ثاقب کے مارو۔

شہاب ثاقب کا نام سنتے ہی دونوں چیخنے چلانے لگیں۔ اور سلیمان سلیمان کہنے لگیں ناگہاں ایک جن آیا اور اس نے غلاف میں سے شہاب ثاقب کا کوڑا نکالا۔ اوسکی روشنی دیکھکر نواب میرزا کی آنکھیں بند ہوگئیں اور تمام جن لرزنے کانپنے لگے۔ اور ہر طرف سے استغفر اللہ

رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ کی آواز آنے لگی ۔جب شہاب ثاقب کو جنبش ہوئی تو اسمیں سے آگ کی چنگاریاں نکلنے لگیں ۔اور جب مشکینہ اور زہرہ پر اسکی مار پڑی تو ان کے کپڑے جل گئے ۔بدن پر آبلہ پڑ گئے ۔جب کوڑے سو پورے ہو لئے تو رئیس الجنہ نے فرمایا مشکینہ کو چھوڑ دو اور زہرہ اور زہرہ کے بچہ کو ہمارے اس حکمنامہ کے ذریعہ سے مسجد شریف میں لیجاؤ ۔اور خازن قبہ سے قبہ کھلوا کر حوض سلیمانی میں غوطہ دو اور جب زہرہ اور اس کے قوائے ناریہ بالکل نہ رہیں ۔اور بنی آدم کی طرح معمولی عورت ہوجائے تو پھر زہرہ اور نواب میرزا اور اس کے بچہ کو نواح دہلی میں پہنچا کر اطلاع دو ۔دربار برخاست ہوا رئیس الجنہ کے حکم کی تعمیل فوراً ہوگئی ۔

ہرمزی بیگم صبح کے وقت قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں جب شیخ عبداللہ نے ڈیوڑھی پر آکر کہا بیگم صاحب مبارک ہو چھوٹے میرزا صاحب تشریف لے آئے اور بھرے پُرے آئے وطن بھی سات ہے اور چاند جیسا بیٹا بھی ؎

خوشا وقتے وخورم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

زہرہ کے سراپا میں وہ نور تو نہ رہا تھا جو حوض سلیمانی میں نہانے سے پہلے اور دلی میں آنے سے آگے تھا ۔مگر اس پر بھی اس کے حسن اور صفائی رخسار کے آگے دلی کی ساری بیگمیں ہیچ تھیں ۔جب اُسے شہرستان یاد آتا تو وہ گھنٹوں روتی اور کسی کے سامنے اپنا قصہ کہتی تو ہنسی اُڑتی اور مالیخولیا کا گمان ہوتا ۔

سید ناصر نذیر فراق دہلوی

مولانا حسرت مرحوم

نمبر ۲

تغزل

تاہم کیا جا سکتا ہے کہ جس شخص کا کلام حمد و نعت میں ایسا پر زور و دلاویز ہو اس کی ترنم ریزی چمنستان تغزل کے شاخساروں پر کیسی کچھ لذت آفریں ہوگی۔ حمد و نعت شاعری کا وہ حصہ ہے جس کا میدان تنگ ہے۔ جس کے کوچے پر پیچ اور دشوار گذار ہیں جس کی شاخیں ٹھنڈ ہیں مگر جب سرزمین ہند کا ایک شاعر اس میدان میں اپنے سمند قلم کو چلاتا ہے تو وہ چکر اور ایسی ایسی چال نوی ایجاد کرتا ہے۔ کہ تماشا بینوں کی نگاہ محو حیرت ہو جاتی ہے۔ وہ اسی ٹھنڈ اور خشک ڈالیوں پر جب نغمہ سرائی کرتا ہے تو آواز کان سے دماغ میں دماغ سے دلمیں اترنے بھی نہیں پاتی کہ خانہ دلمیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایک انمٹ سرور کا گہرا نقش جما دیتی ہے۔ بخلاف تغزل کے کہ اسکی سڑکیں کشادہ اور فراخ ہیں۔ اس کا عرصہ بزم وسیع ہے اس کی جس شاخ پر نظر ڈالو۔ شاعروں کی پیا پے آبیاری سے تر و تازہ سرسبز و شاداب معلوم ہوں گی۔ تم جس شعبہ پر لکھنا چاہو گے ہزاروں شعرا متقدم کے کلام تمہارے ہاتھ بٹانے کے لئے تیار نظر آویں گے۔ ظاہر ہے کہ جس کا حمد و نعت میں یہ حال ہو۔ وہ جب اپنے اشہب قلم کی باگ ادھر پھیریگا۔ جانے کیا آفت ڈھائیگا۔ اور اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ فارسی شعراء کے دور اخیر میں مولانا مرحوم غنیمت تھے۔ آپکی طبیعت ایسی کچھ جدت طراز اور نو پسند تھی کہ جس کی نظیر ہم متاخرین میں بہت کم دیکھتے ہیں۔ حمد و نعت میں انکی طبیعت کا اصلی جوہر راز سربستہ کی طرح رہا ہے۔ جہاں وہ حوصلہ کھولکر اپنے دل کے ارمان پورا کرنیمیں کامیاب نہیں ہوئے۔

مگر اب وہ وقت ہے جہاں ادب و لحاظ کی ضرورت کوسوں دور ہو گئی ہے۔ گو اس مجاز کے پردہ میں مستور وہی حقیقت ہے۔ لیکن مجاز کا وہ پردہ حائل ہے جو گستاخی اور شوخی کو مانع نہیں ہے۔ وہ اجازت دیتا ہے کہ جو کچھ دل میں آئے کہو۔

سمجھنے والے سمجھ لیں گے مطلب نکالنے والے اپنے مطلب نکال لینگے۔ اور یہی ہوتا ہے جس وقت اس کو کوئی رند شاہد باز سنتا ہے اپنی دلی کیفیات کو ہیجان میں پاکر عشق میں روز افزوں ترقی کرنے لگتا ہے۔ اور جب اسکی لطیفہ ریزی کسی صوفی حقیقت بیں کے کانوں پہ تراوش کرتی ہے وہ وجد میں آکر بیہوش ہو جاتا ہے کیونکہ شعر کے ہر مصرعے اور ہر لفظ میں قدوسیات کے جاہ و جلال کی کیفیات دیکھتا ہے۔ اور سرور میں آکر بیخود ہو جاتا ہے جس کو ہم شکر سے تعبیر کرتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ غرضکہ علامہ مرحوم سرزمین ہند کے ایک زبردست اور عالی دماغ شاعر ہیں۔ شاعری کی ہر صنف میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ بلاغت و فصاحت میں دقیقہ شناس طبقوں سے نہایت خوبی کیساتھ داد لیتے ہیں۔

یہ اپنے جادہ شاعری میں زیادہ تر حافظ شیراز کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ بلکہ اپنی اس تقلید میں اپنے کو کامل پاکر ایک جگہ فرماتے ہیں۔

کسے سخن نرساید بگفتہ حافظ چو حسرت ارچہ نظم او در ثریا را

حافظ شیراز کے کچھ ایسے دلدادہ و شیدا ہیں کہ انکی اکثر غزلیں پر غزلیں لکھی ہیں۔ حتی کہ حافظ کے دیوان کی پہلی غزل پر اپنی جدت آفرین طبیعت کے زور سے ایک عجیب غریب صنعت کا اظہار کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مرحوم کی خاص ایجاد ہے۔ ایک مصرعہ اپنا ہو اور دوسرا غیر کا۔ یہ طرز مصرعہ ہونچانیکا اگر در اصل مولانا کی ایجاد ہے تو پھر مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ مولانا ان لوگوں میں سے ہیں جن کی نکتہ رس طبیعت کی فارسی شاعری زیر بار احسان ہے اور اگر انھوں نے تقلید میں اپنا نام ممتاز شعراء کے

پہلو میں درج کرایا ہے تو بلا شبہ یہ ان جدت طراز شعراء کے ساتھ ہمنشینی کا دعوے کر سکتے ہیں جنھوں نے ہزاروں اصناف نکالکر فارسی شاعری کو سرچشمہ حلاوت و شیرینی بنادیا۔ آپ کی وہ غزل جو اس طرز میں لکھی گئی ہے ذیل میں درج کیجاتی ہے ؎

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا	بیکجام شراب اساں توانی کرد مشکلہا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا	چہ میدانستم ایں بازی بجانبازی کشد آخر
زتاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا	ز چشم عاشقاں چوں نافہ خوں سینہ میریزد
کہ سالک بیخبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا	مکن عیبم براہ عشق اگر از سر کنم پا را
جرس فریاد میدارد کہ بر بندید محملہا	دل نالاں بایں وحشت سرا یکدم نیاساید
کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا	بگرداب بلا افتادہ ام اے اشنا دستے
نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا	ز سر عشق یار خود دل و جاں را مکن آگہ

حضور دوست چوں حافظ میسر شد مرا سر حسرت
متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا

تغزل میں جس قسم کی نئی اور چٹ پٹی باتیں پیدا ہوئی ہیں جس کے چٹخارے اہل زبان مدتوں لیتے رہے وہ زیادہ حافظ شیراز کے جوہر طبع کے نتیجہ ہیں۔

غزلخوان فارس کا سب سے پہلا شاعر حافظ ہے۔ جس نے شاعری کی سطح بدلدی اس کے سرے دھن الگ دے۔ مگر تاہم حافظ جس خاص رنگ کا موجد کہے جاسکتے ہیں جس سے ان کے گذشتہ شعراء کے کلام خالی ہیں۔ وہ "عربک و پرشین" اختلاط ہے۔ فارسی مصرعوں کے ساتھ عربی مصرعہ کا اتحاد و انضمام جس وقت کیا جاتا ہے ایک ذوق سلیم رکھنے والے شاعر کے سامنے گنگا اور جمنا کے دو مختلف گر سرور آمیز رو کی دوش بدوش خوشخرامی کا سماں آنکھوں کے نیچے پھر جاتا ہے۔ حافظ نے اس طرز کو ایجاد کیا۔ اور اس کے کچھ ایسے دلدادہ ہوئے کہ دیوان کی کم غزلیں

اس سے محروم ہیں۔ ابتداء دیوان کا مطلع بھی اسی دلفریب رنگ میں ہے
مولانا مرحوم بھی سالار کاروان کی تقلید کرتے ہوئے مشرق دیوان کا مطلع اسی
طرادت انگیز طرز میں لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔

ہر آنچہ خواہی بکن و لیکن مباز چشم مکن جدا	ہلیق صبراً علی البلایا ومنک لا استطیع صبرا
	بہتر کی باتیں سہہ سکتا ہوں لیکن تیری ہجر کی مصیبت کی طاقت نہیں رکھتا

حافظ کی شوخ و شنگ طبیعت نے اسمیں جیسی کچھ نزاکتیں پیدا کیں وہ تو
خیر مولانا مرحوم کے کلام کو کیونکر حاصل ہو سکتی تھیں۔ مگر جہانتک لکھا ہے اچھا لکھا ہے۔ ایک
موقع پر لکھتے ہیں

بے جام و بے صراحی یا ایہا السکاری	اِنّی سقیتُ خمراً من عینہا مرارا
موئے سفید قدرم در عاشقاں بیفزود	شیب الم راسی قد زادنی وقارا
	بڑھاپے نے آکر اور میری عزت دوبالا کر دی
از عاشقاں بہ ہجراں صبر اے بتاں چہ امکاں	من یستطیع منا فی ہجرکم قرارا
تا سر سہا نمودی چشمان خواب آلود	لا نوم فی جفونی لیلاً و لا نہارا

غرضکہ اسی قسم کے سینکڑوں اشعار ہیں جہاں فارسی و عربی کے ڈانڈے
آپس میں ملا دئے گئے ہیں اور مولانا کو اپنے ہمچشموں میں نہایت حوصلہ افزا کامیابی
ہوئی۔ ایک غزل اسی صنعت میں یہ لکھتے ہیں

اے لب لعل تو شفاء علیل	ہل لنا منک رخصۃ التقبیل
گر جفا بینم از تو بد نشدم	کل شئ من الجمیل جمیل

دور سابق کی ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ شعراء اکثر علماء اور صلحاء ہوا کرتے تھے
عروس شاعری جاہل اور شرابخواروں بادہ پرست شاہد بازوں کی مجلس سے سخت
متنفر تھی۔ ہر ایک شاعر کے لئے ضرور تھا کہ وہ اعلیٰ درجہ کا صوفی اور عمدہ درجہ کا عالم ہو۔
مولانا حسرت مرحوم گو اخیر زمانے میں پیدا ہوئے لیکن قدما کے ہمنوا اگر وہ طرز شاعری
میں ہوئے تو پھر اور اور خصوصیات متقدمین شعرا کی بھی انمیں پائی جاتی تھیں۔ آپ

ایک زبردست عالم اور نہایت خدا ترس صوفی تھے۔ تصوف کا رنگ انکے کلام سے خود بخود پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہے اس کے اوپر دلیل قایم کرنیکی ضرورت نہیں البتہ ان کے علمی پایہ کا اندازہ ہم ان کے کلام سے کر سکتے ہیں۔ تم ان کے ان اشعار کو پڑھو جو شاعرانہ تخیلات کے نمونہ ہیں۔ انہیں اکثر تعلیل کا مبنی آپ فلسفہ کے مسئلہ کو قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر لکھتے ہیں ؎

ازول غمت بر دل نرود تا ابد مرا
کیں ورد شد ز روز ازل نامزد مرا

اس شعر کے حسن تعلیل کا تمام ہونا اس مقدمہ حکمیہ پر موقوف ہے جو فلسفہ اشراقی کے رئیس افلاطن کے نزدیک مسلم ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں ازلی ہیں وہ ابدی ہیں۔ اسی بناء پر پہلے وہ روح کی ازلیت ثابت کرتا ہے پھر انکی ابدیت پر اسی مقدمہ سے دلیل لاتا ہے۔ ایک جگہ بدیع کے مسئلہ طباق و تضاد (یعنی ایسے دو امور کا ایک جگہ واقع کر دکھانا جو ایک دوسرے کے آپس میں ضد ہوں) کی رعایت کرتے ہیں مگر تضاد کو مشائیہ کے اس مذہب پر مبنی کرتے ہیں جو ان کے نزدیک زمانہ کے غیر قار ہونے کے متعلق خیال ہے۔ یعنی زمانہ وہ چیز ہے جس کے اجزا ایک دوسرے کیساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ لکھتے ہیں ؎

کہ از جلوہ بخلق افگن غوغائے قیامت را
امروز تماشا کن فردائے قیامت را

آج کا کل کے ساتھ جمع ہونا محال ہے اور مولوی صاحب اس کو واقع کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔ مبصرین جانتے ہیں کہ آج کا اجماع کل کیساتھ محال ہے کہ زمانہ غیر قار ہے۔ کبھی کبھی عالم نیچرل (طبعی) اثرات اور سلسلہ علت و معلول پر اپنے شعر کو مبنی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

ہیچ لبستہ ز سرد مہری تو
اشک از مژہ ام چکیدنی نیست

رقیق چیز کا سرد مہری سے جم جانا سائنس کے بادل اور بارش برف وغیرہ کائنات جو یہ کے کون و فساد کا اصلی راز ہے۔ غرضکہ اسی قسم کے مذاق فلسفیانہ میں آپ نے بہت سے شعر لکھے۔ خوف تطویل سے فروگذاشت کئے جاتے ہیں۔ ایک جگہ آپ نے فلسفہ کی دو کتابوں کا ذکر شاعرانہ پیرایہ میں کیا ہے لکھتے ہیں ؎

بے نیاز از حکمت العین آمدہ — نیست محتاج اشارات شفا
رمز دان نرگس شہلائے یار — مستفید ابرو ولبہائے یار

بندش زور کلام کا سچا راز ہے۔ انسان مضمون کتنا ہی باریک اور عدد رجہ کا لئیق کیوں نہیں پیدا کرے جب تک اسمیں صفائی بندش کی نہ ہو وہ کلام پھیکا اور مہمل ہی۔ مولانا حسرت کی بندش ہی نہایت پاکیزہ ہے اپنے اشعار میں کہیں احتمال پیدا ہونے نہیں دیتے۔ بعض بعض موقعوں پر تو غضب کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

یا ابر سے ستیزم سیل از مژہ کشادہ — با برق رعد جنگم سر کردہ نالہا را
وہم تا لشکر غم را شکست در شب ہجران — زجوش اشک چوں انجم سپاہی کردہ ام پیدا
ہم ساقی و ہم ساغر ہم بادہ و ہم مست — از شیوۂ چشم تو خرابست دل ما

مشرقی شاعری کی روح۔ ایشیائی غزل سرائی کی جان۔ اگر دیکھا جائے تو وہ مضمون آفرینی ہے۔ ایشیا کا شاعر اسوقت شاعر ہوجاتا ہے جب وہ آسمان سے مضامین اتار کر زمین پر بکھیر دے یہی اس کے لئے مایہ فخر ہے کہ وہ ایک معمولی بات اس صورت سے بیان کرتا ہے جس کو نہایت باریک بار یا خود ہی سمجھنے میں ناصر ہو جاتے ہیں جبتک کہ انھوں نے شاعری میں ہی اپنی عمر کا بیش مقدار حصہ نہ صرف کیا ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مبالغہ اور ایسے ایسے مضامین پیدا کرنے جو خواہ وہم اور خیال

کی سرحد سے بھی باہر ہو کر وجود خارجی اور وجود ذہنی دونوں کے پیرہن کو اتار کر پھینکدیں۔ اور خامہ عدم میں جا گریں۔ یہ سخت شنیع امر ہے۔ لیکن اگر ایسی مضمون آفرینی ہو جو سہل الممتنع ہو جس کے سننے سے پہلے تو کچھ دقت واقع ہو۔ لیکن جب غور کیا جائے تو ایک لذت آفریں سرور کیساتھ سمجھ میں آجاتا ہے میں اپنے مذاق میں اس کو جائز ہی نہیں بلکہ اگر صفائی بندش کیساتھ ہو تو پھر ہر ایک ایشیائی شاعر کے لئے اس کو واجب قرار دیتا ہوں۔ مرحوم مولانا کی غزلیں زیادہ تر بہت صاف ہیں۔ مضمون بھی لکھتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ انکی مضمون آفرینی اسی معیار پر ہے جس کو میرا دل چاہتا ہے مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

از زخم کشتگانت آب حیات خیزد
گر در تبسم آری ان لعل جانفزا را

مردے اور پھر ان کے زخم۔ ظاہر ہے کہ حیات سے ان کو علاقہ واسطہ کیا۔ مگر مولانا اسی زخم میں نہ صرف حیات پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ آبحیات کا چشمہ ابلواتے ہیں۔ بلاشبہ حسن پرست طبیعتیں جانتی ہیں کہ عشق کا کشتہ جسوقت وہ بالکل مرجھا جاتا ہے اسکی روح مرجاتی ہے اور پھر اس عرصہ میں اس کا محبوب آگیا۔ اور ہنسکر اس نے اس کو اٹھا لیا ہے اسوقت اس پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے یا ہوتی ہوگی۔ اس کا اندازہ خود کر سکتا ہے۔ پس اگر مولانا اس کیفیت کو اس مضمون میں لا کر گئے تو کیا بیجا کیا۔

کفر و اسلام دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایک سے دوسرے کو مدد کیا مل سکتی ہے۔ بلکہ ہر ایک دوسرے کی ہستی مٹانے میں کارآمد ہوتے اور ہو سکتے ہیں مولانا دعوے کرتے ہیں کہ عاشق کی نگاہ میں یہ مسئلہ محض غلط ہے۔ کیونکہ علاقہ تشبیہ سے زلف کو وہ کفر سمجھتا ہے اور چہرۂ یار کو اسلام۔ اب تم کسی عارض گلگوں پر سیاہ زلف کی لٹیں لٹکا دو۔ دیکھو اسلام کیسا بارونق ہو گیا اور اس میں کس درجہ کی کشش پیدا ہو گئی۔

حسن فزوں کرد زلف عارض گلفام را
کفر دو بالا نمود رونق اسلام را

"حسن مقابلہ" میں مولانا اچھے ماہر ہیں لکھتے ہیں (یعنی دو مناسب چیزوں کا ذکر کرنا اور ہر ایک کے لئے متضاد صفتوں کا ثابت کرنا)

برہمن از شوق رویش کردہ مصحف در بغل　　　شیخ در سودائے مویش بستہ زنار آمدہ

ایک موقعہ پر اعلیٰ درجہ کی حسن تعلیل کیساتھ اپنے شاعرانہ دعوے کو ثابت کرتے ہیں ؎

دعوے عشق جز ابہ شہادت دست نیست　　　باور کہ مے کند سخن بے دلیل را

شعر کھلا ہوا ہے مطلب بھی ظاہر ہے۔ ناظرین خود اس کی تشریح کرکے لذت گیر ہوسکتے ہیں

"عشق و مشک را نتوان نہفتن" فارسی کی مشہور ضرب المثل ہے مشک کو نہ چھپا سکنا یہ ایک معقول بات ہے اسکی خوشبو پھیل جاتی ہے اور دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ لیکن عشق کیوں نہیں چھپ سکتا یہ ایک محض دعوے ہی دعوے ہے اس پر کیا دلیل ہے کہ وہ چھپ نہیں سکتا۔ اور پھر جبکہ سینے کے پردے میں پوشیدہ رہتا ہے۔ مولانا اس کو کس شاعرانہ تخیل کے ساتھ مدلل کرتے ہیں لکھتے ہیں۔ کہ "عشق دل کا ایک داغ ہے جو سینے کے اندر اس طرح ہے جیسے سینۂ فلک میں آفتاب۔ آفتاب گنبد مینا کے جگر کو چاک کرکے تمام عالم پر ظاہر ہو جاتا ہے پھر آفتاب داغ کیونکر سینے میں پوشیدہ رہ سکتا ہے" ؎

کے آفتاب ماند پنہاں بجرم افلاک　　　از سینہ داغ عشقم آخر شدہ آشکارا

اس کی کیا وجہ ہوتی ہے کہ عاشق چاہتا ہے کہ معشوق نظروں کے نیچے سے کسی طرح نہ ملے اس راز کے چہرے سے اس طرح برقع اٹھاتے ہیں ؎

ہرگز کسے نخواہد کز چشم دور ماند　　　خوباں چہ گونہ سازم دور از نظر شمارا

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان میں ضعف ہو تو اسقدر کہ بستر مرض سے اٹھ بھی نہ سکتا ہو۔
اور اسی وقت اسمیں وہ طاقت ہو کہ ہزاروں میل کی مسافت طے کرنیکی اسمیں قابلیت ہو۔
اور وہ بھی پڑے پڑے۔ مولانا اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں ؎

چوں سایہ بہ نخچیرم زنہاں حالتم ایں است　　　اما بر کاب تو دو دم طاقتم ایں است

حق تو یہ ہے کہ جو کلام معاملات عشقیہ کے روزمرہ واقعات سے خالی ہوں وہ کلام
نزد عشاق ان کچھ بھی مزیدار نہیں۔ کلام میں اگر ایک سوز اور خاصی دلچسپی پیدا کرنیوالی
چیز جس پر عام و خاص سب کی طبیعت جھکتی ہو وہ معاملات ہی ہے۔ مولانا گو ایک صوفی
منش ملا ہیں مگر اس صنف میں بھی خوب لکھتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جب ایک ناکام
عاشق کسی گوشہ میں دلگیر ہو کر بیٹھ جاتا ہے تو معشوق اس پر رحم کھاتا ہے اور آکر پوچھتا ہے
کہ کہیں کیا حال ہے۔ وہ بھرا بیٹھا ہوتا ہے۔ موقعہ پا کر دل کی لگی کھول کھول کر بیان
کرنے لگتا ہے۔ معشوق اسوقت جس انداز سے بگڑتا ہے وہ قابل دید۔ اور عاشق پھر کس
لہجہ میں کہتا ہے ؎

خونریز بیمار محبت حال پرسیدن چہ بود
درد دل چوں آشکارا کرد رنجیدن چہ بود

رنگینیت کیساتھ ساتھ معاملہ نویسی ذرا مشکل ہے مگر مولانا بوجہ غایت ذکاوت
کے ٹھیٹ معاملہ لکھنا ناپسند کرتے ہیں۔ ہو تو معاملہ لیکن اسمیں مضمون کی ملاحت بھی ہو تو
کیا کہنے ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

گفتم ازمن کہ مے ستاند جان　　　خنجر ناز برکشید کہ من
گفتا پاے مراکہ بوسہ دہد　　　طفل اشکم بسر دوید کہ من

پہلے شعر میں معشوقوں کی اس بے جگری کا اظہار کیا گیا ہے جو اکثر عاشق کی وفاداری
آزمانے کے لئے کر گذرتے ہیں۔ اور دوسرے شعر کا لطف بھی کچھ کم ملاحت آمیز نہیں

پہلے شعر کے معاملہ کو ایک دوسرے شعر میں کچھ زیادتی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ گویا یہ اس حرکت کے بعد کا فوٹو ہے ؎

عاشقی چون دست و تیغ اے بیوفا از من دریغ آستیں بر شانہ دامن بر کمر چسپیدن چہ بود

معاملہ کے متعلق اکثر اشعار آپ کو خاص دیوان کی طرف رجوع کرنے سے مل سکتے ہیں۔ زیادہ لکھنا اس موقعہ پر مناسب نہیں۔

لطف زبان بھی ہر ایک شاعر کے لئے بہت ضرور ہے۔ مولانا حسرت گو ہندی نژاد ہیں لیکن زبان خاص شیراز اصفہان کی سکھتے ہیں۔ کسی مقام پر خود لکھتے ہیں

گرچہ از ہندم ولے از پائے طبع گام در شیراز و شروان میزنم

زبان کا اندازہ محض مذکورہ بالا کلام سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس موقعہ پر چند غزلیں نقل کی جاتی ہیں جو اس صنف پر کافی روشنی ڈال سکتی ہیں۔

ہوس وصل دلارام چہ معنی دارد لاف عشق طلب کام چہ معنی دارد

مہر و قہر و غضب و لطف نہ دلداری کیست فرق در بوسہ و دشنام چہ معنی دارد

پختہ شو سوختہ شو ز آتش عشق جانسوز تا بدانی طمع خام چہ معنی دارد

بہ تیغش سر تسلیم بیا در دہ مفرد جانکن دعوے اسلام چہ معنی دارد

نیست در درسگہ عشق بجز خاموشی بحث یعنی چہ والزام چہ معنی دارد

حسرت از فرق قدم کن بہرش تا دانی
عاشق نیک سرانجام چہ معنی دارد

ناظرین فرق و سرانجام کی لفظی مناسبت سے ضرور محظوظ ہوں گے ایک مقام پر لکھتے ہیں

دم شمشیر چوں دندانہ گیرد خوں نمبرزد سر قلم اگر داری ازاں ابروگرہ واکن

چراغان کردہ ام از داغ در خلوتسرائے خود سر حسرت گردم بیا ایں خانہ را یکدم تماشا کن

خموشی مہر لب گرود مرا چوں از سخن آئی ازیں حیرت کہ بینم غنچہ در گفتار مے آید
غم جاں نیست گر از تلخگیہا ے مرا کشتی ولیکن حرف بر لعل سخن گوے تو می باید

میں حیران ہوں کن شعروں کو منتخب کروں اکثر زبان میں ہیں۔ جن حضرات کو شوق ہو اصلی دیوان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

تصوف کے متعلق میں لکھتا لیکن حمد و نعت میں اس کا وافی نمونہ گذر چکا اس لئے شاید اسکی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ مولانا عربی میں بھی اچھے اشعار لکھتے ہیں۔ ایک آپ کی غزل ہے جس کے چند شعر ہیں ؎

بلیت بامر و حسن ملیح فیا اسفا علی القلب الجریح
بسیف اللحظ یقتلنی و یحی باذن اللہ من قول فصیح
ففی عینیہ سحر اے سحر وفی شفتیہ اعجاز المسیح
و انکر حبہ و یقوم ومعی بعارضنی بتکذیب صریح
فان کان الہوے شیئاً قبیحا فلتم الحب اقبح من قبیح

من الرحمن للرحمٰن رحیم
کما قد جاء فی الخبر الصحیح

ملا غلام علی آزاد بلگرامی کے قصیدہ البہیہ الہائیہ کا جواب بھی لکھا ہے دو شعر یہ ہیں۔

قل لنا ما یعنیک العتیک کل لحظ یقلتنا یفتیک
ان قتل ائب عدوانا لضلال فربنا یہدیک

میں لفظی مناسبت کے متعلق بھی کچھ لکھتا۔ لیکن حمد و نعت میں وہ گذر چکا اور علاوہ اسکے یہ اشعار جو ابھی لکھونگا اس صنعت پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ مثلاً حمد کے قصیدہ کا شعر ہے ؎

ندارد شعر من قدر شعیرے گرچہ از پستی تو خواہی گر کنی شعر مرا بالاتر از شعرے

مولانا کی طبیعت میں ایک مدت تھی جس کی وجہ سے وہ بات بات پر شعر لکھتے تھے۔ آپکے پاس کسی نے ایک دن آم روانہ کئے مزیدار و خوش ذائقہ تھے بہت خوش ہوئے ایک نظم لکھکر محسن کا شکریہ ادا کیا۔ لکھتے ہیں:۔

ثمر خوش مزہ انبہ کہ نازل شدہ است　　انبت اللہ نباتا حسناً در شانش

گویا اس آیت کے معنی آپ نے یہ لئے کہ انبہ اللہ کا ایک نبات حسن ہے۔

انبیا در است شرف بر ہمہ افراد بشر　　انبہ را فضل بر اثمار یقیں میدانش

ہست یک نوع و درافراد تفاوت بسیار　　کرد مخلوق خدا بر صفت انسانش

دید از ہند ہمیں میوہ جواب کابل　　ہی و سرو و سیب و عنب بردنش

شلغم کی بھی تعریف کی ہے اور غضب یہ کیا ہے کہ سعدی کی مذمت کو مدح بنا دیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

طمع و سیم و زر نمیدارم　　کہ مرا بس بود دو لقمہ طعام
خاصہ شب دیگ کاں بہ نزد فقیر　　خوشتر است از ہمہ نمالک شام
راست گفت است سعدی شیراز　　شلغم پختہ بہ ز نقرہ خام
ذوق خاطر شلغم است مرا　　قلیہ اش میخورم برغبت تام

ہندوستان کے تمام شعراء باکمال سے مولوی صاحب جس وجہ سے ممتاز ہو جاتے ہیں وہ مشق تاریخ گوئی ہے۔ ایک جلد نہیں بلکہ دو جلدیں مطبوعہ محض تاریخ ہی تاریخ میں ہیں۔ اور اس صنعت کے ساتھ کہ تعجب ہوتا ہے کہ آخر کس قدر مادہ موجود تھا۔ کہ جس قدر رکھتے تھے کمی نہیں ہوتی تھی۔ امام الفلاسفہ و رئیس الادباء خاتم علماء ہند منتہائے سلسلہ علوم مشرقیہ حضرت علامہ مولانا فضل حق خیرآبادی قدس سرہ کی تاریخ لکھتے ہیں

قد توفی الالہ فضل الحق　　عالما جیدا بلاریب

ان لقاہ[۱] اولاہ من بلدہ بجفاء فلیس من عیب
قال تاریخہ لاورکہ فضل حق ہو اتف القیب

غرض کہ امیر و غریب عالم جاہل سب کی تاریخیں کہیں۔ حتیٰ کہ نانبائی تک کی تاریخ موجود ہے۔ اگر میں اس پر ریویو کروں تو دفتر طویل ہوتا ہے۔ اس لئے معائنہ پر ناظرین کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

تاریخ وفات معلوم نہیں کیونکہ اتبک کسی تذکرے میں آپکو کسی نے نہیں لیا ہے۔ اخیر میں میں ناظرین مخزن کو نہایت شوق آفریں توجہ کے ساتھ اوس پر متوجہ کرتا ہوں کہ وہ دیوان حسرت جس کا نام "قسطاس البلاغۃ" ہے ضرور ملاحظہ فرماویں میں نے جو لکھا ہے کچھ بھی نہیں ہے +

سید ضیاء المناظر احسن

---

[۱] مولانا قدس سرہ دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کی بدولت باغیان غدر میں متہم ہوئے۔ اور آپ کو انگریزوں نے جزیرہ انڈمن عبور دریائے شور کی سزا میں مبتلا کیا اور وہیں آپ داصل بحق ہوئے۔ ۱۲

مطالعۂ کتب

جو نسبت حافظ کو زندہ مخلوق سے ہے وہی نسبت کتابوں کو بنی نوع انسان سے ہے۔ یہ کتابیں ہی ہیں جن میں ہماری نسل کے کارنامے۔ حیرت انگیز تحقیقاتیں۔ ایام گذشتہ کے علم اور تجربوں کا ذخیرہ جمع رہتا ہے۔ یہ کتابیں ہی ہیں جو قدرتی دلفریبیوں کی دلکش تصاویر ہمارے سامنے کھینچ دیتی ہیں۔ کتابیں ہی مشکل اوقات پر ہماری مدد کرتی ہیں۔ فکر و رنج و الم کے زمانہ میں تسلی دیتی ہیں ہماری فرصت کے وقت کو سرمایہ مسرت بناتی ہیں۔ ہمارے دماغوں کو تصورات سے بھرتی ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں اعلیٰ اور خوشی بخشنے والے خیالات پیدا کرتی ہیں۔ یہ ہمیں پستی سے بلند کر دیتی ہیں۔

مشرق میں دو بھائیوں کی ایک کہانی مشہور ہے جنمیں سے ایک بادشاہ تھا اور ہر شب وہ خواب میں دیکھتا تھا کہ فقیر ہوں۔ اور دوسرا فقیر تھا۔ مگر ہر شب کو خواب میں سر پر تاج شاہی رکھے محلوں کی سیر کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ بادشاہ سے اُس کا فقیر بھائی زیادہ خوش رہتا ہوگا۔ کیونکہ تصور اصل سے زیادہ روشن اور صاف ہوتا ہے۔ خیر کچھ ہی ہو یہ مسلمہ امر ہے کہ مطالعۂ کتب میں مشغول ہو کر ہم نہ صرف حسب خواہش بادشاہ ہو سکتے ہیں۔ نہ صرف خیالی محلسراؤں میں گھوم سکتے ہیں۔ بلکہ وہ بات حاصل کر سکتے ہیں جو ان سے بھی اچھی اور کارآمد ہے۔ وہ یہ کہ پہاڑوں کی سیر کر سکتے ہیں۔ سمندر کے پانیوں سے حظ اُٹھا سکتے ہیں خوبصورت گلزاروں کے دلفریب نظاروں سے خوش ہو سکتے ہیں۔ اور بغیر تھکاوٹ اور بغیر خرچ کے۔

فیلڈ نے ایک نہایت نفیس نظم کے دوران میں لکھا ہے۔ "میرے واسطے وہ جگہ جہاں میری کتابیں ہیں ایک دربار ہے جس میں میں بادشاہ کی طرح شان و شوکت سے بیٹھا ہوں وہاں میں بوڑھے فلاسفروں اور دانائوں سے بات چیت کرتا ہوں۔ اور حسب مرضی بادشاہوں

بلکہ شہنشاہوں سے بھی گفتگو کر لیتا ہوں۔ اُنکی راؤں کو تولتا ہوں اَو ظلم اور بے انصافی سے حاصل کردہ فتوحات کی بابت چھپے چھپے راز بڑی سختی سے دریافت کرتا ہوں۔ میں اُن تصاویر کو جو ناقابل یاد بادشاہوں کی ہیں اپنے حافظہ سے اُتار دیتا ہوں۔ اندریں حالات کیا یہ ممکنات سے ہے کہ میں ایسی دوامی مسرتوں کو چھوڑ کر غیر متیقن اور ناپائدار نمائشوں سے ہم آغوش ہوں۔ ہرگز نہیں۔ آپ اپنی دولت میں اضافہ کریں۔ میں تو اپنا علم ہی وسیع کرونگا۔ کتابوں کو ہم صحبتوں سے تشبیہ دیگئی ہے۔ لیکن ہم صحبتوں میں سے جو نیک اور قابل قدر ہوتے ہیں اُن کو موت ہم سے جدا کر دیتی ہے۔ مگر کتابوں میں سے جو ردّی اور بھدّی ہوتی ہیں اُنھیں کو زمانہ کا تباہ اور فنا کر دینے والا ہاتھ برباد کر کے اعلےٰ کتب کو صاف بنا دیتا ہے۔

بلور لٹن نے کیا خوب فرمایا ہے کہ "دانشمند اور شعرا کتابوں کے بغیر خاک ہیں" کتابوں میں وہ فرشتوں کی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ ہمارے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ اور ہمکو مختلف واقعات کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں۔ کتابوں میں سے بعض کو ہم غیر فانی کہتے ہیں۔ اعتبار کرو کہ زمانہ کا ہاتھ اُن کو اور بھی صاف اور نرمل بنا دیتا ہے۔ کتابی دنیا میں شریر سے شریر اشخاص بھی خاموش پڑے رہتے ہیں۔ اور ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ خدائے دوجہاں کی مرضی یہی ہے کہ برائیوں کا وجود دنیا میں نہ ہے اس لئے کتابوں کے ناکارہ حصے اڑ جاتے ہیں اور پاک حصوں کو اس طرح چھوڑ جاتے ہیں جس طرح کالبد خاکی روشن روح کو چھوڑ دیتا ہے۔

بہت سے لوگ ایسے گذرے ہیں جنکو دنیا کی اعلیٰ ترین قیمتی چیزیں میسر تھیں مگر وہ سب سے بڑے زور کیساتھ کہتے ہیں بلکہ مطالعہ کتب نے ہمارے لئے خوشی کا دروازہ کھولا اور شادمانی کی بارش کی۔ اشیم نے لیڈی جین گرے سے اپنی آخری ملاقات کا حال کچھ اسطرح لکھا ہے کہ "میں نے دیکھا کہ وہ ایک کھڑکی میں [illegible] ہے۔ اور سقراط کی

موت کا حال مصنفہ افلاطون پڑھ رہی ہے۔ اُس کے والدین سامنے مرغزار میں شکار سے جی بہلا رہے تھے۔ اور کتوں کی آوازیں کھڑکی میں بخوبی سنائی دیتی تھیں۔ یہ دیکھکر مجھے تعجب ہوا مگر اس نے کہا کہ انکی تمام مسرتیں جو انھیں شکار کھیلنے سے ہو رہی ہیں میری مطالعہ کتب کی خوشی کے آگے بے حقیقت ہیں۔"

مکالے نے اپنی سوانحعمری میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "مجھے اپنی حیات میں جو نہایت مسرت بخش وقت نصیب ہوا ہے وہ مطالعہ کتب کے طفیل ہے۔" وہ اپنی لڑکی کے نام دوران خط میں لکھتا ہے "مجھے اس سے زیادہ خوشی کبھی حاصل نہیں ہوتی جتنی اپنی پیاری بیٹی کو خوش کر کے ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے اسوقت حاصل ہوتی ہے جب میں یہ سنتا ہوں کہ میری دختر کو کتابوں کا شوق ہے۔ کیونکہ جب وہ میرے سن کو پہنچیگی۔ تو اسے پتہ لگیگا کہ ہر قسم کے کھیل تماشوں اور تمام قسم کی مٹھائیوں سے کتابیں زیادہ دلچسپ اور زیادہ میٹھی ہیں۔ اگر مجھے شہنشاہ بنا دیا جائے میری رہائش کے لئے نفیس مکانات ہوں۔ میری سیر کے لئے عالیشان گلزار ہوں۔ کھانے کے لئے طرح طرح کے ذائقہ دار غذائیں اور خدمتگاری کیلئے دست بستہ نوکر ہوں۔ اور ساتھ ہی شرط ہو۔ کہ جبر وار کتاب کو نہیں پڑھنا تو میں ایسی بادشاہت پر لات مار کر ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے کی مفلسانہ زندگی کو اس پر ترجیح دونگا۔ جہاں میرے مطالعہ کیلئے کتابیں افراط سے مل سکیں۔"

واقعی کتابیں ہمارے لئے طلسم خیال کا عالیشان محل تعمیر کر دیتی ہیں۔ جین پال وشیر کا مقولہ ہے کہ جو دلفریب اور شاندار منظر تخت شاہی سے بھی نظر نہیں آتا۔ وہ اپالو (علم کے دیوتا) کے پہاڑ پر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ جارج میکڈانلڈ نے کیا خوب کہا ہے کہ مجھے تصاویر دیکھنے کے شیشے جادو معلوم ہوتے ہیں میرے خیال میں سب سے نفیس وہ کیمرہ ہے جس کی تصویر کسی شاعر نے اپنی جادو بیان قلم سے کھینچی ہو۔

بعض ایسے آدمی بھی ہیں جو مطالعہ کرنا خلاف قانون قدرت خیال کرتے ہیں۔

انھیں میں سے ایک لارڈ ڈانگلٹن ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ مطالعہ کرنا دوسرے علماء کی دماغی محنت کا فائدہ اُٹھانا ہے۔ اس لیے ہمیں مطالعہ نہیں کرنا چاہیئے۔ آگے چلکر آپ کہتے ہیں کہ مبارک ہے وہ انسان جو بغیر مطالعہ کے جو کچھ پیدا کرتا ہے اپنے دماغ سے پیدا کرتا ہے۔ مگر کتنے آدمی ابتدائے آفرینش سے ابتک ایسے ہوئے ہیں۔ جو لارڈ صاحب موصوف کے ہاتھوں سی برکت حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر کوئی خاص کتاب ہمیں دلچسپ معلوم نہیں ہوتی۔ تو یہ ہمارا اپنا قصور ہے پڑھنا بھی ایک قسم کا ہنر ہے۔ بغیر سوچے پڑھتے جانا بالکل بے سود ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ جو کچھ پڑھیں ہماری نگاہوں کے آگے پھر جائے۔ قریباً ہر شخص سمجھتا ہے کہ میں لکھنا اور پڑھنا جانتا ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک فیصدی بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ اوراق کتب کو اُلٹتے جانا اور سطروں پر نظر دوڑاتے جانا پڑھنا نہیں کہلاتا یہ تو ایک بچہ بھی کر سکتا ہے۔ بلکہ پڑھنے کا یہ مطلب ہے کہ جس نظارے کا ذکر کتاب میں ہو وہی آپ کے سامنے ہو۔ اور جیسے کیرکٹر کا بیان آپ پڑھ رہے ہوں۔ وہی کیرکٹر آپ کی نظر خیال مجسم دیکھ لے۔ "آپ کتاب کب اور کس جگہ پڑھتے ہیں" اس سوال پر بھی بہت کچھ منحصر ہے۔ جب کھانا میز پر ہو اور آپ اپنے مہمان کا انتظار کر رہے ہوں اور صرف پانچ منٹ کا وقفہ ہو۔ ایسے تنگ وقت میں شکسپیر یا ملٹن کو کھول بیٹھنا ازحد مضحکہ خیز امر ہے۔ بازاروں سے گذرتے گذرتے بائبل شریف کا مطالعہ کرنا اگر وقت کو ضائع کرنا نہیں تو کیا ہے۔

الیشیم کا قول آب زر سے لکھنے کے قابل ہے وہ کہتا ہے کہ مطالعہ ایک برس میں اتنا سکھا دیتا ہے جتنا تجربہ بیس سال میں بھی نہیں سکھا سکتا۔ علاوہ ازیں مطالعہ جو جو باتیں ہمیں سکھاتا ہے انمیں تکلیفیں سہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ برخلاف اس کے تجربہ سکھاتا تھوڑا ہے مگر تکلیفیں بہت دیتا ہے۔ دانشمندی بذریعہ تجربات حاصل کریں بڑے بڑے

خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیا یہ عجب ہے وہ کپتان جو جہازوں کی تباہیوں ہی کا تجربہ اٹھا اٹھا کر عقلمند بنا ہے۔ وہ سوداگر کس قدر مظلوم ہے جو نقصان عظیم برداشت کر کے تجربہ کار مشہور ہوا ہے۔ اسکے ساتھ ہی یہ بات بھی نوٹ کرنیکے قابل ہے کہ تجربہ کرنے میں صرف بہت کچھ ہوتا ہے۔ جو شخص تجربات سے دانشمند بنا ہے وہ یقیناً ظریف ہو گا۔ لیکن اسکی حالت تو ہو بہو اس تیز دوڑنیوالے سے مشابہ ہے جو اپنی دھن میں اصل رستے سے گمراہ ہو جاتا ہے۔ اور سیاہی شب میں اسے پتہ تک نہیں لگتا کہ مجھے کدھر جانا ہے۔ اور کدھر جا رہا ہوں۔ زمانہ قدیم میں ایسے شخص ہو گذرے ہیں جنھوں نے ایک مدت کے تجربوں سے عقل حاصل کی تھی۔ ان کے حالات زندگی صاف بتلاتے ہیں کہ انھوں نے بھاری بھاری نقصان اٹھائے۔ بڑے بڑے خطروں میں پڑے اور بعض اوقات انکی جان کے لالے پڑ گئے۔ ایسے بہادر دلاوروں میں سے بمشکل تمام پانچ فیصدی زندہ بچکر بامراد کامگار گھر کو واپس آئے۔

دوستوں کا انتخاب ایک مشکل امر ہے۔ مگر کتابوں کا انتخاب اس سے بھی مشکل ہے جس طرح ہم اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں اسی طرح جو کچھ پڑھتے ہیں اس کے بھی جوابدہ ہونگے۔ ملٹن کا یہ مقولہ کیسی خوبصورتی سے اصلیت کا اظہار کر رہا ہے۔ کہ "ایک نفیس کتاب اپنے مصنف کا بیش قیمت خون جگر ہے۔ جس کو اس نے اس لئے جمع کیا ہے کہ اس کی وفات کے بعد لوگوں کے کام آئے"

تعلیم نسواں کے باب میں رسکن صاحب لکھتے ہیں۔ کہ ہم کو واجب ہے کہ لڑکیوں کے ہاتھ میں کتاب دینے سے بیشتر اس بات کی کماحقہٗ تسلی کر لیں۔ کہ آیا یہ کتاب عمدہ اور پاک لٹریچر کا نفیس حصہ ہے؟ اور کہ ان میں فضول اور نکمے مضامین کی بھرتی نہیں کی گئی"

(ترجمہ)

بدری ناتھ شرما شدرشن

اپنی زبان میں علوم اور فنون

دربار تک ہم پہنچ ہی کے رہتے
جو اپنے ارادہ میں تصمیم ہوتی

یہ ایک بڑا پیچیدہ اور اہم سوال ہے کہ آیا کوئی قوم اور کوئی ملک غیر زبان میں مختلف علوم و فنون حاصل کر سکتا ہے؟ یا اپنی زبان ہی میں؟

اس سوال کے حل یا جواب کیواسطے ضروری ہے کہ جواب دینے والے ان ممالک اور ان اقوام کا جائزہ لیں جو گذشتہ زمانوں میں یا اس زمانہ میں ہر ایک طرح سے ترقی یافتہ اور مہذب شمار ہوتی ہیں۔ دیکھیں کہ انکی ترقی اور عروج علمی کا ذریعہ اپنی زبان ہی یا کوئی غیر زبان۔

تاریخ کشادہ دلی سے ہمیں یقین کراتی ہے کہ کسی ملک اور قوم نے زبان غیر میں ترقی نہیں پائی ہے البتہ غیر زبانیں حاصل کر کے اپنی زبانوں میں مفید علوم اور مفید فنون کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔ یورپین اقوام گذشتہ میں روما والے۔ یونانی۔ حال میں فرانس جرمن بلجیم۔ انگلستان۔ جاپان کے ممالک اور اقوام اسپر شاہد ہیں کہ انکی ہر ایک قسم کی ترقی اور عروج اپنی ہی زبانوں کے ذریعہ سے نشو ونما پا رہا ہے۔ گو ان اقوام اور ان اقوام کے مشاہیر نے مدتوں کی کوشش اور تگ و دو کے بعد غیر ممالک غیر اقوام اور غیر السنہ سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن انکی ذاتی ترقی اور عروج کا موجب خود ان کی اپنی زبانیں ہی ہیں۔ فرانس۔ جرمن انگلستان اور جاپان میں جاکر دیکھو کہ کتنے لوگ ایسے ہیں۔ جو دوسری زبانیں جانتے ہیں بہت کم تعداد نکلیگی۔ اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی دیکھو کہ انکی اپنی زبانوں میں کس قدر ذخیرہ غیر زبانوں کا جمع کیا گیا ہے اور کس کس محنت اور دماغ ریزی سے دوسری قوموں اور دوسرے ممالک کی اچھی باتیں لائی گئی ہیں۔ اگرچہ کیسی ہی لگاتار کوشش کیجائے پھر بھی اپنی زبان ہی مقابلہ میں آتی ہے۔
انگلستان پر جن جن بیرونی قوتوں نے سالوں قبضہ رکھا تھا انگلستان نے انکی زبان کے ذریعہ سے

اخیر تک ترقی نہ کی۔ اگرچہ ان سے بہت کچھ لیا۔ لیکن زبان اپنی ہی بارآور ہوئی۔ یونانی فتح کرتے کرتے صدہا کوس نکل گئے دوسری زبانوں اور دوسری قوموں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ لیکن زبان نہ بدلی نہ بدل سکی فرانس اور جرمنی کا بھی یہی حال رہا۔ مسلمانوں نے سالوں اسپین پر قبضہ رکھا اور اپنی زبان عربی کے ذریعہ سے بہت کچھ کر دکھایا۔ لیکن اس پر بھی عربی کے پاؤں اسپین میں نہ جم سکے۔ مڑ کر اسپین والوں نے اپنی ہی زبان کا رخ کیا۔ اور اسکے ذریعہ سے علمی بنیادیں ڈالنا موزوں خیال کیا۔ عربوں نے اپنے زمانہ میں جو کچھ ترقی پائی اور عروج حاصل کیا وہ باوجود اسکے کہ عرب مختلف ملکوں میں جا نکلے اور مختلف اقوام سے انھیں سابقہ پڑا لیکن ترقی اپنی زبان میں ہی کی۔ ایران کو عربوں نے فتح کیا۔ اور مسلمان بھی بنا دیا لیکن انکی زبان کے قدم نہ اکھاڑ سکے۔ سوائے اس کے کہ عربی کا لٹریچر اسمیں رفتہ رفتہ رنگ پیدا کرتا گیا۔ مسلمانوں نے ہندوستان فتح کیا اور صدہا سال اس میں جمے رہے حکومت رہی اقبال رہا دولت رہی استقلال رہا لیکن باایں ہمہ نہ تو فارسی جم سکی اور نہ مستقل طور پر عربی کے پاؤں لگ سکے۔ گو دونوں کے ذخائر میں سے بہت کچھ ہندوستان میں منتقل ہوا۔ لیکن نہ عربی نے زبان کی حیثیت سے میدان سر کیا اور نہ فارسی سر کر سکی چونکہ مختلف قوموں کا رفتہ رفتہ ہندوستان کی دھرتی میں ہجوم ہوتا گیا اس واسطے قدرت نے بجائے اسکے کہ عربی اور فارسی کا خیر مقدم کرلے ہندوستان کی مختلف زبانوں کو بھی قایم رکھا اور سب کی ساجھی اردو نکالدی اردو بھی نہ نکلتی اگر سنسکرت یا بھاشا ہندوستان بھر میں مردہ نہ ہوتی۔ چونکہ سنسکرت مردہ ہوچکی تھی اور بھاشا بوسیدہ اسواسطے مشترکہ مساعی کی بدولت عربی۔ فارسی۔ سنسکرت اور بھاشا سے مل ملاکر ایک اور زبان اردو نامی کی داغ بیل ڈالدیگئی۔ جب حالت یہ ہے تو کیا یقین کیا جاسکتا ہے کہ انگریزی زبان ہندوستان کی مختلف زبانوں خصوص اردو کو باہر نکالکر ایک ملکی اور قومی زبان کی حیثیت سے اپنا اڈا جمانے پر قادر ہوسکیگی۔ یہ خیال ہی خیال ہے اگرچہ صدہا برس تک بھی انگریزی زبان بذریعہ حکومت کے ہندوستان میں حکمراں رہے پر یہ توقع نہیں کیجا سکتی ہے۔ مانا کہ دن بدن اسکو ترقی ہے لیکن قانون قدرت اور پرانی نظیریں اسکے خلاف ہیں۔ ان حالات میں کیا یہ ضرورت نہیں ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنی ترقی اپنے عروج اور علوم و فنون کا مستقبل

دیکھیں اور زیر بحث لا کر غور کریں کہ "کیا وہ اپنی زبان یا اپنی زبانوں کے ذریعہ سے ترقی کر سکتے ہیں؟ یا کسی غیر زبان کے ذریعہ سے؟" بیشک اس سوال کے ضمن میں یہ تحلیف وہ سوال اُٹھیگا کہ ہندوستان کی اصلی زبان یا اصلی زبانیں کونسی ہیں اور اسی ضمن میں اردو زبان کی مخالفت اور موافقت کا سوال بھی زیر بحث آئیگا۔

یہ سب کچھ ہی اور ہوگا لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان سوالات پر غور کیا جائے کہ ملک ہندوستانی قومیں یا افراد اقوام اور زبانیں اگرچہ متنازعہ فیہ ہوں یا بہت سی اور مختلف ہیں لیکن یہ بات مسلمہ اور مشترکہ ہے ہندوستان ایک ہے اور انکو وسائل ترقی بھی ایک ہی نوعیت رکھتی ہیں اور ایک ہی قسم کی کوشش سے ہندوستان کی قسمت بدلیگی۔ سب سے اول یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ کیا ہم غیر زبان یا غیر زبانوں کے ذریعہ سے ہر ایک قسم کی ترقی کر سکتے ہیں؟ اگر یہی بات قرار پائے تو پھر کسی ایسی غیر زبان کے مکمل حاصل کرنیکی کوشش عمل میں لائی جائے اور اس صورت میں اپنی زبانوں کی ترقی اور عروج کا سوال چھوڑ دیا جائے کیونکہ جب وہ زبانیں ہمیں کام ہی نہیں دیسکتیں یا انھیں اس قابل نہیں سمجھا گیا اور نہ ان میں یہ صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے تو پھر ان کے تعاقب کا کیا فائدہ ہے البتہ انکو بطور مشرقی زبانوں کے یا بطور یادگار رکھا جاسکتا ہے۔ جیسے کہ زبان عبرانی وغیرہ کا حشر ہوا ہے انکا بھی ہو کر رہیگا اس طریق عمل سے فائدہ یہ ہوگا کہ آئندہ نسلیں مستقل طور پر کسی غیر زبان کے حاصل کرنیکی طرف رفتہ رفتہ متوجہ ہوتی جائینگی یہانتک کہ عوام بھی مستقل طور پر متاثر ہونگے۔ اور کل ملک اور کل اقوام کے افراد اس زبان میں گفتگو بھی کرینگے گو بظاہر ایسا ہونا مشکل ہے اور تاریخ ایسی کوئی نظیر نہیں بتاتی لیکن شاید ہندوستانیوں کی کوشش یہ خصوصیت پیدا کر سکے۔ اور سہرا ان کے سر بندھے۔ اور اگر ایسا ہونا مشکل ہے (جو در حقیقت مشکل ہے) تو پھر دوسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ "ہندوستان کی زبانوں میں سے کوئی ایک زبان۔ زبان عام قرار دیجائے" یا "ہندوستان کی چند زبانیں اس مہم کیواسطے خاص کر لیجائیں"

یہ دونوں سوالات بھی اہم اور متنازعہ فیہ ہیں لیکن سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ یہ زیر بحث

لائے جائیں اور جس طرح پر ہو سکے کوئی ایک راہ نکالی جائے سوال یہ نہیں کہ اردو کو کل ہندوستان کی زبان عامہ قرار دیا جائے۔ بھاشا سہی۔ گجراتی سہی بنگالی سہی۔ دکنی سہی۔ سندھی سہی۔ ملتانی سہی پنجابی سہی پشتو سہی۔ فارسی سہی سنسکرت سہی عربی سہی۔ انگریزی سہی سکو ایک مسلمہ یا ملک کی زبان مان لیا جائے۔ یا انہیں سے چند زبانیں اس مطلب کیلئے خاص کر دیجائیں۔ مثلاً ملتانی اپنی زبان میں سندھی اپنی زبان میں پنجابی اپنی زبان میں اردو والے اپنی زبان میں علوم اور فنون کا تہیہ کریں اور رفتہ رفتہ ان زبانوں میں یورپ کے علوم اور فنون کا ترجمہ ہوتا رہے۔ اور آیندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کا بہت سا ذریعہ اپنی ہی زبان یا اپنی ہی مختصہ زبانیں ہوں۔ غیر زبان یا غیر زبانیں بطور ایک خارجی زبانوں کے شامل نصاب ہوں۔ زور اپنی زبانوں پر دیا جائے اپنی ہی زبان یا زبانوں کے ذریعہ سے ہر ایک قسم کی علمی اور ذہنی فتح حاصل کیجائے۔ نہ صرف تراجم ہی سے کام لیا جائے۔ بلکہ اپنی زبان یا زبانوں ہی میں مختلف خیالات نشو و نما پائیں۔ اور ہر قسم کے لٹریری اور انشائی مخترعات اور اقتصادی وسائل سے زبان کو مالا مال کر دیا جائے۔ جن علمی زبانوں نے ترقی پائی اور قابل رشک عروج حاصل کیا ہے انکا شروع بھی بہت سی مساعی اور ہمم کا محتاج تھا۔ انگریزی زبان جو اس وقت بلحاظ اپنے گوناگوں ذخائر اور نادر معلومات کے عروس السنہ بنی بیٹھی ہے شروع میں ایک مفلس زبان تھی۔ تھوڑی سی پونجی سے اس نے رفتہ رفتہ ترقی پائی ہے۔ اگرچہ اب تک بمقابلہ بعض زبانوں مثل عربی اور سنسکرت کے وہ ایک حد تک ناکمل ہے لیکن پھر بھی اس وقت تک اسے جو قدرت نے جوبن بخشا ہے وہ اکثر پورانی زبانوں کے مقابلہ میں بہت کچھ مقدار اور فضیلت رکھتا ہے اسپر قوم کو ناز اور ملک کو فخر ہے علمی ذخائر کے اکٹھا کرنے میں اس قوم کے افراد نے جو شوق اور جو محنت دکھائی ہے وہ دوسری قوموں کیواسطے ایک رہنما ہے اس نقش قدم پر ہندوستان کی مختلف زبانوں میں جدید اصطلاحات کی بنیاد ڈالی جائے۔ جدید معلومات کا ذخیرہ زیر قبضہ لایا جائے اگرچہ اس صورت میں بھی مشکلات کا سامنا ہوگا لیکن اس کوشش سے یہ تو ثابت ہو جائیگا کہ اس کے سوائے ہمیں کسی اور راہ کی تلاش میں مصروف ہونا چاہئے یا نہیں؟ ہندوستان میں یہ سوال بلحاظ اختلاف

مذاہب اخلاق رسم اختلاف خیالات بہت کچھ پیچیدگی اور اہمیت رکھتا ہے۔ اور بظاہر امید نہیں کیجاسکتی ہے
کہ جلد سے اسکا فیصلہ ہوسکے اسیواسطے بعض مدبروں اور دوربینوں کی یہ رائے بھی ہے کہ ان سب جھگڑوں کو
چھوڑ چھاڑ سب لوگ اور سب قومیں ایک تیسری غیر زبان انگریزی اختیار کرلیں اور اسکو اپنا ملجا وماوا سمجھیں اور
اسی کو کام لیں بصورت ہیں یہ باہمی تو تو میں میں بھی مٹجائیگی اور علمی گاڑی بھی چل پڑیگی اگرچہ بمصداق ع

دل کے خوش کرنیکو غالب یہ خیال اچھا ہے

لیکن اسکا بھی تو کوئی مجموعی فیصلہ ہونا چاہئے۔ تاریخ آیندہ چلکر اسے یوں پیش کیا کریگی کہ باہمی منافقت یا باہمی
ناچاقی اور لڑائی کا نتیجہ ہوا کہ اپنا اثاثہ اور اپنا سرمایہ برباد دیگر ملاکر گنواکر گھر پھونک تماشا دیکھا اور اپنی پگڑی
پھاڑکر غیروں کی پگڑی یا ٹوپی زیب سر کی ؎

ہوگیا تا شرق ز غرب اپنا زمانہ میں فروغ　　صورت خورشید جب دستار سر سے دور کی

ان فروعی امور میں ہندوستانی لوگ یا ہندوستان کے ریفارمر بہت کچھ اوپر نیچے ہورہے ہیں۔ جو انکی
ترقی کا مستقل ذریعہ نہیں ہیں۔ اس ضروری امر کی بابت اگرچہ کبھی کبھی جھڑپ ہوجاتی ہے لیکن جم کر فیصلہ
نہیں ہوتا اردو والوں کو بہت کچھ اردو کی حمایت کا دعویٰ ہے لیکن آجتک علمی رنگ میں بنگالی زبان کے
مقابلہ میں بھی کچھ نہ ہوسکا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کس قدر لازمی کتابیں اور مضامین اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں
انجمن ترقی اردو حیدرآباد کا خدا بھلا کرے کہ آخر اس نے کچھ کام شروع کیا ہے لیکن جبتک اسکی
اعانت نہوگی اور جبتک کچھ کرنیوالے اسطرف متوجہ نہیں ہونگے ہو کیا سکتا ہے۔ اصطلاحات کا کام تھوڑا نہیں ہے اسکی واسطے
بھی ایک عرصہ چاہئے اس زمانہ میں جیسی ہر چہار طرف علوم وفنون کی قدر ومنزلت اور مانگ ہے ایسی ہی زرہے
طلبی سخن وریں آ بھی مائل ہے ہر کام دولت اور روپیہ کا محتاج ہے اصطلاحات کے متعلق بھی سوچنا ہے کہ انکی بنا
کسطرح پڑے جدید وضع ہوں یا دوسری زبانوں سے لیجائیں اور یہ بھی کہ زبان اردو میں ایسا مصالحہ بجائے
خود کہانتک موجود ہے اور اس مصالحہ سے کہانتک کام لیا جاسکتا ہے یہ وہ باتیں ہیں جو لازمی اور ضروری ہیں
اور جنکا ایفا اور تصفیہ قوم اور قوم کے افراد باہمت کے ذمہ ہے۔ قریباً ایک صدی ملک اور قوموں کی کایا پلٹ کو نہ گذر ہی ہوگی
اور اس عرصہ میں بہت کچھ بحثیں یا کج بحثیاں بھی ہولیں۔ لیکن کوئی کل زبان کے بارہ میں سیدھی نہ بیٹھی اور نہ ابتک منطقی

سرمدؒ

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند　　سوز دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار　　ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

مولائے سرمد کے حالات قلم بند کرنیکے لئے بہت بڑے میدان کی ضرورت ہے۔ اور مجھے بہت مختصر الفاظ میں صرف اس تصویر کا مافی الضمیر پیش کرنا ہے۔

مولائے سرمد عالمگیر کے زمانہ سے قبل کے بزرگ ہیں اور عالمگیر کے زمانہ میں عالمگیر کے ہی ہاتھوں سے ان کو دنیا چھوڑنیکا موقعہ ملا ہے۔ علماء عالمگیری کے زمانہ میں چاہے کوئی شخص سرمدؒ کا مخالف کیوں نہ ہو مگر آج صفحۂ دنیا میں کیا عالم کیا عارف کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جس کو سرمدؒ سے عقیدت نہ ہو۔

سرمدؒ کو شاہجہاں کے دوران حکومت میں داراشکوہ سے بہت زیادہ محبت تھی اور وہ داراشکوہ کے مقابلہ میں دوسرے شہزادوں سے مانوس نہ تھے۔ دہلی کے سرکردہ پر سرمدؒ کے اوصاف باطنیہ کا اثر پڑتا تھا۔ اور یہ گمان قوی تھا کہ شاہجہاں کے بعد داراشکوہ بادشاہ ہوں گے۔ عالمگیر کو یہ بات ہمیشہ کھٹکتی رہی کہ سرمد کا اُنس دارا کے ساتھ کیوں بڑھتا جاتا ہے۔ اور سرمد کو بات بات پر چھیڑنا عالمگیر کا عام شعار ہوگیا تھا۔ چونکہ سرمدؒ بھی قادر الکلام تھے عالمگیر کو ایسا ٹکا سا جواب دیدیتے تھے کہ اس کو سکوت کے سوا اور کوئی موقعہ جواب الجواب کا نہ ملتا تھا۔ عالمگیر کی مصلحت حکومت نے شاہجہان کے مرنیکے بعد سرمد کو اپنی سیاست کی طرف بہت مائل کیا۔ مگر بھلا مردان صفا کہیں بھبکیوں سے ڈرا کرتے ہیں سرمد نے ایک پرکاہ کی برابر بھی عالمگیر کے مصلحات کی طرف توجہ نہیں کی۔

اسمیں شک نہیں کہ عالمگیر کا پہلا ربط سخن ایسا تھا کہ اگر سرمد معمولی تقلید میں عالمگیر کے ہمخیال ہوجاتے تو وہ اس تک نوبت نہ پہنچتی۔ مگر سرمد نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ جس قدر عالمگیر کے خیالات میں وہم کا جنون بڑہتا گیا اُتنا ہی سرمد کی ضد میں ترقی ہوتی گئی۔ عالمگیر نے سرمد کی خفقان کا انتظام کیا۔ سرمد نے عالمگیر کے مصالح سیاسی میں دخل اندازی شروع کردی۔ اور عام طور پر پبلک کو یہ جتا دیا کہ عالمگیر جو کچھ کرتا ہے وہ صرف پردہ شریعت کی صورت میں نفس پرستی کا شیوہ ہوتا ہے۔

مصلحت سیاسی نے عالمگیر کے ارادوں کا دوسری طرف رخ کردیا۔ اور اس کو محکم گمان ہوگیا کہ جب تک سرمد دنیا سے نہ مٹا دئے جائیں میری اکثر تدبیروں کا خون ہوتا رہے گا۔ کوئی انتظام ایسا نہ تھا کہ سرمد کی ہستی بھی مٹ جائے اور عالمگیر کے اخلاق ظاہری پر کلنک کا ٹیکہ نہ لگے۔

آخر اس نے اپنی اس قدیم بساط شریعت کو بچھایا۔ جس کے مہروں سے وہ ہمیشہ مات دینے کا عادی تھا۔ سرمد توحید کے مسئلہ میں ایسے غرق تھے کہ ان کو سیاست قالی سے گوشہ گیری کرنا تصوف کے کسی خانہ میں سوجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ آخر نتیجہ بھی یہ ہی ہوا کہ عالمگیر نے تصدیق نبوت کا داؤ سرمد کے سامنے رکھا اور وہ اس کی برداشت نہ لاسکے۔

لوگوں نے سمجھایا بھی کہ حضور تھوڑی دیر کیلئے حقیقی منازل سے تنزل اختیار کرلیں ایک دو ساعت کو مجاز کے غار میں ہی وقف سہی۔ مگر جواب میں صرف ایک شعر پڑھا۔ اور اپنا سر حکومت شخصی کے سامنے مالک کے سپرد کردیا ؂

عمر بست کہ ہنگامہ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

ایڈیٹر

دو رنگئ عالم

ہمیشہ گلشن عالم کا ایک حال نہیں   یہ وہ چمن ہے کہ جس میں کوئی نہال نہیں
ہے کون سبزۂ روش جو کہ پائمال نہیں   وہ کون ہے جسے دنیا میں کچھ ملال نہیں

ہمیشہ رنگ زمانہ یونہیں بدلتا ہے
کہیں برات جنازہ کہیں نکلتا ہے

غرض دورنگیٔ عالم کا ہے عجب عالم   سحر کو خندۂ شادی ہے شام کو ماتم
کہیں تو عیش و طرب ہے کہیں ہے رنج و غم   ہے کوئی چین سے دمساز اور کوئی بیدم

کہیں تو عاشق و معشوق ساتھ سوتے ہیں
اور اک جگہ کسی میت پہ بین ہوتے ہیں

خوشی خوشی کوئی حجلہ میں بن رہی ہے دلھن   کوئی ہے لاش پہ شوہر کی اپنے نعرہ زن
کسی کے جامۂ نو ہو رہا ہے زیب تن   کہیں کسی کے لئے قطع ہو رہا ہے کفن

کسی کو بیاہ سے اپنے فراغ ہوتا ہے
کسی غریب کا گھر بے چراغ ہوتا ہے

کسی کو عیش کے سامان سب بہم یکسر   پڑا کراہتا ہے کوئی اپنے بستر پر
کوئی ہے شاد کوئی پیٹتا ہے اپنا سر   پرائے دیس میں ویراں کسی کا ہوتا ہے گھر

کہیں ہے بیاہ رچا جمع سب خدائی ہے
کسی کے گھر غضب و قہر کبریائی ہے

کہیں ہے عیش و نشاط و سرور کا ساماں   کہیں ہے نزع کا ہنگام اور بند زباں
کہیں تولد فرزند سے کوئی خنداں   جواں پسر کے لئے کوئی رو رہی ہے ماں

کسی کے حال پہ لطف کریم ہوتا ہے
مگر کہیں کوئی بچہ یتیم ہوتا ہے

کسی کو بخشی ہے خالق نے مسند زرتار ہر ایک طرح کے سامان عیش ہیں تیار
ہے ایک بستر غم پر پڑا ہوا بیمار دوا تلک نہیں ملتی اُسے کہ ہے نادار
غذا نہیں ہے میسر تو غم وہ کھاتا ہے
کوئی نہیں ہے عیادت کو غرض آتا ہے

کسی کے پاس ہے دنیا میں دولت بیحد کوئی ہے نیک زمانے میں اور کوئی بد
مکاں بنانے میں کرتا ہے کوئی جد و کد کسی کے واسطے تیار ہو رہی ہے لحد
کہیں خوشی ہے کسی ماں کی گود بھرتی ہے
کہیں اجڑتی ہے مانگ اور نتھ اترتی ہے

ہر ایک سمت دو رنگی جہان میں ہے عیاں کبھی بہار ہے گلشن میں گاہ دخل خزاں
کبھی ہیں پھولوں کے انبار اور کبھی ویراں شجر ہیں سبز کبھی گاہ زرد گہہ عریاں
کبھی بہار میں سب جانور چہکتے ہیں
ہوائے تند سے پتے کبھی کھڑکتے ہیں

بہار آئی چمن میں ہوا عجیب سماں ہنسی گلوں میں ہے اور بلبلوں میں شور فغاں
چمن میں اڑنے لگی خاک جبکہ آئی خزاں یہ حال دیکھ کے شبنم بھی ہوتی ہے گریاں
نہیں ہے نام کو بھی اب نشان سنبل کا
مقام بوم ہے جو آشیاں تھا بلبل کا

پڑے ہیں اُلٹے گلوں کے ایاغ ایک طرف کہیں درختوں پہ ہے شور زاغ ایک طرف
جو فرش سبز تھا ہیں اس میں داغ ایک طرف نوچے کھچے ہیں جوانان باغ ایک طرف
نہیں صفا کہیں یہ حال آب جو کا ہے
جہاں بہار تھی اب وہ مقام ہو کا ہے

چلی کچھ ایسی ہوا جو اُجڑ گیا گلشن!! لٹا ہوا ہے جوانان باغ کا جوبن!!
پڑے ہیں سوکھے ہوئے پھول کچھ میان چمن انھیں کے سوگ میں ہے عندلیب نغمہ زن
ہیں نہ آنکھوں سے کیوں اشک حال بلبل پر
پروں کو کھول کے بیٹھی ہے مشہد گل پر

عجیب طرح کی ہے خزاں نے بیدردی کہ شکل باغ کی ظالم نے کیا سے کیا کر دی
نسیم چلتی ہے اور نہ سحر کی ہے سردی ہر ایک سو چمنستاں پہ چھا گئی زردی
چمن میں سوکھ گئے ہیں درخت پھولوں کے
مگر بہار پہ ہیں سب شجر ببولوں کے

بگولے اٹھتے ہیں ہر سمت اڑ رہا ہے غبار ہیں جابجا خس و خاشاک کے لگے انبار
لباس چھن گئے عریاں کھڑے ہیں سب اشجار مگر جو خشک ہیں بیلیں وہ ہیں گلے کا ہار
نہ شور کیک نہ پائے صبا کی آہٹ ہے
مگر کبھی کبھی پتوں کی کھڑکھڑاہٹ ہے

نہ باقی نام کو سبزی رہی نہالوں میں عوض میں پانی کے مٹی بھری ہے تھالوں میں
ہیں خشک نہریں تری تک نہیں ہے نالوں میں جو تازگی ہے تو بلبل کے دل کے چھالوں میں
ہیں سوکھے ہول جو بل بل کے ان سے رو تی ہے
بس آج باغ سے بلبل وداع ہوتی ہے

یادِ ہند

ہندوستان! سچ ہے تو جنت نشان ہے کچھ کم نہیں ارم سے تری آن بان ہے
قدرت نے دلربائی کی دی تجھ کو شان ہے آرائش جہاں میں بڑی تجھ سے جان ہے
تو مطلع جہان کا تابندہ نجم ہے
پروین سے کم نہیں ترے گلشن کی بزم ہے

منظر وہ دلفریب وہ دلکش سماں ترا پربت ہمالیہ کا وہ رفعت نشاں ترا
دامن سدا بہار ہے رشکِ جناں ترا سرسبز وادیاں وہ چمن گلفشاں ترا

تیری ہوا صبا کی طرح عطر بار ہے
اٹلی کا حسن تیری فضا پر نثار ہے

تیری زمین نافۂ مشکِ تتار ہے تو وہ چمن ہے جس میں ہمیشہ بہار ہے
نیچر ترے جمال کی آئینہ دار ہے جوبن میں تیرے اس کے سبب سے نکھار ہے

تیرا وجود صفحۂ عالم کا نور ہے
خوبی میں تیری شانِ خدا کا ظہور ہے

اللہ رے تیرا حسن وہ دلکش تری فضا وہ پاک ندیاں تری جنگل ہرا بھرا
کوئل کی تیری کوک پپیہے کی وہ صدا کیا ہو سکے قلم سے ترے حسن کی ثنا

تیرا جمال دیکھ کے حیرت فلک کو ہے
سینہ ہے داغ داغ یہ غیرت فلک کو ہے

پیدا تری زمیں پہ ہوئے نامی جہاں روشن ورق پہ دہر کے ہے جنکی داستاں
شوکت کے تیری گو کہ ہیں سب مٹ چکے نشاں لیکن ترا شکوہ زمانے پہ ہے عیاں

پھیلا جہاں میں نور ترے آفتاب سے
عالم کو فیض پہنچا ہے تیرے سحاب سے

رونق ہے جس سے دہر میں وہ انجمن ہے تو جس سے مہک اٹھا ہے جہاں وہ چمن ہے تو
شہرہ ہے جس کے حسن کا وہ گلبدن ہے تو مجھ کو نہ کیوں عزیز ہو میرا وطن ہے تو

تیرا خیال باعثِ تسکینِ قلب ہے
تصویر تیری باعثِ تزئینِ قلب ہے

غربت کے دشت میں بھی گر اپنا مقام ہو مونس نہ کوئی ہو نہ کوئی ہمکلام ہو

دل میں ہمہ دم پاس کا اک اژدہام ہو جاری اگر زباں پہ فقط تیرا نام ہو
رنج و الم سے روح کو ملتی نجات ہے
ہوتی نئے سرے سے پھر اپنی حیات ہے

گلاب کا پھول

نیچرل نظم

اک صبح عجیب تھی دل آویز چلتی تھی نسیم عطر آمیز
غنچے ہر سو چٹک رہے تھے بلبل ہر جا چہک رہے تھے
خوشبو وہ چمن میں بھینی بھینی وہ شکل چمن کی دل نشینی
مالی کی چمن میں خوشہ چینی پھولوں کی وہ روح آفرینی
غنچوں کا وہ ہاں چٹک چٹک کر خوشبو دینا مہک مہک کر
عالم وہ چمک رہیں تازگی کا شاخوں میں چہکنا وہ کسی کا
اوڑھنا وہ گھٹائیں اودی اودی پہنانا فلک کو سیاہ وردی
چڑیوں کا پھدکنا شاخ گل پر گرنا بوندوں کا جام گل پر
نرگس کی نظر رہ بازیاں ہائے سوسن کی زباں درازیاں ہائے
سنبل کا وہ کھانا پیچ پر پیچ ہو زلف بھی جس کے سامنے ہیچ
وہ پھول کہیں کہیں پہ دھانی وہ رنگ کسی کا ارغوانی
اودے اودے کسی پہ بندکے کالے کالے کہیں پہ چھینٹے
وہ رنگ چمن وہ زیب و زینت آتی تھی نظر خدا کی قدرت
ہر پھول کی پیاری پیاری نکہت تھی عطر سے بڑھ کے اپنی نگہت

گلشن کی بہار دلکش بلا کی | اک شان عیاں تھی رب خدا کی
چلبلی نسیم کی تھی آفت | ہر چال سے تھی بپا قیامت
سبزے کو وہ اس کا گدگدانا | غنچوں کا ہائے مسکرانا
تھی شعلہ فشاں وہ آتش گل | حسرت سے اڑا تھا رنگ بلبل
پھولوں پہ گری تھی بوند شبنم | موتی کی چمک تھی اس میں پیہم
گورا گورا تھا رنگ جن کا | تھا تار طلا چمن کا تن کا
چھوٹے چھوٹے چمن کے پودے | ننھے ننھے تھے جن کے پتے
نہریں بہتی تھیں ہر روش پر | ہر خار تلا ہوا خلش پر
ہر چیز کا روپ تھا انوکھا | کچھ رنگ چمن ہی تھا نرالا
آتی تھی نسیم یوں دبے پاؤں | نرگس بھی نہ دیکھ سکتی تھی چھاؤں
گلشن کا عجب سماں تھا اور رنگ | تھی دیکھ کے عقل بھی اسے دنگ
غرض تھا کہ کھلے گلاب کے پھول | پیاری صورت ہے جنکی مقبول
گالوں سے دی ہے جس کو تشبیہ | شاعر کرتے ہیں جس کی تشریح
سو جان سے بلبلیں فدا تھیں | آنکھیں نرگس کی جس پہ وا تھیں
آیا بلبل کا غول کا غول | پوچھا پھولوں سے تم ہو انمول
نقد جاں سے بہا تمہاری | پیاری ہے ہر اک ادا تمہاری
صد شکر کہ تم کھلے چمن میں | لائے ہو بہار انجمن میں
کن نقشوں کے تم بنے ہوئے ہو | کس ناز سے تم پلے ہوئے ہو
گودوں میں نسیم کے ہو کھیلے | اچھے تم ہو نئے نویلے
نظروں میں سمائے ہو کسی کے | دل میں اتر آئے ہو کسی کے
ہو گال کسی کے گورے گورے | جن میں کہ پڑے ہوں سرخ ڈورے

بھولی بھولی ادائیں آفت ۔۔۔ دل پر نہ کسی کے ڈھائیں آفت
کب مہر و وفا کی تم میں بو ہے ۔۔۔ کیا جور و جفا تمہاری خو ہے
ہم تم پہ مریں نہ ہم سے بولو ۔۔۔ گھونگٹ بھی نہ منہ سے ہائے کھولو
معشوق ہیں بے وفا جہاں کے ۔۔۔ ایسے تم آئے ہو کہاں کے
بوٹا یہ گلاب ہیں کہاں ہوش ۔۔۔ کیا ہے یہ بیان چپ ہو خاموش
ہو جائے گا راز عشق افشا ۔۔۔ یہ جوش و خروش و فخر بیجا
مانا کہ میں لاکھ بے وفا ہوں ۔۔۔ نازک ہوں نزار ہو رہا ہوں
گو بو بھی نہیں وفا کی مجھ میں ۔۔۔ شوخی بھی سہی بلا کی مجھ میں
ہستی کا چمن میں رنگ ہے یہ ۔۔۔ ہر شے میں اسی کا ڈھنگ ہے یہ
برتر ہے وہ صانع حقیقی ۔۔۔ اعلیٰ سب سے ہے شان جس کی
ہستی کا وجود جان تو ہیچ ۔۔۔ ہر شے کو وجود میں مان تو ہیچ
دو دن کا یہاں ہے رنگ و روپ ۔۔۔ سایہ ہے کبھی کبھی ہے یاں دھوپ
فانی ہے وجود اس جہاں کا ۔۔۔ سب جسم یہ خاک ہے یہاں کا
ہر چیز میں حسن ہے اسی کا ۔۔۔ ہر چیز میں رنگ ہے اسی کا
آئینہ عدم کا ہے یہ ہستی ۔۔۔ بہتر ہے کرو جو حق پرستی!!
یہ پھول یہ شاخ گل فنا ہیں ۔۔۔ آئی جو خزاں تو پھر یہ کیا ہیں
سب خاک ہیں آہ خاک آخر ۔۔۔ باقی ہے خدائے پاک آخر
بیتاب اسی کو پوج تو بھی ۔۔۔ اول آخر ہے جو باقی

دنیا اک ہے سرائے فانی
اک روز ہے موت سب کو آنی

سید محمد حامد علی بیتاب رضوی المشہدی

برسات کی اندھیری رات

اور

یاد محبوب

کچھ عجب چیز ہے جہاں میں رات — دن کی ہے اَور اسکی اور ہے بات
سارے عالم کا تار ہو جانا — دوسری اک بہار ہو جانا
اب نہ وہ دن سا رہا ہے شور و شغب — خامشی ہے چہار سمت عجب
اب نہ وہ ازدحام مردم ہے — شاذ آواز گام مردم ہے
اس گھڑی تو ہر ایک خاص و عام — گھر میں اپنے ہے کر رہا آرام
ہیں چرند و پرند تک سوتے — میٹھے آنکھوں پہ خواب کی پہرے
پھر بھی دنیا ہے اے دلِ غمخوار — ہیں بہت سے بکار خود بیدار
شب کے پردے میں کام کرتی ہیں — ہمجلیسوں میں نام کرتے ہیں
کوئی بیٹھا ہوا ہے خلوت میں — دل سے مصروف ہے عبادت میں
لو لگائے ہوئے خدا سے ہے — بزم مردانِ باصفا سے ہے
نیک طینت ہے صاف باطن ہے — پاک گنجینۂ محاسن ہے
کوئی مخمورِ بادۂ انگور — نشے میں ہو رہا ہے کیسا چور
کام اس کو ہے جام و صہبا سے — بیخبر ہو رہا ہے عقبیٰ سے
دخترِ رز سے لگاؤ رکھتا ہے — جان و دل سے وہ اس پہ شیدا ہے
کوئی غربت میں کر رہا ہے سفر — چشم خونبار ہے تو دل مضطر
ہے کہیں بزمِ عیش بھی اس دم — ہو رہا ہے کسی جگہ ماتم
پھینک خنجر چلا کوئی قاتل — ہے زمیں پر تڑپ رہا بسمل

دیکھ اوپر کو گنبدِ گردوں — سین دکھلا رہا ہے گوناگوں
گھر کے گھنگھور ہے گھٹا آئی — چھپ گیا سارا چرخِ مینائی

کیا تھا تاروں کا پُر فضا منظر — دیدے جس کی خوش تھی چشمِ بشر
چرخ دکھلا رہا ہے کیا تھیٹر — سین کرتا ہے کیسے پیشِ نظر
دامن ابر کا وہ ہٹ جانا — وہ ستاروں کا پھر نکل آنا
جھلملاتے ہیں ہائے یہ تارے — یا تماشا ہیں ایکٹر کرتے
پھر ستاروں پہ آ گیا ہے ابر — ہو گیا ہے ڈراپ سین مگر
خوب اسٹیج آسماں کا ہے — دیکھ کر جس کو عقل ہے حیراں
کس طرح دل کو ہو شکیبائی — ہائے یہ رات اور تنہائی
برق ہوتی ہے جبکہ جلوہ گر — میں تڑپتا ہوں پہروں بستر پر
یاد کس کی مجھے رلاتی ہے — کوئی پہلو نہیں کل آتی ہے
اک جہاں سو رہا ہے میں بیدار — پاس اپنے نہیں کوئی غمخوار
کس کی فرقت میں حال ابتر ہے — کیا بتاؤں میں اک ستمگر ہے
ہے جفا کار ظالم و قاتل — اک نظر سے کیا مجھے بسمل
مار ڈالا مجھے ستمگر نے — کیا دکھایا مجھے مقدر نے
ایسا دیکھا نہیں حسیں کوئی — کیا مقابل ہو مہ جبیں کوئی
دیکھ کر اس کے پھول سے رخسار — بھول ہی ست گئی چمن کی بہار
اس ستمگر کی ہے وہ زلف رسا — ہے مگر آج کل کی کالی گھٹا
چشمِ آہو نے جس گھڑی دیکھی — چوکڑی اس کی ساری بھول گئی
چال اس کی ہے یا کہ آفت ہے — ہر قدم پر کھڑی قیامت ہے
ہے سراپا وہ حسن کی تصویر — کہتی اس کی جبیں کی ہے تحریر

جبکہ ایسے صنم کی یاد آوے — کیوں نہ عاشق تڑپ کے مر جاوے

رات بھر کرتے رہتے ہیں وہ چین — یاں تڑپ کر گذارتے ہیں رین

بھرتا رہتا ہوں میں تو آہیں سرد — دل میں لیتا ہے چٹکیاں جب درد

کس کو پروا ہے آہ و زاری کی — عشق کرکے گناہگاری کی

کی خطا میں نے وائے قسمت کی — بس یہی نا کہ اُس سے الفت کی

جس پہ صدقے ہوں جان و تن سے — مجھکو بہتر وہ سمجھے دشمن سے

اس کو سمجھوں زمانے کی خوبی — یا یہ ہے کوئی شان محبوبی

پوچھتا ہوں کبھی جو کوئی بات — بولتا منہ سے وہ نہیں ہیہات

ایک دن جبکہ عجز سے پوچھا — مسکرا کر یہ بارے اس نے کہا

میں تجھے دل سے پیار کرتا ہوں — جان تجھ پر نثار کرتا ہوں

اتنا سُن کر کے تن میں جاں آئی — گفتگو مژدہ جانفزا لائی

سچ ہی کہتا ہے وہ صنم اے دل — جھوٹ بولیگا وہ نہیں قائل

اس کو مجھ سے ضرور الفت ہے — کیسے کہدوں نہیں محبت ہے

ایسے معشوق سے رہوں میں دور — اپنی قسمت سے حیف ہوں مجبور

ہوں جدا دور آسمانی سے — موت بہتر ہے زندگانی سے

ایسا کب ہوگا اے میری قسمت — ہوگا پہلو میں یار مہ طلعت

دوں بلائیں کبھی میں زلفوں کی — گاہ دیکھوں تجلی گالوں کی

سرمگیں آنکھ کو کبھی چوموں — لب رنگیں کا گاہ بوسہ لوں

جشن مجھکو یونہی نصیب رہے — داغ بر دل صد رقیب رہے

پوچھتا پھرتا ہوں میں یہی تجھ سے — بہر خالق ذرا تو بتلا دے

ایسا ہوگا کبھی سُن اے تقدیر — میرے پہلو میں ہو وہ ماہ منیر

لطف ہو عیش زندگانی ہو
وہ ہو باسط ہو کامرانی ہو

تازہ غزلیں

(جناب سید سلیم صاحب واسٹی)

ہ اچھی ہے موسم ہی مہینہ بھی ہے ساون کا — تبسم ہی ہیں فرماویں ارادہ کب ہے گردن کا
اٹھتا چلا آتا ہے ظالم تیرے جوبن کا — بس اب اللہ ہی حافظ ہے اس بیباکپن کا
ع دل تپیدن آئینہ ہے میری مدفن کا — فغان برق واماں ہے جو دانہ ہے خرمن کا
وہ ترک نکلا لاگ بھڑکاتی ہی فتنہ کو — بتا دیتے ہیں سب انگلی اٹھا کر میرے مدفن کا
وش ہے سر تیغ قاتل فیصلہ کر دے — تھکا جاتا ہوں اترے یا الٰہی بوجھ گردن کا
بجلیاں گرتی ہیں آکر نخل ماتم پر — گماں ہوتا ہے ہر ہر شاخ پر میرے نشیمن کا
ہے نام لیلی سر فروش ہستی مجنوں — بس اب نام خدا شہرہ ہے گھر گھر انکی جوبن کا
منزل ہے خستہ تن ہوں اور بار گراں سر پر — ادھر ہے نیند آنکھوں میں ادھر ہے خوف رہزن کا
زعفراں کا کھیت اگتا آتا ہے شاید — جوانی میں لٹایا کھیل ظالم نے لڑکپن کا
یہ ٹھہرایا ہے باد بہاری نے — صبا بھی طوف کر جاتی ہے آکر میرے مدفن کا
تو کعبہ میں بٹھلا دوں دونوں کی پرستش ہو — کہو میں صاف کر دوں فیصلہ شیخ و برہمن کا
نہ خلائق یہ ہو وے بے سبب میری — نشاں ہی نیست کر دے بے ثباتی میرے مدفن کا
خوف و رجا درکار ہے ہستیاں ساری — سلیم اب بھول جاؤ وہ زمانہ تھا لڑکپن کا

حضرت شمشاد

ے زلف جو پھندے سے نکلجاؤں گا — لاکھ تو پیچ کرے گی میں سنبھل جاؤں گا

دل یہ کہتا ہے تجھے دیکھ کے ہم پہلوئے غیر | شکل ارمان عدو میں بھی مچل جاؤں گا
صاف کہتا ہے ترا پیچ رنگیں مجھ سے | دل جگر دونوں کو سینہ میں مسل جاؤں گا
کن انکھوں میں یہ کہتا ہے ابھرتا جوبن | اشک عشاق نہیں ہوں کہ میں ڈھل جاؤں گا
شمع سے چھیڑ ہو پروانہ کریگا سر بزم | آتش رشک سے میں بھی وہیں جل جاؤں گا
مجھ سے کہتا ہے بگڑ کر یہ خیال جاناں | بن کے ارمان عدو دل سے نکل جاؤں گا
حور غلماں سے تو جنت میں بڑھیگی وحشت | آپ بہلاؤ گے محبوب کو تو بہل جاؤں گا
مجکو ارمان کہ دیکھوں میں جلاب رخ یار | پائے نظارہ یہ کہتا ہے پھسل جاؤنگا
جس طرح جاتے ہیں سینے سے فلک تک نالے | قفس دہر سے میں صاف نکل جاؤں گا
فقرہ بازی تری صحبت میں کریں گے جو رقیب | ان سے پہلے ہی کوئی چال میں چل جاؤنگا
حشر میں دیکھ کے اس شوخ کی بھولی صورت | رحم آتے ہی میں تقدیر بدل جاؤں گا
گلشن خلد میں جانے کی نہیں یہ وحشت | کوئی محبوب نہیں جس میں بہل جاؤنگا
بھول جائیگی تری ساری شرارت اے شوخ | میں کسی بات کے اوپر جو مچل جاؤں گا
دل میں ارمان کہ لوں دوڑ کے گنج رخ یار | اژدر زلف یہ کہتا ہے نگل جاؤں گا
دولت وصل سے تبدیل نہ ہوگی صورت | کوئی کم ظرف نہیں میں کہ ابل جاؤں گا
دل یہ کہتا ہے نہ سینہ میں کرو بند مجھے | گنج مدفوں کی طرح صاف میں ٹل جاؤں گا
زندہ رہتا ہوں تو وہ شوخ کھٹکتا ہے مدام | جان دیتا ہوں تو کہتا ہے دہل جاؤں گا
دل شیدا سے یہ کہتا ہے ترا ناز خرام | دسترس پا کے تجھے پاؤں سے مل جاؤں گا
آج آجائے بلانے کو اگر پیک اجل | غیر ممکن ہے کہے کوئی کہ کل جاؤں گا
دل یہ کہتا ہے تڑپنے کی نہ عادت ہے مجھے | ہاتھ دو ہاتھ خوشی میں بھی اچھل جاؤنگا

اس قدر جمع ہیں گلہائے مضامین شمشاد
مجھ سے ہر شعر کو دعوے ہے کہ پھل جاؤنگا